لغت نویسی اور لغات

روایت اور تجزیہ

مرتبہ

رؤف پاریکھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی زیر اہتمام
محدث لائبریری
کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- **کتاب وسنت ڈاٹ کام** پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- **مجلس التحقیق الاسلامی** کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد **(Upload)** کی جاتی ہیں۔
- **دعوتی مقاصد** کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ **(Download)** کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

لغت نویسی اور لغات

روایت اور تجزیہ

مرتبہ

رؤف پاریکھ

فضلی سنز

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب : لغت نویسی اور لغات: روایت اور تجزیہ
مصنف : رؤف پاریکھ
پیشکش : فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، کراچی
اشاعت : 2015
تقسیم کار : فضلی بک سپر مارکیٹ

نزد ریڈیو پاکستان، اردو بازار، کراچی۔
(92-21) 32629724, 32212991
e-mail: fazleepublisher@gmail.com
website: www.fazleebooks.com

◆

کتاب سرائے
فرسٹ فلور الحمد مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ،
اردو بازار، لاہور۔
(92-42) 37320318

◆

کتاب گھر
کمیٹی چوک، راولپنڈی۔
(92-51) 5552929, 5539609

پروفیسر عبدالقیوم لائبریری
کتاب نمبر
دارالمعارف

فہرست

تقدیم رؤف پاریکھ ۵

لغت نویسی

۱۔ لغت اور لغت نویسی ارشد مسعود ہاشمی ۷
۲۔ اردو فرہنگ نویسی کا تحقیقی جائزہ محمد ضیاء الدین انصاری ۱۸
۳۔ املا کا اختلاف رشید حسن خان ۴۶
۴۔ لغات کی تحقیق حفظ الرحمٰن واصف ۶۴
۵۔ جاپان میں اردو: لغت نویسی کے تناظر میں محمد فخر الحق نوری ۷۴

لغات

۶۔ لغتِ فرس از اسدی طوسی شبلی نعمانی ۸۷
۷۔ مجمع الفرس قاضی عبدالودود ۹۲
۸۔ کرنل سر ہنری یول کی اردو فرہنگ ہابسن جابسن آغا افتخار حسین ۹۴
۹۔ تحقیقاتِ الفاظ ہندی غرائب اللغات سخاوت مرزا ۱۰۹
۱۰۔ نور اللغات کا تقابلی مطالعہ سید خواجہ حسینی ۱۱۵
۱۱۔ تدوین و طباعتِ انگریزی اردو اسٹینڈرڈ ڈکشنری محمد عبداللہ چغتائی ۱۲۷
۱۲۔ جلال لکھنوی کی لغات محمد حسن ۱۳۶
۱۳۔ مخزنِ فوائد محمد ذاکر حسین ۱۵۲
۱۴۔ نفائس اللغات: چند معروضات محمد عالم مختار حق ۱۸۳
۱۵۔ چند معروضات: شورانگیز کے تعلق سے عبدالرشید ۱۸۷

لغت نویس

۱۶۔ مولوی سید احمد دہلوی — سید یوسف بخاری دہلوی — ۲۲۱

۱۷۔ مولوی سید احمد دہلوی — رشید حسن خان — ۲۳۲

۱۸۔ فیلن اور اس کے علمی کارنامے: ایک تعارف — محمد اکرم چغتائی — ۲۴۰

لغت ساز ادارے

۱۹۔ دفتر امیر اللغات — سید جاوید اقبال — ۲۵۶

۲۰۔ اردو لغت اور ترقی اردو بورڈ (۱) — محمود الٰہی — ۲۹۵

۲۱۔ اردو لغت اور ترقی اردو بورڈ (۲) — نذیر احمد — ۲۹۹

۲۲۔ اردو لغت اور ترقی اردو بورڈ (۳) — صابر سنبھلی — ۳۰۷

۲۳۔ اردو لغت اور ترقی اردو بورڈ (۴) — محمود الٰہی — ۳۱۴

۲۴۔ اردو ڈکشنری بورڈ، ایک جائزہ — مرزا نسیم بیگ — ۳۲۰

۲۵۔ اردو لغت تاریخی اصول پر — رؤف پاریکھ — ۳۳۰

☆☆☆☆

تقدیم

الحمدللہ، لغات اور لغت نویسی کے موضوع پر راقم کی مرتبہ یہ تیسری جلد ہے۔ گو اس کام کی ضرورت اور اہمیت کا راقم کو احساس تھا لیکن ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال ضرور جاگزیں تھا کہ فی زمانہ اس قسم کے کاموں کو بالعموم بنظرِ حقارت دیکھا جاتا ہے اور بعض لوگ انھیں ’’محض جمع و ترتیب کا کام‘‘ کہہ کر رد کر دیتے ہیں۔ البتہ یہ اور بات ہے کہ ایسے لوگ خود ’’محض جمع و ترتیب‘‘ جیسا کوئی کام بھی نہیں کر پاتے گو ضرورت پڑنے پر انھی کاموں سے رجوع بھی کرتے ہیں۔

اس سلسلے کی پہلی جلد (’’اردو لغت نویسی: تاریخ، مسائل اور مباحث‘‘، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۰ء) کا پورا ایڈیشن قلیل عرصے میں فروخت ہو گیا۔ اسی اثنا میں بعض یونی ورسٹیوں نے اپنے ایم اے (اردو)، ایم فل / پی ایچ ڈی (اردو) کے تربیتی نصاب (کورس ورک) میں لغت نویسی کا ایک پرچہ شامل کر لیا۔ جس کے بعد طالب علموں کے علاوہ بعض اساتذہ کو بھی لغت نویسی سے متعلق مواد کی ضرورت پڑی جو بالعموم آسانی سے ہاتھ نہیں آتا۔ چنانچہ خیال آیا کہ جو مقالات و مضامین اس سلسلے کی پہلی جلد میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے یا اس کی اشاعت کے بعد دست یاب ہوئے انھیں بھی کتابی صورت میں یک جا کر دیا جائے۔ اس طرح اس سلسلے کی دوسری جلد (’’اردو لغات: اصول اور تنقید‘‘، فضلی سنز، کراچی، ۲۰۱۴ء) شائع ہوئی۔

لیکن کئی کارآمد اور اہم تحریریں دوسری جلد میں بھی بوجہ ضخامت شامل نہ ہو سکیں۔ لہٰذا اب

انھیں اس جلد میں پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلی دو جلدوں پر دوستوں نے جس طرح حوصلہ بڑھایا اس پر ان کا شکریہ واجب ہے۔ بالخصوص محمد احسن خان صاحب (لاہور)، تحسین فراقی صاحب (لاہور)، سید جاوید اقبال صاحب (حیدر آباد)، مبین مرزا صاحب (کراچی)، ملک نواز اعوان صاحب (کراچی)، ضیاء الحسن صاحب (لاہور)، عبدالعزیز ساحر صاحب (اسلام آباد)، قاضی عابد صاحب (ملتان)، محمد یوسف خشک صاحب (خیر پور) جیسے علم دوست اور علم پرور لوگوں نے ان کی اشاعت پر انھیں "مفید اور ضروری" قرار دے کر احساس دلایا کہ جمع و ترتیب کا بھی کوئی کارِ فضول نہیں۔ بلکہ محمد احسن خان صاحب نے فوراً ہی تیسری جلد کا نسخہ بھی تجویز کر دیا اور کچھ خاص مضامین و مقالات بطور اجزا اس نسخے میں ڈالنے کی ہدایت کی۔ ملک نواز اعوان صاحب کا محبت اور خلوص بھرا حکم نما استفسار یہ تھا کہ باقی جو مضامین و مقالات جمع ہیں وہ کب چھاپ رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر عطا فرمائے اور ان کاموں کو باعثِ افادہ بنائے۔

(آمین)

یکم جنوری ۲۰۱۵ء

رؤف پاریکھ

(شعبۂ اردو، کراچی یونی ورسٹی)

ارشد مسعود ہاشمی

لغت اور لغت نویسی

1:0 لغت (DICTIONARY)

کرک (Quirk ۱۹۷۴ء:۱۳۷) کا تصور ہے کہ الفاظ سے متعلق کتابوں کی تمام اقسام میں جو قسم سب سے پہلے ذہن میں آتی ہے وہ لغت ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ کسی گھر میں اگر کچھ کتابیں ہوں تو ان میں دو ایسی ہیں جن کی موجودگی یقینی ہے! یعنی، انجیل مقدس اور لغت۔ مابعد عیسائی دور میں انجیل مقدس ہر گھر میں موجود ہو نہ ہو لغت کی موجودگی شرط ہے۔ واقعتاً ‘لغت’ کو حوالہ جات کا ناگزیر ذریعہ اور لسان و لسانیات کے معاملے میں ایک اثاثہ سمجھنا چاہیے۔

1:1 تعریف

زبان انگلیسی کا لفظ ‘ڈکشنری’ ہند یورپی جڑ ‘ڈک’ (dik) سے مستعار ہے۔ (Klein 1966:445) جو بقول ولیمز (Monier-Williams, 1960:974) سنسکرت جڑ ‘دِش’ (بنانا، دکھانا، ظاہر کرنا) سے ماخوذ ہے۔ ‘ری’ انگلیسی کا وجودی لاحقہ ہے اور لاطینی کے ‘arium’ کے مساوی ہے۔ لہٰذا، اشتقاقی اعتبار سے، لغت ان محتویات کا مجموعہ ہے

جنھیں الفاظ کی صورت میں دکھایا یا ظاہر کیا گیا ہے۔ ۱۲۲۵ء میں پہلی بار JohnGarland نے 'اصطلاح'' 'dictionarius' کا استعمال لاطینی الفاظ کی اس فہرست کے لیے کیا تھا جو اس نے اپنے طلبا کے لیے تیار کی تھی۔

ہرطمان (Hartmann 1983:3) اصطلاح 'لغت' کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ وہ حوالہ جاتی کتاب ہے جس میں بہ اعتبار حروف تہجی الفاظ کی ترتیب ہوتی ہے، ان کے معانی، تلفظ، ہجا اور دوسری زبان میں مساویات کی پیش کش بھی ہوتی ہے۔

لہٰذا، لغت لغوی شقوں کی، حروف تہجی کے اعتبار سے، ترتیب ہے جس میں ان الفاظ، اصطلاحات اور محاورات کے تلفظ اشتقاق، معنی، استعمال، دوسری زبانوں یا زبانوں میں مساویات اور لفظ سے متعلق قواعدی اندراجات کی مناسب تفصیل ہوتی ہے۔

1:2 محتویات (CONTENTS)

ہل (A.A.Hill IN Allen، ۱۹۷۶:۴۴۰) کا خیال ہے کہ لغت سے درج ذیل معلومات حاصل ہوتی ہیں:

۱۔ لفظ کی صوتیاتی ساخت

۲۔ لفظ کی صرفیائی ساخت

۳۔ لفظ کی قواعدی ترمیم

۴۔ لفظ کی نحوی عادتیں، اور

۵۔ لفظ کے معانی

لغت میں مختلف مشمولات کی موجودگی بھی ہوسکتی ہے جن سے یہ معلومات مہیا ہوتی ہیں۔

۱۔ زبانِ مخصوص کی تاریخ

۲۔ تلفظ

۳۔ جغرافیائی اسما کی فہرست

۴۔ سوانح کی فہرست

۵۔ طباعت و تحریر میں مستعمل اشاروں کی فہرست

۶۔ طباعت و تحریر میں مستعمل حرفی، لفظی تخفیف کی فہرست

۷۔ رموز و اوقاف

۸۔ ہجے کے بنیادی اصول

۹۔ دخیل الفاظ کی فہرست (Walters,1942:2)

ضخامت، تفصیلات، مشمولات کے لحاظ سے بھی لغت کی تقسیم ہوتی ہے۔

لغت، خواہ درج بالا کسی بھی قسم کا ہو، متعلقہ زبان (نوں) کے ارتقا کا عکس پیش کرتا ہے۔ ارتقا کی رفتار سست ہو سکتی ہے اور بسا اوقات مبہم بھی ہو سکتی ہے۔ نئے الفاظ ہمیشہ اختراع کیے جاتے ہیں اور پرانے الفاظ کے معانی میں بھی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ لغت زبان کے عصری تقاضوں کی بھرپائی کرتا ہے۔

بنیادی طور پر اجمالاً، یہ کہا جا سکتا ہے کہ لغت سے زبان کی تشکیل نہیں ہوتی بلکہ زبان لغت کی تشکیل بھی کرتی ہے۔ (Blancke,1953:720) لغت زبان کو بقا بھی فراہم کرتا ہے۔

1:3 دیگر حوالہ جاتی تدوین (REFERENCE-COMPILATIONS)

لسانیاتی اعتبار سے لغت اور اس نوع و قماش کی دوسری تالیفات میں تفریق ضروری ہے تاکہ کوئی مفہومیاتی بے ترتیبی پیدا نہ ہو۔

فرہنگ (GLOSSARY)

مخصوص تصانیف، یا بولی، یا فن، یا علم کی اصطلاحات کے مجموعے کو فرہنگ کہتے ہیں۔ یہ اصطلاحات تکنیکی اور غیر معروف ہوتی ہیں۔ بسا اوقات مخصوص تہذیب سے مختص بھی ہوتی ہیں۔ مصطلحات اسی کی ایک قسم ہے۔

معجم البلدان (GAZETTEER)

اس میں حروف تہجی کے اعتبار سے شہروں اور مختلف جگہوں کے جغرافیائی نام اور تفصیلات

کے اندراجات ہوتے ہیں۔

تطابق (CONCORDANCE)

ہرطمان اور ستارک (Hartmann & Stork, 1972: 47) تطابق کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ الفاظ کی ایسی فہرست ہے جو کسی مخصوص تصنیف یا تصانیف، مثلاً 'انجیل مقدس یا کسی ادیب کی مکمل تحریروں کی حروف تہجی کے اعتبار سے، یا موضوع یا تاریخی اعتبار سے ترتیب کے سلسلے میں یہ اشارے کرتی ہے کہ وہ الفاظ اس میں کہاں کہاں اور کتنی مرتبہ مستعمل ہوئے ہیں۔

لفظیات (VOCABULARY)

کسی زبان، گروہ، طبقہ یا میدان علم وفن کے الفاظ کا مجموعہ، جس میں ان کے معانی کی شرحیں، وضاحتیں ہوتی ہیں۔

اشاریہ (INDEX)

یہ الفاظ کی حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دی ہوئی فہرست ہے جو کتاب کے آخر میں شامل کی جاتی ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مخصوص لفظ یا اصطلاح اس کتاب میں کس یا کن صفحات پر مستعمل ہوا ہے۔

قاموس / مخزن علوم (ENCYCLOPAEDIA)

قاموس کا تعلق الفاظ کے لسانی حقائق سے ہے جب کہ لغت کا دارومدار لسانی پہلوؤں پہ ہی ہوتا ہے۔ "قاموس میں مختلف النوع حقیقی تفصیلات ہوتی ہیں لیکن لفظ کے معانی کی جانب کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ (Hurford Heasley, 1984: 284) کچھ ایسی لغات بھی ہیں جن میں قاموسی اطلاعات ہوتی ہیں، انھیں 'قاموسی لغت' کہا جاتا ہے۔

گنجینہ (THESAURUS)

گنجینہ ایک حوالہ جاتی کتاب ہے جس میں الفاظ اور ان کے ہم معنی الفاظ کی فہرست ہوتی

ہے۔(CCELD, 1989:1516)اسے ”لغت ترادفات“ بھی کہا جاتا ہے۔(WNID, 1978:553)

لغویہ(LEXICON)

مختلف ماہرین نے اپنے مخصوص تجزیاتی پس منظر میں اصطلاح 'لغویہ' کی تعریفیں پیش کی ہیں۔ لیچ(Geoffrey Leech, 1975:202-203) کی نگاہ میں لغویہ کی حیثیت داخلی خلقی لغت(inbuilt dictionary) کی ہے جسے ہم میں سے ہر شخص ایک زبان کے بولنے والے کی حیثیت سے اپنے ذہنی سالمے کے طور پر ہمیشہ ڈھونڈتا رہتا ہے۔ اس نے اسے لغت نویس کے ذریعے مرتب کیے گئے ہمہ استعمال کے لغت، جسے ہم بوقت ضرورت استعمال کرتے ہیں، کے موازنے میں 'نظریاتی' (theoretical) لغت کہا ہے۔

لغویہ لامختتم ہے۔ ہم جن تحریری اور زبانی ترسیلات کا تجربہ کرتے ہیں ان کی وجہ سے ہماری لغویاتی (lexical) اطلاعات مستقل روبہ ارتقا و ترمیم رہتی ہیں۔

لیچ کہتا ہے کہ طبع زاد لغت زبان کے بولنے والوں کے بے پایاں لغویہ سے حاصل شدہ لغویاتی اطلاعات کا کنڈ ہے۔ اس لیے یہ ”مجتمع لغویاتی مجاز“ (corporate lixical competence) کا حامل ہوتا ہے۔ اسی طرح لغویہ بولنے والے(speakers) کے لسانیاتی مجاز و امتیاز کی لفظیاتی آسودگی کی حیثیت رکھتا ہے۔(Fowler,1994:93)

لغویہ اور لغت کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے ژگوستا(Zgusta1978:188) نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ لغویہ کسی زبان کی لغوی اکائیوں کا مکمل ذخیرہ ہے اور لغت ماہر لسانیات کی [جانب سے] اسی کی پیش کش یا بیان ہے۔

1:4 لغت نویسی(LEXICOGRAPHY)

لغت نویسی لغت کی ترتیب و تدوین کے نظریات و عوامل کا علم ہے۔ زبان انگلیسی کا لفظ LEXICOGRAPHY یونانی الفاظ LEXIKO اور GRAPH سے مخترع ہے۔ ادبی

مفہوم کے لحاظ سے اس کا مفہوم ’’الفاظ کی تحریر‘‘ ہے۔

ہرطمان کے لفظوں میں (Hartmann, 1983:3)، لغت نویسی وہ عمل ہے جس کا تعلق مشاہداتی مظہر (یعنی لفظیات، یا، دارجہ (LEXIS) یا، لغویہ) اور نظریاتی اصول (علم لغت (lexicology)) کے ان میلانات سے ہے جن سے ان کی نمود ہوتی ہے۔

دوروسزوسکی (Doroszewski1973:36) اسے علم سے تعبیر کرتا ہے جس کی وجہ سے لغت میں لغوی (بولی) مواد کی پیش کش اور ان کی تلاش و جستجو کی راہیں استوار ہوتی ہیں۔

اسی سے ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ لغت نویسی عملی علم (Applied Science) ہے جس کی وجہ سے لغوی اندراجات کی درجہ بندی، تعریف، موازنہ اور تدوین ترتیب میں تعاون ملتا ہے۔

لغت نویسی کا فن تخلیقی نوعیت کا حامل ہے۔ لغت نویسی کے پس پردہ ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی تحریک یا مقصد کارفرما ہوتا ہے، جو ایک سے دوسری تہذیب، ایک سے دوسرے ملک اور ایک سے دوسرے طبقے کے ضمن میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔

لغت کی ترتیب میں مصروف شخص، ’لغت نویس‘ (lexicographer) کہلاتا ہے۔ جانسن (Meier in English studies,1963:5) کہتا ہے کہ لغت نویس اندراجات کا بیان کرتا ہے اور انھیں ایک مخصوص ترتیب میں سجاتا ہے۔

لغت نویسی ایک مشکل کام بھی ہے اسکیلگر (Scaliger in Zgusta, 1971:15) یہ محسوس کرتا ہے کہ بدترین مجرموں کو نہ تو قتل کرنا چاہیے اور نہ ہی سخت مشقت کی سزا دینی چاہیے، بلکہ انھیں لغت کی ترتیب و تدوین کی ذمے داری سونپنی چاہیے کیونکہ اس کام میں تمام اقسام کی ایذائیں پنہاں ہیں۔

سبھی لغت نویس اس مشغلے کے سلسلے میں مختلف تصور رکھتے ہیں۔ سموئل جانسن (Samuel Johnson) اسے بے مزہ گردانتا ہے تو ایرک پٹیرج (Eric

(Partridge) اسے پر جوش کام مانتا ہے۔ جیمز ہلبرٹ (James Hulbert) کے لیے یہ خوش کن ہے تو آلن گلیسن (Allan Gleason) کے لیے تھکا دینے والا۔

''لغت نویس لسانیاتی مفتی نہیں ہوتا (Mathews in Allen 1976:436) لہٰذا لغت کی ترتیب و تدوین الفاظ کے درست معانی کے بارے میں حکمیہ اور شرطیہ بیانات کا اندراج نہیں ہے۔ بلکہ اندراجات کے اس سلسلے کی جانب پیش رفت ہے جس سے، لغت نویس کی صلاحیتوں کی وجہ سے، یہ معلوم ہو سکے کہ مختلف الفاظ مختلف زبانوں میں کیا معانی رکھتے ہیں۔

1:5 لغتیات (LEXICOLOGY)

لغت نویس کا لغیات میں ماہر ہونا ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو سے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ کون سی لغویاتی آوازوں کا انتخاب کرے۔ پھر ایک لغویاتی آواز (جو اندراج کے بعد 'لغوی' کے ضمن میں آ جاتی ہے) یعنی ہجا، تلفظ، اجزائے تکلم (تصرف، صیغہ، تجنیس) اشتقاق اور معنی کو پیش کرے۔

لغتیات آخری دو اجزا سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔ لیکن یہ سب ہی سات نکات داخلی ربط رکھتے ہیں۔

لغتیات لسانیات کی ایک شاخ ہے اور لفظیاتی شقوں کے معانی اور ارتقا کا مطالعہ۔ یہ لفظیات کا علم ہے۔ معنیات، اشتقاقیات اور اسلوبیات کا اس سے قریبی تعلق ہے۔ جدید ترین مفہوم کی رو سے یہ ربط داخلی کے درجات کا تصور رکھتی ہے۔ ان درجات میں یک معنیت (Monosemy) اور کثیر معنیت (Polysemy)، مترادفیت (Synonymy) اور تضاد (Antonymy) اور لفظ کے آزاد اور مختص معنی شامل ہیں۔ (GSE, 14, 1977:459)

گویا لغتیت کا تعلق زبان کی لغوی شقوں مثلاً نحوی معنیہ (Semantic syntax)، جزیاتی معنیہ (Semantic Components)، محاورہ، مترادفیت، کثیر

معنیت اور لفظی جزیات (Lexemic Components) سے ہے۔ (Lamb in al.Kasimi1977:1)

لغتیات لغت نویسی کی نظریاتی بنیاد ہے۔ لغت نویسی، بہرحال، زیادہ اہمیت رکھتی ہے کیونکہ عمارت کی بنیاد سے زیادہ اہم ڈھانچے کی صورت ہوتی ہے۔

1:6 اشتقاقیات (ETYMOLOGY)

زبان انگلیسی کی اصطلاح یونانی لفظ 'etymon' سے مخترع ہے۔ جس کا مفہوم ہے جڑ یا اصل، یا مادہ۔

میکس مولر (Max Muller,1979:367) کا خیال ہے کہ تمام الفاظ ان جڑوں سے تشکیل پاتے ہیں اور یہ جڑیں اصلاً ابتدائی مساعدی عوامل کا بیان ہیں جنھیں انسان نے سماجی زندگی کی اولین پرتوں میں برتا تھا۔

اشتقاقیات الفاظ کے ارتقا، تشکیل، اور معنی کی تاریخ کا مطالعہ ہے۔ بقول میک پیک اور رٹ (Mcpeek & Wright, 1956:337)، اشتقاقیات عالمانہ افق کی توسیع کا علم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ معلوم ہو جانے پر کہ لفظ 'Weird' اینگلوسیکسن (Anglo-Saxon) لفظ 'Wyrd' سے مخترع ہے جو تقدیر کی دیوی کی جانب اشارتا ہے، "میکبتھ" (Macbeth) میں مستعمل 'Weird sisters' کے معنی و مفاہیم پر نئی روشنی پڑتی ہے۔ اس حقیقت سے ذہن کی آزادی کا اندازہ ہوتا ہے کہ انگریزی الفاظ mess, missive, mission (مثلاً dirty mess, mess of beans) message، messenger، mess hall اور mass (کرسمس کے موقع سے) سبھی لاطینی 'missis' 'missum' ('بھیجا ہوا') سے منسلک ہیں۔

اگروال (Aggrawal in TLED,1956) کا خیال ہے کہ لفظ کو اس سماجی ادارے کی علامت کی طرح برتنا چاہیے جس نے اسے جنم دیا ہے اور اس کی ارتقائی

منازل (genesis) کے تمام فراز بھی واضح ہونے چاہئیں۔ مطالعہ 'واقعتاً' اتنا عمیق ہونا چاہیے کہ لفظ کی تاریخ کی مختلف الجہاتی سطحیں مکمل طور پر پوری گہرائی کے ساتھ معلوم کی گرفت میں آ جائیں۔ تبھی یہ ممکن ہوگا کہ تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے وہ عوامل سامنے آ سکیں جن میں معنی کے گرم و سبک بدن مچلتے ہیں۔

دراصل اشتقاقیات سے لفظ کے ماخذ اور اس کی اصل شناخت کا پتہ چلتا ہے۔ اس کی وجہ سے کثیر معنوی الفاظ کی ترتیب وار پیش کش ہوتی ہے اور ان کے بنیادی معانی بھی معلوم ہوتے ہیں۔ تب ہم لفظ کے اصل معنی تک رسائی حاصل کر پاتے ہیں۔ تخیل کی کمی کے ساتھ ساتھ تاریخی واقفیت کی کمی لغت نویس کے لیے دو پہلوی منفی نکتے کی حیثیت رکھتی ہے۔ ماہر اشتقاقیات کے لیے تہذیب و تمدن، مذہب اور دریافت، و بازیافت کا تاریخی علم ضروری ہے۔ (Partridge1961:27)

اس مقام پر ''لوک اشتقاقیات'' (Folk Etymology) کا تذکرہ بھی ناگزیر ہے، جسے اکثر 'عام اشتقاقیات' (Popular Etymology) بھی کہا جاتا ہے۔ اسے عموماً الفاظ کی تشکیل و ہئیت کے متبادلات کے ضمن میں استعمال کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے انھیں مزید وضاحت کے ساتھ نقل کرنا ممکن ہوتا ہے۔ ''انگلیسی لفظ 'welcome' کا 'well' سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قدیم انگلیسی (old English) میں یہ 'Wilcuma' تھا اور 'will' ''at will or pleasure'' کی اختراع شدہ صورت۔ 'well' سے اس کا تعلق محل نظر ہے۔'' (Murti. 1984:240)

لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ عمل اشتقاق کے دوران نہایت احتیاط کی ضرورت ہے کیونکہ لفظ مخصوص کی تاریخ غلط سمت کا پتہ بھی دے سکتی ہے۔

''اشتقاقیات کے معاملے میں توضیحی لسانیات (Descriptive Linguistics) کا زیادہ عمل دخل نہیں ہے۔ اس مقام پر یہ کلیہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ اشتقاقیت برائے اشتقاقیت

سائنسی توجیہات کے خلاف ہے۔ بعض پر عمل ماہرین اپنی وجدانی پرواز کے ذریعے ماہیت اور اصلیت سے کوسوں دور ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا مکمل تاریخی شواہد اور ارتقائی منازل کی واقفیت اشد ضروری ہے۔“

کتابیات:

AL-KASIMI, ALIM. LINGUISTICS AND BILINGUAL DICTIONARIES, LEIDEN : e.J.BRILL, 1977.

ALLEN,H.B.(Ed.)READINGS IN APPOIED ENGLISH LINGUI'STICS,NEW DELHI, OXFORD. I.B.H,1976.

BLANCKE, WILTON,W. GENERAL PRINCIPLES OF LANGUAGE, BOSTON : D.C.HEATH & COMPANY, 1953

DOROSZEWSKI, W.ELEMENTS OF Lexicology and semiotics, WARSZAW : DWN-POLISH SCIENTIFIC PUBLISHERS, 1973.

FOWLER, ROGER, UNDERSTANDING LANGUAGE LONDON: ROUTLEDGE & KEGAN PAUL,1974.

GRTEAT SOVIET ENCYCLOPAEDIA, VOI, 14.23,NEW YORK, MACMILLAN, 1977, 79.

HARTMANN, R&N(Ed) LEXICOGRAPHY : PRINCPLE AND PRACTICE, LONDON,ACADEMIC PRESS,1983.

HAYAKAWA, S.I. LANGUAGE IN THOUGHT AND ACTION NEWYORK ,HARCOURT, BRACE & COMPANY, 1949.

KLEIN, ERNEST, A COMPREHENSIVE ETYMOLOGICAL DICTIONARY OF THE ENGLISH LANG-UAGE,Uage,Amsterdam, Elsevier.1966

Max muller,F. Natural Religion,New Delih:ASIAN EDUCATIONAL SERVICE, 1979.

McPEEK,J.A.S & WRIGHT.A HANDBOOK OF ENGLISH ,NEW YORK: THE RONALD PRESS.1956.

MONIER, WILLIAMS A SANSKRIT ENGLISH DICTIONARY DELHI : MOTILAL BANARSI DASS.1960.

MURTI, M.S. AN INTRODUCTION TO SANSKRIT LINGU- ISTICS, DELHI : D.K.PUBLICATIONS.1984

PARTIDGE,ERIC,ADVENTURING AMONG WORDS,LONDON: ANDRE DEUTSCH, 1961.

QUIRK, R. THE LINGUIST AND THE ENGLISH LANGU- AGE. LONDON EDWARD ARNOLD, 1974.

TRANSACTIONS OF THE LINGUSTIC CIRCLE OF DEHLI(TLCD), (1955),DELHI.

WALTERS, R.G. WORD STUDIES, OHIO : S.W.P.C.1949.

ZGUSTA,LADISLAV,MANUAL OF LEXICOGRAPHY,THE HAGUE : MOUTON.1971.

(منقول از ''مبادیاتِ لغت'' کتابستان، مظفر پور، بہار، ۲۰۰۴ء)

☆☆☆☆

محمد ضیاء الدین انصاری

اردو فرہنگ نویسی کا تحقیقی جائزہ

اردو میں فرہنگ نویسی کا رواج عام نہیں ہے۔ نہ ہی اب تک اس کا مفہوم متعین کیا گیا ہے کتب لغات میں اس کے معانی عام طور پر 'کتاب علم و دانش' کے بتائے گئے ہیں۔ بعض لغت نویسوں نے اس کے معنی 'کتابِ لغات فارسی' بھی لکھے ہیں۔ چنانچہ شیخ محمد لاد نے مؤید الفضلاء میں اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے:

"فرہنگ: 'ادب و دانش و بزرگی و نیز کتابی در علم لغت و او اکثر فارسی باشد"

یہاں 'و او اکثر فارسی باشد' سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ فارسی کے علاوہ دیگر زبانوں کی کتب لغات کو بھی فرہنگ کہا جاسکتا ہے لیکن ایسا اشارہ کسی دوسری کتاب لغت میں نہیں ملتا۔ مثلاً 'لغت نامۂ دہخدا' مؤلفہ علی اکبر دہخدا میں لفظ فرہنگ کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"فرہنگ: مرکب از فر کہ پیشاوند است و ہنگ از ریشۂ ثنگ۔ اوستائی بمعنی کشیدن و فرہختن۔ فرہنگ ہر دو مطالب است باریشۂ ادوکا (EDUCA) و ادور (EDURE) در لاتینی کہ بمعنی کشیدن و نیز بمعنی

> تعلیم وتربیت است‘‘

اسی مناسبت سے اس میں فرہنگ ساز کے معنی دانشمند وخردمند اور فرہنگ داں جس کے معنی عالم اور دانشمند لکھے ہیں۔ اسی مادے کا دوسرا لفظ ’’فرہنج‘ جس کے معنی لغت نامہ دہخدا میں ’علم و دانش وفضل ودانش وعقل وادب‘ اور ’’کتابی را نیز گویند کہ مشتمل باشد بر لغاتِ فارسی‘‘ ہیں۔ اسی طرح برہانِ قاطع میں اس کے معنی ’’علم ودانش وادب وبزرگی وسنجیدگی وکتاب فارسی‘‘، بتائے گئے ہیں۔

موجودہ دور میں لفظ فرہنگ اردو کتاب لغت کے لیے بھی بکثرت استعمال ہوتا ہے

’نوادر الالفاظ‘ مؤلفہ سراج الدین علی خاں آرزو کے مقدمے میں سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ’’اردو میں فرہنگ نویسی کا باقاعدہ آغاز عہد عالمگیری میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اردو کی قدیم ترین لغت ’غرائب اللغات‘ اسی زمانے میں لکھی جاتی ہے۔‘‘

اس طرح لفظ فرہنگ کے معنی میں جو حد بندی ہوگئی تھی اس میں وسعت پیدا ہوئی اور فارسی کے علاوہ اردو کی کتب لغت کے لیے بھی استعمال ہونے لگی۔ چنانچہ صاحب مہذب اللغات اس طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> فرہنگ: فارسی زبان کی لغت: فارسی زبان کی ڈکشنری۔ کچھ عرصے اردو لغتوں کے لیے بھی فرہنگ استعمال ہونے لگا ہے۔ جیسے فرہنگِ آصفیہ اور فرہنگ اثر وغیرہ۔‘‘

ان تشریحات سے کئی باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ زیادہ تر لغت نویس لفظ فرہنگ لفظ ڈکشنری (dictionary) کا مترادف مانتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ بنیادی طور پر اسے لغت کے لیے مختص کیا گیا۔ تیسرے یہ کہ کبھی کبھی اسے اردو کی کتاب لغت کے لیے بھی لیا جاتا ہے۔ چوتھے یہ کہ فرہنگ اور کتابِ لغت ہم معنی الفاظ ہوئے۔ لیکن فی الحقیقت نہیں ہے۔ فرہنگ اور

کتابِ لغت کے معنیٰ و مفہوم میں بنیادی فرق ہے۔ موجودہ دور میں لفظ فرہنگ محض ڈکشنری یا کتابِ لغت کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا، بلکہ ایسی لغت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں لغات نویسی کے ٹکے بندھے اصول سے ذرا انحراف کر کے زیادہ وسعت اور جامعیت سے کام لیا گیا ہو۔ اس طرح یہ خالص کتابِ لغت کی حدود سے تجاوز کر کے انسائیکلو پیڈیا (دائرۃ المعارف) کی سرحد میں داخل ہو جاتی ہے۔ لیکن مکمل طور پر داخل نہیں ہو پاتی اور ڈکشنری و انسائیکلو پیڈیا کے درمیان کی کڑی بن جاتی ہے۔

اکثر فرہنگ نویسوں نے لفظ فرہنگ کے معنیٰ علم و دانش، ادب اور بزرگی کے بھی لکھے ہیں۔ ان سے ایک بڑے اہم پہلو کی جانب نشان دہی ہوتی ہے اگر ہم ان دونوں معانی میں ربط قائم کر دیں اور 'کتاب لغت فارسی' سے توسیع دے کر 'کتاب علم و دانش اور ادب و حکمت' کر دیں تو یہ موجودہ فرہنگ کے مفہوم سے قریب تر ہو جائیں گے۔ اسی لیے انجمن آرای ناصری، مؤلفہ رضا قلی خاں ہدایت کی مندرجہ ذیل تشریح زیادہ قریب المطلب معلوم ہوتی ہے:

> "فرہنگ بمعنی ادب و اندازہ۔ ہر چیزی و ادب کنند و امر بادب کردن۔ واصل ایں لفظ فرو ہنگ است۔ چہ ھنگ مرادف ہوش است و کتابی را گویند کہ دارد تحقیق قواعد، معانی الفاظ و لغاتِ نمایندہ و در لغتِ عرب ادب بمعنی نگاہ داشتن ہر چیزی و علوم عربیت و علوم ادبیہ دہ است: نحو و صرف و معانی و بدیع و عروض و قوافی و امثال لغت و استیفاء و ایں علوم را ادبیہ از آں گویند کہ بداں نگاہ داشتہ می شود۔ اعرب و حرکات و ضبط مادہ اشتقاق و صحت الفاظ ہم چنیں کتب لغات فرس و مادۂ اشتقاق مفردات و صیغۂ مرکبات۔ وفرہنجیدن بمعنی ادب کردن است۔"

گویا فرہنگ سے مراد ایسی کتاب ہے جس میں کسی زبان کے الفاظ، محاورات، مصطلحات، متروک الفاظ اور تلمیحات وغیرہ درج ہوں اور ان کی مکمل تشریح مع اعراب اور تحقیقِ قواعد کی گئی

ہو۔ اسی لیے انگریزی میں فرہنگ (glossary) کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"A list usually alphabetical,and explanation of obsolete dialectical, or technicatl terms."

اس طرح فرہنگ ایک عام کتاب لغت سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ موخرالذکر میں الفاظ اور محاورات کے معنیٰ اس انداز سے دیے جاتے ہیں کہ لفظ کے بدلے لفظ اٹھا کر رکھ دیا جاتا ہے اور کبھی کبھی معنیٰ میں تنوع ظاہر کرنے کے لیے اساتذہ کے اشعار دے دیے جاتے ہیں۔ لیکن الفاظ کی تشریح و توضیح کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے۔ اور قواعد سے یکسر صرفِ نظر کر لیا جاتا ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے ایک جامع لغت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے تجویز کیا تھا:

> ”ایک کامل لغت میں ہر لفظ کے متعلق یہ بتانا ضروری ہوگا کہ وہ کب، کس طرح اور کس شکل میں اردو زبان میں آیا اور اس کے بعد سے اور اس وقت سے تا حال اس کی شکل و صورت اور معانی میں کیا کیا تغیر ہوئے۔ اس کے کون کون سے معنیٰ متروک ہو گئے اور کون کون سے اب تک باقی ہیں اور اس میں اب تک کون کون سے نئے معنیٰ پیدا ہوئے ہیں۔ ان تمام امور کی توضیح کے لیے زبان کے ادیبوں کے کلام سے نظائر پیش کرنے ہوں گے۔ ہر لفظ کے اصل کی تحقیق کرنی ہوگی یعنی یہ بتانا ہوگا کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے، اس کی صورت وہی ہے جو اصل میں تھی یا بدل گئی ہے۔ اصل زبان میں اس کے کیا معنیٰ تھے اور اب کیا ہیں اور اگر درمیان میں کچھ تغیرات ہوئے تو وہ کیا تھے۔ لفظ کی تاریخی حالت معلوم کرنے کے لیے اصل اشتقاق کا معلوم کرنا بہت ضروری ہے۔ اس کے علاوہ یہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس میں مماثل اور ہم علاقہ الفاظ کے صحیح تعلقات اور ہم شکل مگر مختلف الاصل الفاظ کی تحقیق اور ان میں امتیاز ہو سکتا ہے۔“[۱]

ظاہر ہے اتنی جامع اور مفصل لغت ہماری زبان میں نہیں ہے۔ اردو میں لغت نویسی کا جو انداز رائج

ہے اس میں صرف الفاظ کے معنیٰ دے دیے جاتے ہیں اور ان کے تلفظ کی وضاحت کر دی جاتی ہے، کبھی عبارت میں اور کبھی اعراب لگا کر۔ لیکن فرہنگ کا دائرہ تشریح و توضیح میں عام لغت سے کہیں زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔

ایک عام کتابِ لغت اور فرہنگ کے دائرۂ کار میں بھی بڑا فرق ہوتا ہے۔ عام لغت میں زبان کے تمام الفاظ بلا کسی تخصیص کے شامل کر لیے جاتے ہیں۔ ان میں قدیم و جدید، مستعمل و متروک وغیرہ سبھی آ جاتے ہیں۔ جب کہ فرہنگ میں مشمولہ الفاظ میں اتنی عمومیت اور وسعت نہیں ہوتی۔ اس میں کسی مخصوص زاویے سے الفاظ کو منتخب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ فارسی میں کچھ قدیم لغات محض شاعری سے متعلق الفاظ و محاورات پر ہی مبنی ہیں اور اس قسم کی مخصوص لغات کے لیے فرہنگ کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی جب کہ عمومی لغت کو محض کتابِ لغت کہا جاتا تھا۔ آقا سید محمد علی 'فرہنگ نظام' کے مقدمے میں لکھتے ہیں:

> "گفتیم کہ فرہنگہای فارسی تا حال نوشتہ شدہ دو دستہ است۔ دستۂ اول داری الفاظ مخصوصۂ شعری است نہ الفاظ تکلمی و نثری مستعملہ در شعر و دستۂ دوم داری تمام الفاظ فارسی چہ در دستۂ دوم آں الفاظ کہ در اشعار استعمال نہ شدہ مذکور نیست۔"
>
> "در دستۂ اول فرہنگہای فارسی غیر الفاظ مخصوصۂ شعری نبود ازیں جہت برای اثبات معنیٰ ہر لفظ یک سند شعری میاورند تا از سیاق ترکیب شعر معنیٰ آں لفظ شعری بفہم درآید و چوں در دستۂ دوم فرہنگہا الفاظ غیر مخصوص شعری ہم مزید شد ہماں رسم باقی ماند کہ برای سندِ معنی ہر لفظ شعری ہم یک شعر میاورند با آنکہ آں لفظ در تکلم و نثر ہم استعمال می شد و جملۂ تکلمی و نثری بہتر بود چہ در شعر استعمالات مجازی بسیار است و استعمال لفظی در شعری برای معنی مخصوص دلیل برایں نیست کہ آں معنی حقیقی آں لفظ باشد۔ مثلاً اگر لفظ شیر را شاعری برای پہلوان استعمال کردہ سند نمی شود کہ پہلوان ہم یک معنیٰ شیر باشد۔"[2]

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

"......خوب واضح شود کہ تالیفِ ہر فرہنگ برای اشعار بود۔"[۳]

گویا فارسی میں کتب لغت بنیادی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جن میں صرف وہی الفاظ شامل کیے جاتے ہیں جو شاعری سے مختص ہیں اور دوسری وہ جو کسی خاص صنفِ شاعری سے مختص نہیں ہوتیں بلکہ ان میں فارسی زبان کے تمام الفاظ بلا کسی تخصیص کے شامل کر لیے جاتے ہیں اور چونکہ مستند اور معیاری زبان شاعری کی تصور کی جاتی تھی اس لیے الفاظ کے معنی متعین کرتے وقت اشعار ہی سے استناد کیا جاتا تھا۔ پہلی قسم کی کتبِ لغات کو عام طور پر اشعار کی شرح سمجھا جاتا تھا اور ان کا بنیادی مقصد مخصوص شعرا کے کلام کی تفہیم میں معاونت کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ شیخ 'محمد لاد مؤید الفضلاء' کا سببِ تالیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "واین نسخہ کافی و شافی است برای خواندان و سبق گفتنِ شاہنامۂ فردوسی طوسی و خمسۂ نظامی دستۂ سنائی و دواوین خاقانی و انوری و ظہیر و عبہری و حافظ سلمان و سعدی و خسرو و جز آں۔"

عام طور پر فرہنگ نویسی کا بنیادی مقصد اشعار کی تشریح ہوتا تھا اور اگر کبھی دائرہ شاعری سے بڑھ کر نثر کی جانب توجہ کر لی جاتی تھی تو اس میں صرف ان ہی الفاظ کا انتخاب کیا جاتا تھا جو متروک ہو چکے تھے، معروف الفاظ کو اس میں شامل نہیں کیا جاتا تھا۔ آقا سید محمد علی مؤلف فرہنگِ نظام کا بیان ہے:

> "پس معلوم شد ہر چہ فرہنگِ فارسی نوشتہ شدہ برای اشعار بودہ و اگر فرہنگ نویسی بالتبع نظری بہ نثر و انشاء داشتہ برای الفاظ متروکہ نثر بودہ، نہ الفاظ مستعمل و تکلمی آں۔"[۴]

فرہنگ نویسی کا بعینہ یہی انداز مغربی زبانوں میں بھی رائج تھا۔ اس کے ابتدائی نمونے لاطینی، یونانی، جرمن، رومن اور انگریزی زبانوں میں ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی قابلِ ذکر شخصیت یونان کے مشہور قواعد نویس آتھنیز (Authneaus) کی ہے جس سے کم و بیش ۳۵ فرہنگیں منسوب کی جاتی ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد منتخب الفاظ کی تعبیر و تشریح کرنا تھا۔ اس کا عہد ۲۵۰ ق۔ م۔ ہے۔ اس کے بعد زندوتس (Zendotus) کا نام آتا ہے جس نے glossai homerika ترتیب دی۔ اس میں یونان کے

ممتاز ترین رزمیہ شاعری ہومر (Homer) کی شہرۂ آفاق نظموں ایلیڈ (Illiad) اور آڈیسی (Odyssey) میں مستعمل غیر معروف الفاظ کی تشریح کی گئی ہے۔ اس کی جانشینی کے فرائض اس کے شاگرد رشید باز نطینہ کے Aristophanes نے انجام دیے جس کی تالیف PERU-LEXICAN کا شمار آج بھی اہم ترین فرہنگوں میں ہوتا ہے۔

انگریزی میں اولین اہم لغت رابرٹ کاؤڈرے (Robert Cowdrey) کی A TABLE AIPHABETICAL ملتی ہے یہ ۱۶۰۴ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ فرانسیسی اور لاطینی متون پر مبنی ہے جن کی انگریزی زبان میں تشریح وتوضیح کی گئی ہے۔ عام قاعدے کے بموجب اس میں صرف مشکل الفاظ کو ہی شامل کیا گیا، آسان اور معروف الفاظ کو اس واہمہ پر نظر انداز کر دیا گیا کہ ان کے معنی تو سب جانتے ہی ہیں۔ اسی انداز پر ۱۶۵۸ء میں جون ملٹن (John Milton) کے برادر زادے ایڈورڈ فلپس (Edward Phillips) نے New worlds of English words تالیف کی۔ اس کے مقدمے میں فاضل مؤلف نے وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس میں صرف ان ہی الفاظ کی تشریح پیش کی گئی ہے جو انگریزی میں دوسری زبانوں سے ماخوذ ہیں۔ ان کے علاوہ بائبل کی بھی متعدد فرہنگیں ملتی ہیں جن کا بنیادی مقصد غریب اور نامانوس الفاظ کی توضیح کرنا ہے۔ ان سب کی حیثیت کتب لغت (Dictionary) کی کم اور فرہنگ (Glossary) کی زیادہ ہے۔

مندرجہ بالا شواہد سے پتا چلتا ہے کہ فارسی فرہنگ اور مغربی زبانوں میں (Dictionary) کی نوعیت موضوعی لغت (Subject Dictionary) کی ہوتی ہے۔ لیکن فارسی مؤلفین ایک عام کتابِ لغت اور فرہنگ میں امتیاز نہیں کرتے۔ اور عام انداز کی کتابِ لغت کو بھی بلا تکلف فرہنگ کے نام سے موسوم کر دیتے ہیں۔ چنانچہ فرہنگِ آنندراج، فرہنگ نظام، فرہنگ انجمن آرای ناصری، فرہنگ جہانگیری اور فرہنگِ رشیدی وغیرہ جیسی کتب لغات کو بھی فرہنگ کہا گیا ہے جب کہ ان کے محتویات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

ہندوستان میں فارسی لغت نویسی کی ابتدا فخرالدین مبارک غزنوی کی 'فرہنگ نامہ قواس' سے ہوتی

ہے۔ اس کے سنہ تالیف کا تعین نہیں ہو سکا البتہ مؤلف کا عہد اواخر ساتویں صدی ہجری (تیرھویں صدی عیسوی) ہے۔ تالیف کا انداز عام لغت جیسا ہے۔ الفاظ کے معنی میں تفصیل سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ البتہ سند کے طور پر مستند شعراے فارسی کے اشعار نقل کیے گئے ہیں۔ اس طرح اس میں کسی حد تک محققانہ شان پیدا ہوگئی ہے۔ جن شعرا کے کلام سے استفادہ کیا گیا ہے ان میں مسعود سعد سلمان، سوزنی سمرقندی، سنائی، معزی، خاقانی، انوری، عطار، ظہیر فاریابی، وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ دوسرے درجے کے شعرا کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ لیکن رومی، اور سعدی جیسے اساتذۂ فن کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

فخر الدین مبارک نے الفاظ کی ترتیب میں بھی کسی قدر ندرت سے کام لیا ہے۔ عام طور پر لغات میں الفاظ ایک سلسلے سے الفبائی ترتیب میں دیے جاتے ہیں۔ لیکن مذکورہ فرہنگ میں انھیں موضوع کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس سے یہ فائدہ تو ضرور ہوگیا کہ مختلف موضوعات سے متعلق تمام الفاظ اپنے موضوع کے تحت یک جا ہو گئے ہیں لیکن ایک عام کتاب لغت کے مقابلے میں، جس میں الفاظ کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہوتی ہے، اس کی افادیت کم ہوگئی ہے۔ تاہم اس کو اولیت کا شرف حاصل ہے اور اس لحاظ سے اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ پروفیسر نذیر احمد کا بیان ہے:

> ”فرہنگ اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ ہندوستان میں فرہنگ نویسی کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے۔ اس کی پیروی میں ہندوستان میں متعدد فرہنگیں لکھی گئیں۔ ۷۷۳ یا ۷۴۳ ہجری میں حاجب خیرات نے ’دستور الافاضل‘ لکھی۔ ۸۲۲ ہجری میں قاضی خاں بدر محمد نے ’ادات الفضلا‘ مرتب کی۔ انہی ایام میں بدر ابراہیم نے ’زفان گویا‘ لکھی اور ۸۳۷ھ میں محمد بن قوام بلخی کرئی شارح مخزن اسرار (تالیف ۷۹۵ھ) نے ’بحر الفضائل‘ مکمل کی۔ ۸۷۹ھ سے قبل ابراہیم بن قوام فاروقی نے ’شرفنامہ اور ۹۲۵ھ میں شیخ لاد نے ’مؤید الفضلا‘ لکھی۔ ۱۰۰۱ ہجری میں ’مدار الافاضل‘ اور ۱۰۱۴ھ میں ’فرہنگِ جہانگیری‘ وجود میں آئی۔ ان تمام فرہنگوں کی تیاری میں سوائے ’موید الفضلا‘ کے براہ راست ’فرہنگنامۂ قواس‘ سے استفادہ کیا گیا اور اسی کی پیروی میں ان تمام کتابوں میں بعض جگہ ہندی متبادل الفاظ بھی دے دیے گئے ہیں۔“ [۵]

ان کے علاوہ ہندوستان میں جو فارسی لغات تالیف کی گئیں ان میں سب سے زیادہ اہمیت فرہنگ

جہانگیری کی ہے، یہ سب سے پہلی لغت ہے جس کی بنیاد متون پر ہے، اس نے اپنی ۴۴ سے زیادہ لغت کی کتابوں کے علاوہ سیکڑوں منظوم و منثور تصانیف سے الفاظ کا انتخاب کیا ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ پہلی فرہنگ ہے جس میں اصول فرہنگ نگاری کو ملحوظ رکھا گیا ہے، اگرچہ یہ کام اکبر اعظم کے زمانے میں شروع ہوا لیکن مولف نے ۱۰۱۷ھ میں اس کو مکمل کر کے جہانگیر کے نام معنون کیا ہے، عبدالرشید ٹھوی نے اپنی کتاب فرہنگ رشیدی میں فرہنگِ جہانگیری کے بعض بیانات پر ایراد کیا ہے، لیکن اس نے جہانگیری سے جتنا استفادہ کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ خان آرزو نے جہانگیری اور رشیدی کے درمیان سراج اللغۃ میں محاکمہ کیا ہے۔ سراج اللغۃ بھی فرہنگ نویسی کے صحیح اصول پر مبنی اور نہایت محققانہ کام ہے۔ برہان قاطع، مؤلفہ محمد حسین برہان (۱۸۳۲ء) بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس پر مرزا غالبؔ کی تنقید ’قاطع برہان‘ کے عنوان سے شائع ہوئی جس کے نتیجے میں حملوں اور جوابی حملوں کا بازار گرم ہو گیا۔ اس کا آغاز سعادت علی خان نے کیا۔ انھوں نے ۱۸۶۴ء میں محرق قاطعِ برہان تالیف کی جس میں مرزا غالب کی قاطع برہان پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ ان کی ہم نوائی ۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء میں احمد علی احمد نے مؤید برہان بجواب قاطع برہان لکھ کر کی۔ اسی سنہ میں واقعِ ہذیان شائع ہوئی جو محرق قاطع برہان کے رد اور قاطع برہان کی تائید میں ہے۔ اسے محمد نجف علی خاں سے منسوب کیا گیا۔ اسی سلسلے کی ایک اور اہم کڑی امین الدین احمد دہلوی کی قاطع القاطع ہے جو ۱۲۸۳ھ/۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی۔ یہ بھی برہان قاطع کے جواب میں ہے۔ اس میں تنقید کا لہجہ بہت سخت ہے۔ یہ پورا سلسلہ اگرچہ کافی تکلیف دہ رہا جس میں فریقین نے ایک دوسرے پر سخت حملے کیے اور در عدالت پر دستک بھی دی، تاہم اس کا ایک تعمیری پہلو یہ نکلا کہ بہت سے الفاظ کی صحیح تحقیق ہو گئی اور ان کے معانی و مفاہیم کا تعین ہو گیا۔

ان کے علاوہ دیگر اہم کتب لغات میں کشف اللغات از عبدالرحیم (۱۸۷۴۔۷۵ء) فرہنگ رشیدی از عبدالرشید (۱۸۷۲ء)، لطائف اللغات معروف بہ فرہنگ لغات مثنوی مؤلفہ مولانا روم، مؤلفہ عبداللطیف (۱۸۷۷)، زبدۃ اللغات معروف بہ فرہنگ لغات سروری، مؤلفہ غلام سرور (۱۸۷۷ء) بہار عجم مؤلفہ ٹیک چند بہار (۱۸۷۹ء) ہفت قلزم (۷ جلدیں) مؤلفہ قبول محمد (۱۸۷۹ء) فرہنگ آنند راج (تین

جلدیں) مؤلفہ محمد بادشاہ (۱۸۸۹ء)، غیاث اللغات مؤلفہ غیاث الدین (۱۸۲۶ء/۱۲۴۲ھ) اور آصف اللغات، مؤلفہ عزیز جنگ (۱۹۲۱ء/۱۳۴۰ھ۔ ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ف) فارسی کی مستند اور معیاری لغات ہیں۔ ان میں بجز لطائف اللغات کے سب کا انداز عام کتب لغات جیسا ہے اور سب کے محتویات بھی کم وبیش یکساں ہی ہیں۔ اکثر لغت نویسوں نے فارسی اشعار سے استناد بھی کیا ہے۔ ان میں آصف اللغات سب سے زیادہ ضخیم ہے۔ یہ ۱۷ جلدوں میں ہے اور ان میں بھی 'ج' تک کے حروف آسکے ہیں۔ اس طرح یہ نامکمل رہ گئی۔ مؤلف نے الفاظ کی جمع وترتیب اور ان کی تعبیر وتشریح میں بڑی محنت اور جانفشانی سے کام لیا ہے۔ اکثر مقامات پر اردو کے مترادف الفاظ بھی دے دیے ہیں۔ اگر یہ مکمل ہو جاتی تو فارسی لغت نویسی کی تاریخ میں ایک اہم اضافہ ہوتی۔

اردو میں لغت نویسی کی جانب اولین کوشش فضل الدین محمد بن قوام نے کی جنھوں نے آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں 'بحر الفضائل فی منافع الافاضل' تالیف کی۔ یہ فارسی لغت ہے لیکن آخر میں ایک باب شامل کر دیا گیا ہے جس میں ہندی شاعری میں مستعمل ہندی الفاظ کو درج کیا گیا ہے ۷۔ اسی طرح ضیاء الدین ۸ خسرو کی خالق باری بھی ہے جسے عام طور پر حضرت امیر خسرو سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ منظوم ہے اور اس میں اردو، ہندی، فارسی اور عربی کے مترادفات کو نظم کیا گیا ہے۔

اسی سلسلے کی ایک اور کوشش انشا کی 'دریائے لطافت' ہے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے الفاظ ہیں:

> "انشا پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو زبان، اس کی لغت اور محاورے اور اس کی صرف ونحو پر غور کیا۔ ان کی 'دریائے لطافت' بے مثل کتاب ہے جو ان کی لسانی قابلیت، وسعتِ نظر اور ذوق صحیح پر شاہد ہے۔ اگرچہ اس کتاب کو لغت کے ذیل میں شریک نہیں کیا جاسکتا لیکن اس میں زبان کی لغت کا بہت کچھ سامان ہے اور اردو کی کوئی لغت اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔" ۹

لیکن ایسی کتاب جسے ہم اردو کی پہلی باقاعدہ لغت قرار دے سکتے ہیں وہ عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات ہے۔ اس میں اردو کے الفاظ، مصطلحات اور محاورات کی فارسی زبان میں تشریح کی گئی ہے۔ اس کی تالیف کا بنیادی مقصد فارسی داں طبقے کو عوام کی نئی زبان سمجھنے میں معاونت کرنا اور اس کی تفہیم میں درپیش

مشکلات کو دور کرنا تھا۔ فاضل مؤلف نے اپنے مقصد کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> ''...... ہر چند ایں ہیچ مداں را لیاقتِ ترتیب و قابلیتِ تالیف نبود، لیکن کثرت الحاح
> جمع کثیر از اصحاب و فرط اقتراح جم غفیر اولی الالباب باعث براں باشد کہ اسمائے
> غیر مشہورہ و اشیائے موفورہ و الفاظِ غیر مانوسہ معانی بین الانام مذکورہ را بہ عبارات
> واضحہ و اشارات لائحہ بیان نماید تا فائدۂ آں عام و نفع آں تمام شد۔''[۱۰]

غرائب اللغات اردو لغت نویسی کی جانب اولین قدم ہے۔ مؤلف کے پیش نظر کسی اردو لغت کی مثال نہ تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر انھوں نے فارسی کتب لغات کو اپنا رہنما بنایا اور ان ہی کی طرز پر اسے تالیف کیا۔ چنانچہ انھوں نے ان ہی الفاظ کا انتخاب کیا جو غریب اور نامانوس تھے کے علاوہ عوام کی بول چال میں عربی، فارسی، اردو، ہندی اور ترکی کے وہ عام الفاظ بھی شامل کیے جو عام طور پر فارسی شعرا کے کلام میں نہیں ملتے۔

مجموعی طور پر غرائب اللغات کا معیار کچھ زیادہ اعلیٰ اور عالمانہ نہیں ہے۔ بلکہ بعد میں تالیف شدہ کتب لغات کے مقابلے میں کافی پست ہے۔ تاہم اس کی اہمیت سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں سید عبداللہ کی رائے انتہائی متوازن اور مناسب معلوم ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اردو میں لغت نگاری کی تاریخ کے سلسلے میں غرائب اللغات کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں، خصوصاً تقدم زمانی کی وجہ سے اس کو جو اہمیت حاصل ہوگئی ہے اس کو کسی طرح گھٹایا نہیں جا سکتا۔ درحقیت ہانسوی کی اس کتاب میں وہ سب خصوصیتیں موجود ہیں جو کسی فن کے موسس اور ابتدا کرنے والے شخص کی تصنیف میں ہوا کرتی ہیں۔ ایسی کوششیں اس لحاظ سے بڑی قابلِ قدر ہوتی ہیں کہ وہ بعد میں آنے والوں کو راستہ دکھاتی ہیں۔ بہ ایں ہمہ تحقیق و صحت کے اعتبار سے غرائب کو بلند پایہ تصنیف نہیں کہا جا سکتا۔ یہ ایک سیدی سادی کتاب ہے جس میں متوسط درجے کے طلبۂ علم کی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس کی تشریحیں مختصر اور بعض اوقات بے حد تشنہ ہوتی ہیں بلکہ بیشتر عربی یا فارسی مرادفات تک محدود ہوتی ہیں۔''[۱۱]

اس سلسلے کی دوسری اہم کڑی سراج الدین علی خاں آرزو کی تالیف 'نوادر الالفاظ' ہے۔ یہ

۱۱۶۵/۱۷۵۲ء کی تالیف ہے۔ دراصل یہ غرائب اللغات کی ترمیم و تصحیح ہے۔ اور حسب ضرورت الفاظ میں اضافہ بھی ہے۔ چنانچہ اس کے دیباچے میں مؤلف لکھتے ہیں:

> "چوں اکثر در بیان معانی الفاظ تسہلے و سقمے بہ نظر آمد لہٰذا دریں باب بقلم آوردہ۔ اے کہ سہو و خطائے معلوم کرد اشارات بداں نمود و ہر آنچہ بہ طبع ناقص ایں کمال درست در آمد براں افزود۔"۱۲

لیکن سقم دور کرنے یا عبدالواسع سے معنی و مطالب میں اختلاف کرنے میں خان آرزو نے ہر جگہ ہریانی کی بجائے برج بھاشا سے سند پیش کی ہے۔ وہ زبان اہل اردو، یا زبان اردو نے شاہی کو معیاری تسلیم نہیں کرتے۔ مجموعی طور پر خان آرزو نے حتی الامکان تحقیق و جستجو سے کام لیا ہے۔ اور تنقید و تنقیح میں عالمانہ معیار کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس طرح انھوں نے نوادر الالفاظ کو اعلیٰ لسانی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی خصوصیات کا حامل بنادیا۔ غرائب اللغات میں الفاظ کی ترتیب بھی ناقص تھی، خان آرزو نے اس سقم کو بھی دور کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں انھیں کما حقہ کامیابی حاصل نہ ہوئی نوادر الفاظ کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

> "خان آرزو نے غرائب اللغات کی تصحیح ہی نہیں کی بلکہ بہت کچھ اضافہ بھی کیا ہے۔ یہ کتاب غرائب اللغات سے حجم میں بھی زیادہ ہے۔ غرائب اللغات میں لفظ کے معنی اختصار کے ساتھ دیے گئے ہیں مگر خان آرزو نے معنیٰ کے ساتھ اکثر الفاظ کی تحقیق بھی کی ہے اور جگہ جگہ فارسی اور ہندی کے اشتراک و توافق کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ غالباً یہ پہلے شخص ہیں جن کی نظر اس لسانیاتی نکتے کی طرف گئی ہے۔ غرائب کے الفاظ کی تصحیح میں کاوش کی ہے اور دادِ تحقیق دی ہے۔ اگرچہ نوادر الالفاظ باعتبار صحت و تحقیق غرائب اللغات سے کہیں بڑھی ہوئی ہے، لیکن تقدم کی فضیلت ملا عبدالواسع کو حاصل ہے۔"۱۳

فنِ لغت نویسی کی تاریخ میں اوحد الدین بلگرامی بھی خصوصی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ۱۸۲۷ء

میں نفائس اللغات، تالیف کی۔ اس سے اگرچہ لغت نویسی میں کسی نئے باب کا اضافہ نہیں ہوتا، تاہم یہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں اردو الفاظ کی فارسی تشریح کے ساتھ عربی مترافات بھی دیے ہیں اور تینوں زبانوں کے الفاظ کے تلفظ کو عبارت میں ظاہر کیا ہے۔ اس میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ سند کے طور پر جو اشعار نقل کیے گئے ہیں وہ عربی اور فارسی کے ہیں، اردو کے نہیں۔ اس طرح ان سے اصل اردو لفظ کے بجائے ان کے عربی اور فارسی مترادفات کی سند ملتی ہے۔ مثلاً ”سبیل رکھنا“ کے معنی کی تشریح اس طرح کی گئی ہے:

> ”سبیل رکھنا ___ وقف کردن آب وغیر آں را در راہ خدا۔ بفارسی سبیل کردن وکشتان و آب خیر کردن گویند۔ عرفی گوید
>
> ؎ تمام چوں شدہ ام بخت کو غمزۂ درست
> بشاہراہ سعادت کند سبیل مرا
>
> میر معزی گوید
>
> ؎ کشادہ روی و کشادہ کف و کشادہ دلش
> زمال و جاہ برآزادگاں کشاد سبیل“

نفائس اللغات میں الفاظ کی تعداد زیادہ ہے، محاورات بہت کم ہیں۔

اردو کے مشہور شاعر میر علی اوسط رشک نے بھی ’نفس اللغۃ‘ کے نام سے ایک ضخیم لغت کی ترتیب کا منصوبہ بنایا اور اس پر کام بھی شروع کر دیا تھا۔ چنانچہ ۱۸۴۴ء میں اس کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ جو صرف الف سے تائے فوقانی تک کے حروف پر مشتمل ہے۔ اس میں الفاظ کے صرف معنی دیے گئے ہیں؛ کہیں کہیں تشریح بھی دی گئی ہے۔ محاورات کی تعداد بہت کم ہے۔ معنی کے استناد کے لیے اشعار بھی نہیں دیے گئے اور نہ ہی کوئی دوسری قسم کی نظیر پیش کی گئی ہے لیکن رشک چونکہ خود ایک باکمال شاعر اور ناسخ کے ارشد تلامذہ میں تھے اس لیے لغات کے سلسلے میں ان کی رائے سند کا درجہ رکھتی ہے۔

اردو لغات کی مروجہ کتب میں سب سے زیادہ اہمیت مولوی سید احمد دہلوی کی ’فرہنگ آصفیہ‘ کو حاصل ہے۔ یہ چار جلدوں میں ہے پہلی جلد ۱۸۸۷ء [کذا] میں منظر عام پر آئی۔ اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں

دوسری، ۱۹۰۸ء میں تیسری اور ۱۹۱۸ء میں چوتھی جلد شائع ہوئی۔ یہ لغت بڑی حد تک جامع ہے اور صحیح معنیٰ میں فرہنگ کے بیشتر لوازم کو پورا کرتی ہے۔ یہ چاروں جلدیں تقطیع میں ۱۸x۲۲ سائز پر ہیں۔ پہلی جلد میں الف سے تائے فوقانی تک، دوسری جلد میں ٹ سے زائے معجمہ تک، تیسری میں سین مہملہ سے کاف عربی تک اور چوتھی جلد میں کاف فارسی سے یائے تحتانی تک کے الفاظ، محاورات اور مصطلحات شامل ہیں۔ اس میں اردو، فارسی، عربی، ترکی، ہندی اور سنسکرت کے علاوہ مغربی زبانوں میں انگریزی، لاطینی سریانی اور رومن وغیرہ کے ایسے الفاظ شامل ہیں جو کثرتِ استعمال سے اردو میں رائج ہو گئے ہیں۔ الفاظ، محاورات اور ضرب الامثال کے علاوہ اہم شخصیات اور مقامات کو بھی شامل کیا گیا ہے جس کے سبب اس کی حیثیت محض کتاب لغت سے بڑھ کر دائرۃ المعارف کی ہو گئی ہے۔ الفاظ کے معنیٰ اور مفاہیم متعین کرنے کے لیے اساتذہ کے کلام سے استناد کیا گیا ہے۔ اس کے محتویات کی ہمہ گیری اور وسعت کا اندازہ اس تشریحی عبارت سے کیا جاسکتا ہے جو مؤلف نے ٹائیٹل کے ساتھ اس کی جامعیت کو واضح کرنے کی غرض سے تحریر کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور انگریزی لغات مخلوطہ بہ اردو، عدالتی و بیگماتی محاورات، اہلِ پیشہ و اہلِ حرفہ کی ضروری اصطلاحات، داخلِ روز مرہ ضرب الامثال، اشارے، کنائے، تاریخی واقعات، مناسبِ حال مادے، تذکیر و تانیث کے فیصلے، فلسفہ و طبیعات کے حسبِ موقع مسئلے، علم زبان کے نکتے، اردو صرف و نحو کے قاعدے، ملک کی متداولہ رسمیں، قدیم و جدید تحقیقات کے اختلافات، مع نظائر نظم و نثر کثرت معانی و وجہ تسمیہ، تمام اولیائے ہند اور تمام فقرائے ہند کے اسمائے گرامی مع حالات، علمائے نامی کے نام اور مختصر سوانح عمریاں اور دیگر امور کی تشریحات جو پچپن ہزار سے متجاوز ہیں۔“

مولوی سید احمد دہلوی ماہر لسانیات تھے جس کا ثبوت فرہنگ کی جلد اول کے ابتدائی باب سے ملتا ہے۔ اس میں انھوں نے اردو زبان کی پیدائش اور ارتقا سے بحث کی ہے اور تاریخی اعتبار سے الفاظ کی

سرگزشت بیان کی ہے۔ اس سے الفاظ پر ان کی عمیق نظری کا ثبوت ملتا ہے۔ اسی طرح ان کو محاورات اور مصطلحات میں بھی خصوصی ملکہ حاصل تھا۔ 'لغات النسا' اس کی روشن دلیل ہے۔

اگرچہ بعض مقامات پر فاضل مؤلف سے اختلافِ رائے کی گنجائش موجود ہے، تاہم اس کی جامعیت اور ہمہ گیری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ بقول بابائے اردو مولوی عبدالحق:

> ‘‘اردو لغات پر اب تک جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب میں جامع اور مکمل اور سب سے کارآمد مولوی سید احمد دہلوی کی فرہنگِ آصفیہ ہے...... ایک تنہا شخص جس قدر محنت، کاوش اور تحقیق کر سکتا ہے، انھوں نے اس کا حق ادا کیا۔ اور ایسا بڑا کام کیا کہ اردو زبان ہمیشہ ان کی زیر بار منت رہے گی۔ گو الفاظ کی تحقیق میں غلطیاں بھی ہیں، بہت سے لفظ اور بعض محاورے بھی چھوٹ گئے ہیں، زمانۂ حال کی رو سے بہت کچھ اضافے کی ضرورت ہے، بعض جگہ بے جا طول نویسی سے کام لیا ہے، تاہم یہ کتاب ایسی ہے کہ مؤلف کو داد نہ دینا ظلم ہوگا۔’’[۱۴]

فرہنگ کمیاب ہوتی جا رہی تھی۔ ترقی اردو بورڈ، نئی دہلی نے اس کو ازسرِ نو شائع کر کے وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے[۱۵]۔

اردو کی ایک اور اہم لغت امیرؔ مینائی کی 'امیر اللغات' ہے۔ لیکن اس کی صرف ایک ہی جلد شائع ہو سکی جس میں صرف الف سے شروع ہونے والے الفاظ، محاورات اور مصطلحات ہی آ سکے ہیں اس میں الفاظ کے معنی، تشریح اور اساتذہ کے کلام سے استناد کا انداز مجموعی طور پر فرہنگ آصفیہ جیسا ہے۔

امیرؔ مینائی ایک باکمال شاعر، زبان داں اور ذی عالم انسان تھے۔ الفاظ کے مزاج شناس تھے اور محاورات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ انھوں نے لغت میں بڑی تحقیق، عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیا اور لغت کو ہر لحاظ سے معیاری بنانے کی کوشش کی۔ افسوس کہ منشی صاحب کی عمر نے وفا نہ کی اور ۱۹۰۰ء میں انھوں نے حیدرآباد میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس طرح امیر اللغات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ اس کمی کو کسی حد تک مولوی نور الحسن نیرؔ نے 'نور اللغات' مرتب کر کے پورا کیا۔

نور الحسن نیرؔ کاکوری کے ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ ذی علم، باصلاحیت اور صاحبِ

استطاعت عالم تھے۔ اردو کے مشہور نعت گو شاعر محسنؔ کاکوروی کے صاحب زادے تھے۔ اسی لیے زبان پر حیرت انگیز قدرت رکھتے تھے۔ انھوں نے چار جلدوں میں نور اللغات مرتب کی جو بڑی خصوصیات کی حامل ہے۔ لیکن الفاظ کی تعبیر وتشریح میں تفصیل سے کام نہیں لیا، نہ ہی اشعار سے معنی ومفہوم کی سند پیش کی ہے[۱۶]۔ صرف لفظ کے بدلے لفظ پیش کر دیا ہے اس طرح اس کے معنیٰ میں وہ وسعت نہیں جو فرہنگِ آصفیہ اور امیر اللغات کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کے بغور مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ فاضل مؤلف نے فرہنگِ آصفیہ سے خصوصی طور پر استفادہ کیا ہے جس سے اکثر مقامات پر اس ہی کے معنیٰ ہو بہو نقل کیے گئے ہیں۔

عہدِ جدید کی سب سے زیادہ طویل، مفصل اور ضخیم اردو لغت مرزا محمد مہذبؔ لکھنوی کی مہذب اللغات ہے[۱۷]۔ یہ ۱۳ جلدوں میں ہے لیکن مکمل نہ ہو سکی۔ اس میں 'داؤ' تک کے الفاظ آ سکے ہیں۔ افسوس کہ حال ہی میں مہذب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس لیے اس کے مکمل ہونے کی اب کوئی امید نہیں رہی۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۵۸ء میں شائع ہوئی تھی اور آخری یعنی تیرھویں جلد ۱۹۸۲ء میں۔ اسے اردو کی ضخیم ترین لغت ہونے کا شرف حاصل ہے[۱۸]۔ اس میں اردو کے الفاظ، محاورات، مصطلحات اور ضرب الامثال کے علاوہ اہم شخصیات، مقامات اور واقعات کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے فرہنگِ آصفیہ کی طرح اس کے مشمولات کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ اس کا انداز کسی حد تک مروجہ کتبِ لغات سے مختلف ہے۔ اس میں پہلے تو لفظ کے معنیٰ دیے گئے ہیں، اس کے بعد حسبِ ضرورت اس کی تشریح بھی دی گئی ہے، پھر کسی شعر یا نثر پارے سے اس کی سند پیش کی گئی ہے اور آخر میں 'قول فیصل' کا عنوان قائم کر کے فصیح، غیر فصیح، متروک یا رائج ہونے کا فیصلہ صادر کیا گیا ہے۔ فصاحت کا معیار عام طور پر دبستانِ لکھنؤ کی زبان کو قرار دیا ہے۔ اس کے بالاستیعاب مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ مؤلف کے پیشِ نظر فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات زیادہ رہیں چنانچہ اکثر معنیٰ ان ہی سے نقل ہو گئے ہیں۔ اسی طرح مختلف علوم وفنون کی تفصیلات بیان کرنے میں فارسی کی 'جامع العلوم' مؤلفہ واجد علی سے خصوصی طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

دکنی زبان کی پہلی لغت سید شعار احمد ہاشمی نے 'دکنی لغت' کے نام سے تالیف کی جو مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد سے شائع ہوئی۔ اس پر سالِ اشاعت درج نہیں ہے اس لیے اس کے عہدِ تالیف کا صحیح تعین نہیں کیا

جا سکتا۔ البتہ اس پر علامہ عبد اللہ عمادی کی تقریظ ہے جس سے کسی حد تک اس کی قدامت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ لغت جیبی سائز ہے اور بہت ہی مختصر ہے اور ایک عام قاری کی ضروریات کے لیے ناکافی ہے۔

دکنی زبان کی جامع اور تفصیلی لغت ترتیب دینے کا شرف ڈاکٹر مسعود حسین خاں کو بھی حاصل ہے۔ آپ نے ڈاکٹر غلام عمر خاں کے تعاون سے 'دکنی اردو کی لغت' مرتب کی جو پہلی بار ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی۔ اس میں دکنی زبان کے الفاظ و محاورات کے معنی و تشریح دی گئی ہے اور دکنی اشعار اور نثر پاروں سے استناد کیا گیا ہے۔ اس کے مقدمے میں مسعود صاحب فرماتے ہیں:

> ''یہ قدیم دکنی اردو کی لغت ہے جس کا تمام تر مواد اس زبان کے مخطوطات اور مطبوعات سے حاصل کیا گیا ہے۔ اس قسم کا کوئی کام نہ اب تک تجویز ہوا اور نہ تکمیل کیا گیا ہے۔ تاہم مجھے اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ اس کی حیثیت نشانِ راہ کی ہے، منزل کی نہیں۔''

ان کے علاوہ ایک دل چسپ انداز کی لغت 'لغات مقلوبہ' کے عنوان سے تالیف کی گئی اس میں ایسے الفاظ کو جمع کیا گیا ہے جو اپنی حالت مقلوب میں یعنی الٹ کر بھی پڑھے جا سکتے ہیں اور باقاعدہ الفاظ کی شکل میں ذو معنیٰ بھی ہیں۔ اس دلچسپ کام کو نادر حسن نرگاہی نے انجام دیا اور لکھنؤ سے اسے شائع کیا۔ اس پر سال اشاعت درج نہیں ہے۔ یہ کوئی ضخیم کام نہیں ہے صرف ۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

عام لغات کے علاوہ محاورات اور مصطلحات کی بھی متعدد لغات ملتی ہیں۔ اس ضمن میں سب سے اہم لغت نیاز علی بیگ کی 'مخزن فوائد' ہے جو ۱۸۸۶ء [کذا] ۱۹ میں شائع ہوئی۔ یہ خاصی ضخیم ہے اور معنیٰ بیان کرنے میں خصوصی احتیاط برتی گئی ہے اور ہر محاورے کی سند میں شعر نقل کیا گیا ہے۔

اسی طرز کی ایک اور ضخیم لغت منشی چرنجی لال کی مخزن المحاورات ہے۔ یہ بھی ۱۸۸۶ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس میں عوام کے ہر طبقے میں رائج تقریباً دس ہزار محاورات و امثال کو شامل کیا گیا ہے اور ایسے محاورات کو بھی جگہ دی گئی ہے جو اس عہد میں غیر مسلم حضرات کے مخصوص معاشرے میں رائج تھے۔ ان سب کی تشریح واضح اور عام فہم انداز میں کی گئی ہے۔ اکثر مقامات پر اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں۔

اس کے بعد ۱۸۸۸ء میں بہارِ ہند حصہ اول مؤلفہ مرزا محمد مرتضیٰ عاشق لکھنوی عرف مرزا مچھو بیگ شائع ہوئی۔ اس کو بھی اردو محاورات کی لغات میں اہم مقام حاصل ہے لیکن یہ صرف الف کی تقطیع تک محدود ہے۔ باقی حصے شائع نہیں ہوئے۔ مؤلف نے محاورات کی جمع و ترتیب میں بڑی محنت سے کام لیا ہے اور ان کی تشریح و توضیح بھی بڑی تفصیل سے کی ہے۔ ہر محاورے کی سند میں شعر بھی نقل کیا ہے۔ اسی سال مطبع احمدی دہلی سے نجم الامثال مؤلفہ نجم الدین شائع ہوئی۔ یہ ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے اور مصطلحات و امثال کی لغات میں اہم مقام رکھتی ہے۔

۱۸۹۰ء میں 'مصطلحات اردو' مؤلفہ اشرف علی لکھنوی شائع ہوئی۔ لیکن کچھ زیادہ جامع نہیں ہے۔ محاورات کی تعداد زیادہ نہیں ہے، نہ ہی معنی اور تشریح میں تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ عبارت کا انداز بھی واضح اور دل نشیں نہیں ہے۔ البتہ معانی کا استناد اشعار سے کیا گیا ہے۔

پروفیسر مسعود حسن رضی اردو کے بلند پایہ ادیب اور محقق تھے۔ آپ نے ''فرہنگ امثال' ترتیب دے کر ایک قابل ستائش کام کیا۔ اس میں فارسی اور عربی کے ان اقوال و اشعار، وغیرہ کو شامل کیا ہے جو کثرت استعمال سے اردو میں ضرب المثل کی حیثیت سے رائج ہو گئے ہیں۔ یہ فرہنگ ۱۹۳۹ء میں شانتی پریس الہ آباد سے شائع ہوئی۔

خواتین کی زبان اور ان کے مخصوص محاورات بھی ہمارے لغات نویسوں کا موضوع رہے ہیں چنانچہ ایسی متعدد لغات ملتی ہیں جو خواتین کے محاورات اور مصطلحات سے مختص ہیں۔ اس سلسلے کی پہلی اہم کوشش 'لغات الخواتین' ہے جسے ۱۹۰۷ء میں سید امجد علی اشہری نے مرتب کیا تھا اس میں خواتین کے الفاظ اور مخصوص محاورات و مصطلحات کے معنیٰ اور محل استعمال دیے گئے ہیں۔ بقول مؤلف:

> ''اردو زبان میں اکثر الفاظ شریف عورتوں کے محاورے اور روز مرہ میں داخل ہیں، وہ عورتوں کے کام آ سکتے ہیں۔ ان زنانہ بول چال کے مخصوص الفاظ کو اس لغت میں جمع کیا ہے تا کہ ناواقف عورتیں ان کے ذریعے سے اپنی بول چال کو خوش نما بنا سکیں۔''

اس موضوع پر دوسری اہم تالیف مولوی سید احمد دہلوی مؤلفِ فرہنگ آصفیہ کی 'لغات النساء' ہے جو پہلی بار ۱۹۱۷ء میں شائع ہوئی۔ اس میں:

> ''دہلی کی بیگموں، قلعۂ معلیٰ کی شہزادیوں، عام شریف خاندانوں، متوسط الناس مستورات، ہندو لیڈیوں، کتب تعلیمات زمانہ کے جدید و قدیم لغات، محاورات، اصطلاحات، خاص خاص رمز و کنایات و ضرب الامثال کا گنجینہ، تاریخی معلومات زبان کا دفینہ، قابل اصلاح زنانہ توہمات و عقاید نسواں کا جُز و کل مجموعہ تعدادا قلم بند چار ہزار اکہتر الفاظ و مصطلحات کا خزانہ و ذخیرہ موجود ہے۔''

اس سلسلے کی ایک اور اہم کڑی منیر لکھنوی کی ''محاورات نسواں و خاص بیگمات کی زبان'' ہے، جو ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ فاضل مؤلف نے اس کی غرض و غایت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

> ''محاوراتِ نسواں خاص بیگمات کی زبان کا جس میں باسناد شعراء ہند و محاورات درج ہیں جو مستورات کی زبان پر بیشتر اور مردوں کی زبان پر کم تر آتے ہیں، ناظرینِ والا تبار کے ملاحظہ میں پیش کر کے عرض پرداز ہوں کہ آپ کی قدر شناسی جس طرح اجازت دے، اسے کام میں لائیے۔''

اردو میں قرآن اور حدیث پر بھی لسانی اعتبار سے کام ہوا ہے اور لغات تیار کی گئی ہیں۔ ان میں لغات القرآن، مرتبہ مولوی محمد خلیل کو تقدم زمانی حاصل ہے۔ یہ ۱۸۹۵ء کی تالیف ہے۔ اس میں الفاظ کی ترتیب عربی قاعدے کے مطابق کی گئی ہے یعنی لفظ کے مادے کو مقدم رکھا گیا ہے اور مشتقاق اس کے ذیل میں درج ہیں۔ اکثر مقامات پر عام قاری کی سہولت کے پیشِ نظر الفاظ کو دو مقامات پر درج کیا ہے۔ ایک تو اپنے ماخذ کے ذیل میں اور دوسرے مشتقہ شکل کے تحت لیکن معنی صرف ماخذ کے ذیل ہی میں دیے گئے ہیں اور دوسرے اندراج میں صرف پہلے اندراج کا حوالہ دیا گیا ہے۔

اس کے بعد لغاتِ قرآن، مؤلفہ شہید الدین احمد منظر عام پر آئی۔ یہ ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی اس میں الفاظ کے صرف معنی ہیں، تشریح قطعاً نہیں ہے۔ اس لیے ایک عام قاری کے لیے اس کے ذریعے قرآن فہمی

ممکن نہیں۔

اس سلسلے کی سب سے اہم، جامع اور تفصیلی لغت مولانا عبدالرشید نعمانی اور مولانا عبدالدائم جلالی کی ''مکمل لغات القرآن' ہے۔ یہ چھ جلدوں میں ہے اور پہلی بار ۱۹۴۳ء میں ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی۔ اس کی ابتدائی تین جلدیں مولانا عبدالرشید نعمانی کی اور بقیہ تین جلدیں مولانا عبدالدائم جلالی کی کاوش کا نتیجہ ہیں اس کے محتویات اور دیگر تفاصیل پر روشنی ڈالتے ہوئے فاضل مؤلف لکھتے ہیں:

> ''تمام الفاظ کی ضروری تشریح اور تفصیل کا پورا اہتمام رکھا گیا ہے۔ کسی لفظ کی تشریح یا اس کے معنیٰ کی تحقیق میں جہاں مفسرین، فقہا اور اہلِ لغت وغیرہ کا اختلاف ہے، اس کو نقل کر کے قولِ فیصل بیان کیا گیا ہے۔ جا بجا تمام وہ مناسب فوائد قلم بند کر دیے گئے ہیں جو فہم قرآن میں سہولت پیدا کر سکیں۔ چونکہ مقصد ہے کہ منشاءِ قرآن کے مطابق قرآن مجید کی لغت تیار ہو، اس لیے محض لغت ہی کے تتبع پر اکتفا نہیں کی بلکہ کوشش کی ہے کہ ہر لفظ کے وہی معنی لکھے جائیں جس معنیٰ میں قرآن مجید نے اس کا استعمال کیا ہے اور جو معنیٰ علماء حق نے اس کے سمجھے ہیں۔''

اسی طرح جو الفاظ قرآن مجید میں متعدد معانی میں استعمال ہوئے ہیں، ان پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ کس موقع پر کون سا لفظ کس معنیٰ میں استعمال ہوا ہے اور اس لفظ کی تفسیر میں کوئی مرفوع حدیث یا کسی صحابی یا تابعی کا قول مل گیا ہے، اسے بھی درج کر دیا ہے۔ اعلام اور اماکنِ قرآنی پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے مقدمے سے پتا چلتا ہے کہ مؤلف نے امام راغب اصفہانی کی تالیف 'مفردات غرائب القرآن' سے خصوصی طور پر استفادہ کیا ہے۔

قرآن کریم کی ایک اور لغت 'مراۃ القرآن فی لغت القرآن' مؤلفہ عبدالحیٔ ہے جو ۱۳۷۲ھ/۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کا مجموعی انداز دیگر لغاتِ قرآن کی مانند ہے، کسی ندرت سے کام نہیں لیا گیا ہے۔ الفاظ کی تشریح نہیں ہے، صرف معنیٰ دیے گئے ہیں کتاب کی ابتدا میں انبیا و رسل کے مختصر حالات اور اس کے بعد

'ارض القرآن' کے عنوان سے قرآن کریم میں مذکور مقامات کی تفصیلات درج ہیں۔

قرآن کریم کی مندرجہ بالا کتبِ لغات کے باوجود قرآن پر لغات کا حق ادا نہیں ہوا ہے۔ اب تک اردو میں کوئی ایسی لغتِ قرآن ترتیب نہیں دی گئی جسے ہم امام راغب اصفہانی کی معرکۃ الآرا تالیف ''مفردات غرائب القران'' کا ہم پلہ قرار دے سکیں یا عربی کے دیگر مؤلفین مثلاً ابن قتیبہ، ابوعمر وزاہد، ابن دُرید اور حبان اندلسی وغیرہم کی تالیفات کا ہمسر بتا سکیں۔ احادیث کی لغت پر علامہ وحید الزماں کیرانوی کی ضخیم تالیف، لغات الحدیث اہم ترین لغت ہے۔ یہ پہلی بار ۱۹۰۶ء/۱۳۲۴ھ تک بنگلور سے 'انوار اللغۃ الملقب وحید اللغات' کے عنوان سے ۲۸ جلدوں میں شائع ہوئی۔ اس کے کچھ حصے اسرار اللغۃ بہ تکمیل وتصحیح و اضافہ انوار اللغۃ' کے عنوان سے بھی شائع ہوئے۔ بعد میں اصح المطابع کراچی سے 'لغات الحدیث' کے نام سے مکمل جلدیں دوبارہ شائع ہوئیں۔ اس میں الفاظ کی ترتیب اور معنیٰ کی نوعیت کی تفصیلات بتاتے ہوئے فاضل مؤلف لکھتے ہیں:

''اس کتاب میں اکثر ہر لغت شروع سطر سے لکھی گئی ہے اور اس پر اعراب بھی دیے گئے ہیں تاکہ کم استعداد لوگوں کو مزید آسانی ہو اور ابواب کی تنقیح اس لیے نہیں کی گئی کہ یہ کتاب عربی دانوں کے لیے نہیں بنائی گئی ہے بلکہ کم استعداد ہندی بھائیوں کے لیے اور اسی لیے ترتیب لغات اس طرح رکھی گئی ہے کہ حرفِ اول کو باب اور ثانی کو فصل مقرر کیا۔''

اس میں احادیث کا انتخاب نہیں کیا گیا ہے، بلکہ تمام احادیث کو شامل کر لیا گیا مؤلف کا بنیادی مقصد اردو داں طبقے کو حدیث کا فہم دلانا تھا، حدیث کی تنقیح یا تحقیق کرنا نہیں، لہٰذا بلاکسی امتیاز کے تمام احادیث کو موضوع بنالیا ہے۔

اردو میں اصطلاح سازی کی طرف بھی خاص توجہ دی گئی ہے۔ اس انداز کی اب تک کئی فرہنگیں شائع ہو چکی ہیں۔ اس سلسلے میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کی کوششیں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ آپ نے مختلف علوم وفنون کی فرہنگیں تیار کرائیں اور انھیں اپنی نگرانی میں انجمن ترقی اردو سے شائع کیا۔ اس ضمن میں پہلی کوشش 'فرہنگِ اصطلاحات پیشہ وراں' مؤلفہ ظفر الرحمن دہلوی ہے۔ اس میں ہندوستان کے

مختلف فنون اور صنعتوں کے اصطلاحی الفاظ و محاورات کی تفاصیل مع تصاویر پیش کی گئی ہیں۔ اس فرہنگ کے سات حصے ہیں۔ ہر حصے میں مختلف فنون کی اصطلاحات درج ہیں۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہیں:

حصہ اول: تیاری مکانات اور تہذیب و آرائش میں عمارات سے متعلق بیس (۲۰) پیشوں کی اصطلاحات۔

حصہ دوم: تیاری لباس اور اس کی تزئین کے ذیل میں ۲۵ پیشوں کی اصطلاحات۔

حصہ سوم: تیاری خوراک اور اس کے لوازم سے متعلق اصطلاحات۔

حصہ چہارم و پنجم: ہندوستان کے مختلف فنون اور صنعتوں کے اصطلاحی الفاظ و محاورات۔

حصہ ششم: کاشتکاری، باغبانی اور آب پاشی کی اصطلاحات۔

حصہ ہفتم: بیوپاری، دستکاری اور تکیہ داری وغیرہ کے تحت ۱۷ پیشوں کی اصطلاحات۔

مؤلف نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اصطلاحات جمع کیں اور شرح و بسط سے ان کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ حسبِ ضرورت تصاویر وغیرہ بنا کر مفہوم کو واضح کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اصطلاحات فن کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہیں۔ اس لیے متن میں ان کو تلاش کرنا دشوار تھا۔ اس اشکال کو دور کرنے کے لیے ہر حصے کے آخر میں تمام اصطلاحات کی ابجدی فہرست دی گئی ہے۔ اس طرح اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

اسی نہج کا دوسرا کام سائنسی موضوعات کی فرہنگیں ہیں جنھیں مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو، نئی دہلی سے ۱۹۳۹ء میں شائع کیا۔ یہ تین حصوں میں ہیں جن کی تفصیلات اس طرح ہیں:

حصہ اول: فرہنگِ اصطلاحاتِ کیمیا۔

حصہ دوم: فرہنگ اصطلاحاتِ معاشیات، تاریخ و سیاسیات اور عمرانیات۔

حصہ سوم: فرہنگ اصطلاحات طبیعیات۔

ان میں انگریزی اصطلاحات کے مترادفات دیے گئے ہیں، تشریح بالکل نہیں ہے۔ اسی طرز پر بعد میں انجمن ترقی اردو کراچی سے 'فرہنگِ اصطلاحاتِ جغرافیہ' مرتبہ ابرار حسین فاروقی شائع ہوئی۔ مجموعی طور پر

یہ فرہنگیں بہت مفید ہیں اور انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے والوں کے لیے بڑی کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔

اسی نوعیت کی ایک ضخیم موضوعی لغت حکیم غلام جیلانی نے ’مخزن الجواہر‘ کے عنوان سے ترتیب دی۔ اسے ۱۹۲۳ء میں مرکنٹائل پریس لاہور نے طبع کر کے شائع کیا۔ یہ طبی علوم سے متعلق ہے اور اس میں:

> ”تقریباً چودہ ہزار عربی و فارسی کی قدیم و جدید اصطلاحات اور تقریباً چھ، سات ہزار ان کی مترادف انگریزی ڈاکٹری اصطلاحات ہیں۔ گویا علم الامراض، علم الجراحت، علم العلاج، علم الادویہ، علم الکیمیا، علم الحیات، علم التشریح اور علم منافع الاعضاء وغیرہ کی کل اکیس ہزار طبی و ڈاکٹری اصطلاحات ہیں اور آخر میں انگریزی و اردو ڈاکٹری لغات ہے۔ نیز اس میں تمام قدیم و جدید عربی طبی مترادف اصطلاحات کو یکجا لکھا گیا ہے اور سینکڑوں مترادف طبی اصطلاحات اور متشابہ امراض کے باہمی فروق بیان کیے ہیں اور طب یونانی و ڈاکٹر کے تقریباً تمام اختلافی مسائل پر تنقیدانہ محاکمہ کیا گیا ہے۔“

علم طب پر یہ اردو میں اب تک سب سے زیادہ ضخیم، جامع اور فائدہ مند لغت ہے۔

حیدرآباد (دکن) میں بھی اس نہج پر کام ہوا اور جامعہ عثمانیہ کے سررشتہ تالیف و ترجمہ کی کاوش سے ۱۹۴۸ء میں ’مصطلحات طب‘ کی پہلی جلد شائع ہوئی۔ اس میں انگریزی مصطلحات کے اردو مترادفات دیے گئے ہیں؛ تشریح بالکل نہیں ہے۔ یہ دراصل ڈارلینڈ اسٹیڈمین و گولڈ کی طب سے متعلق انگریزی ڈکشنری پر مبنی ہے۔

موجودہ دور میں حکومتِ ہند کا قائم کردہ ادارہ ”ترقی اردو بیورو“ نئی دہلی بھی قابلِ ستائش خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس کے دائرۂ کار کا اندازہ مندرجہ ذیل عبارت سے لگایا جا سکتا ہے جو اس کی مطبوعات پر پیش لفظ میں لکھی رہتی ہے:

”کسی بھی زبان کی ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس میں مختلف سائنسی، علمی اور ادبی کتابیں لکھی

جائیں اور دوسری زبانوں کے اہم ترجمے شائع کیے جائیں۔ یہ نہ صرف زبان کی ترقی کے لیے بلکہ قوموں کی معاشی اور سماجی ترقی کے لیے بھی ضروری ہے۔ اردو میں اسکولوں اور کالجوں کی نصابی کتابوں، بچوں کے ادب، لغات اور سائنسی کتابوں کی ہمیشہ کمی محسوس کی جاتی رہی ہے۔ حکومتِ ہند نے اس کمی کو دور کرنے اور اردو کو فروغ دینے کے لیے ترقی اردو بورڈ قائم کر کے اعلیٰ پیمانے پر معیاری کتابوں کی اشاعت کا ایک جامع پروگرام مرتب کیا ہے جس کے تحت مختلف سائنسی و سماجی علوم کی کتابوں کے ترجمے اور اشاعت کے ساتھ لغات، انسائیکلوپیڈیا، اصطلاحات سازی اور بنیادی متن کی تحقیق و تیاری کا کام ہو رہا ہے۔"

اس اسکیم کے تحت اب تک سیکڑوں کتابیں مختلف موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں جن میں تصنیفات، تالیفات اور تراجم بھی شامل ہیں۔ بورڈ کے زیر اہتمام مختلف موضوعات سے متعلق اصطلاح کی بیس (۲۰) کمیٹیاں قائم ہیں جن میں متعلقہ موضوع کے ماہرین شامل ہیں۔ ان کمیٹیوں کی سفارشات کی روشنی میں اب تک فلسفہ، نفسیات، تعلیم، لسانیات، معاشیات، انسانیات اور تاریخ و سیاسیات سے متعلق اصطلاحیں مکمل ہو چکی ہیں اور سائیکلو اسٹائل شکل میں شائع ہو چکی ہیں۔

ادھر گزشتہ ربع صدی سے کلاسیکی ادب کی تدوین و ترتیب کا یہ خوش آئند انداز دیکھنے میں آ رہا ہے کہ متن کے ساتھ اس میں مستعمل غیر مانوس اور غریب الفاظ کے معنیٰ بھی دے دیے جاتے ہیں۔ اس کے دو طریقے رائج ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر صفحے پر حواشی کے طور پر اور دوسرے کتاب کے آخر میں فرہنگ کے انداز میں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ولی دکنی، محمد قلی قطب شاہ، ابن نشاطی، غواصی، میر حسن، میر تقی میر، دیا شنکر نسیم، شوق لکھنوی، میر امن دہلوی، رجب علی بیگ سرور اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کی تصانیف کی جدید اشاعتوں میں فرہنگیں بھی شامل ہیں۔ یہ فرہنگیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کا مقصد متن کے معانی و مطالب کی تفہیم میں مدد دینا ہوتا ہے۔ اسی طرح ترقی اردو بیورو کی مطبوعات میں اردو سے انگریزی اور انگریزی سے اردو فرہنگیں شامل ہوتی ہیں۔ یہ انگریزی سے اردو ترجمہ کرنے والے حضرات کے لیے بڑی مفید ہوتی ہیں۔

یورپی ادبیات کی طرح اردو میں بھی اب ادبی شخصیات پر فرہنگیں تیار کی جانے لگی ہیں۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ ان میں اب تک غالبؔ، انیسؔ، داغؔ اور اقبال پر فرہنگیں ترتیب دی جا چکی ہیں۔ مولانا

امتیاز علی خاں عرشی نے 'فرہنگِ غالب' ترتیب دے کر اس میدان میں اولیت کا شرف حاصل کیا۔ لیکن یہ صرف غالب کے فارسی کلام تک محدود ہے۔ اردو کلام کو اس میں شامل نہیں کیا گیا۔[۲۰] غالباً اس لیے کہ غالب کے اردو کلام کی متعدد شرحیں مل جاتی ہیں۔ غالب کے اوپر دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی جانب سے بھی کام ہوا ہے۔ یہاں سے ۱۹۶۹ء میں غالب صدی تقریبات کے سلسلے میں اشاریہ کلام غالب، شائع ہوا جس میں غالب کے مخصوص محاورات اور تراکیب کی فہرست پیش کی گئی ہے، ان کے معنیٰ اور تشریح نہیں ہے۔ اس طرح یہ کام تشنہ ہے اور قاری کی کسی طرح بھی رہنمائی نہیں کرتا۔ اسی سال 'اردو محاورہ غالب' مرتبہ پریم پال اشک شائع ہوئی۔ اس میں بقول مؤلف:

> ''یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ غالب اگرچہ خود کو فارسی گو کہتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اشعار اور فقرات میں روزمرہ کا کس خوبی سے استعمال کرتے ہیں اور جملے و شعر کی ساخت میں آپ محاورات کو کتنی اہمیت دیتے اور انھیں کتنا مقدم تصور کرتے ہیں کہ ہر فقرہ اور شعر خود اپنی زبان سے دادا طلب کرتا نظر آتا ہے۔''

اس میں غالب کی نظم و نثر میں مستعمل روزمرہ و محاورات کے معنیٰ کے ساتھ محلِ استعمال کے طور پر حسب موقع غالب کے اشعار و فقرات کو بطور سند پیش کیا گیا ہے۔

غالب کے علاوہ داغ دہلوی ایسے خوش نصیب شاعر ہیں جن پر ہمارے فرہنگ نویسوں کی نگاہِ التفات گئی ہے۔ جناب ولی احمد خاں نے 'محاوراتِ داغ' ترتیب دے کر ایک قابلِ ستائش اور قابلِ تقلید کام کیا ہے۔ اس میں انھوں نے داغ کے مخصوص محاورے اور ان کے معنی دیے ہیں اور اس شعر کو بھی نقل کیا ہے جس میں وہ محاورہ استعمال ہوا ہے۔ اس سے داغ کے کلام کی تفہیم میں بڑی مدد ملتی ہے۔

علامہ اقبال پر سید عابد علی عابد اور اکبر حسین قریشی نے کام کیے ہیں۔ عابد علی عابد نے 'تلمیحاتِ اقبال' مرتب کی اور اکبر حسین قریشی نے 'تلمیحات و محاورات اقبال' تالیف کی۔ یہ دراصل ڈاکٹر قریشی کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے انھیں ڈاکٹر آف فلاسفی کی سند عطا کی۔

میر انیس پر نائب حسین نقوی مرحوم نے کام کیا۔ انھوں نے ’فرہنگ انیس‘ ترتیب دی۔ یہ دو جلدوں میں ہے۔ اس کی پہلی جلد ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی اور دوسری ۱۹۸۳ء میں۔ کام بڑی محنت سے کیا گیا ہے البتہ کہیں کہیں اصلاح و اضافے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ان فرہنگوں کی مدد سے غالب، داغ، اقبال اور انیس کے کلام کو سمجھنے میں بڑی حد تک آسانی ہوگئی ہے۔

لیکن ان تمام کتب لغات اور فرہنگوں کے باوجود اردو میں ایسی لغت کی کمی اب بھی محسوس ہوتی ہے جو تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے اور بالخصوص کلاسیکی ادب کی تفہیم میں ہماری معاونت کرے۔ شاید اس کمی کو انجمن ترقی اردو پاکستان کی مجوزہ ’لغت کبیر‘ پورا کر سکے جس کے ابھی تک صرف دو حصے شائع ہو سکے ہیں۔ ان میں صرف الف ممدودہ سے شروع ہونے والے الفاظ کا احاطہ ممکن ہو سکا ہے[۲۱]۔

(مشمولہ ”غالب نامہ“ غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی، جنوری ۱۹۸۸ء جلد ۹، شمارہ ۱۰)

☆☆☆☆

حواشی:

(۱) مقدمہ جدید اردو لغت، اردو (سہ ماہی) جنوری ۱۹۵۹ء۔ ص ۳۲ (انصاری)

(۲) مقدمہ فرہنگ نظام۔ جلد اول۔ ص ۱۴۔۱۵ (انصاری)

(۳) مقدمہ فرہنگ نظام۔ جلد اول۔ ص ۱۵ (انصاری)

(۴) مقدمہ فرہنگ نظام۔ جلد اول۔ ص ۱۵ (انصاری)

(۵) ہندوستان کا قدیم ترین فارسی لغت از نذیر احمد (فکر و نظر سہ ماہی) علی گڑھ، جولائی ۱۹۶۵ء۔ ص ۱۷) یہ لغت پروفیسر نذیر احمد کے اعتنا سے ادارہ ترجمہ و شرح کتاب تہران سے ۱۹۷۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ (انصاری)

(۶) پروفیسر نذیر احمد نے ”نقد قاطع برہان“ میں غالب کے اعتراضات کا نئے انداز سے مطالعہ کیا ہے، یہ

کتاب غالب انسٹیٹیوٹ نئی دہلی سے ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی ہے۔ (انصاری)

(۷) اس ضمن میں ایک نہایت مفید مضمون پروفیسر شیرانی نے رسالہ مخزن ۱۹۲۹ء میں شائع کیا تھا جو ان کے مجموعۂ مضامین میں شامل ہے، اس کے بعد ایک مقالہ مولانا امتیاز علی عرشی کا نکلا، ۱۹۶۷ء میں پروفیسر نذیر احمد نے ایک ناقدانہ مقالہ معارف میں اسی موضوع پر شائع کیا ہے۔ (انصاری)

(۸) یہ پروفیسر شیرانی کی تحقیق ہے لیکن ابھی اس کو آخری درجے کی تحقیق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (انصاری)

(۹) مقدمہ جدید اردو لغت، اردو سہ ماہی، کراچی، اپریل ۱۹۵۹ء، ص ۱۹ (انصاری)

(۱۰) مقدمہ نوادر الالفاظ۔ ص ۴ (انصاری)

(۱۱) مقدمہ نوادر الالفاظ۔ ص ۵ (انصاری)

(۱۲) دیباچہ نوادر الالفاظ۔ ص ۳ (انصاری)

(۱۳) مقدمہ جدید اردو لغت (اردو سہ ماہی، کراچی، جنوری ۱۹۵۹ء، ص ۲۱ (انصاری)

(۱۴) مقدمہ جدید اردو لغت: اردو (سہ ماہی) کراچی، جنوری، ۱۹۵۹ء، ص ۲۵۔ قاضی عبدالودود نے اس فرہنگ کی بعض بنیادی اسقام کی طرف اپنے ایک مضمون میں اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعض مندرجات پر سیاسی حلقوں میں اعتراض کیا گیا ہے۔ (انصاری)

(۱۵) دہلی سے یہ ایڈیشن ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا (مرتب)

(۱۶) انصاری صاحب کی اس بات پر صرف حیرت ہی کا اظہار کیا جا سکتا ہے کیونکہ نور اللغات میں ہزار ہا اشعار سند کے طور پر دیے گئے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ ہر لفظ کی سند نہیں دی، سو وہ فرہنگِ آصفیہ نے بھی نہیں دی۔ بلکہ اردو لغت بورڈ کی عظیم و ضخیم لغت، جس کے بنیادی اصولوں میں شامل تھا کہ ہر لفظ کی سند دی جائے گی، نے بھی مجبوراً کہیں کہیں اس اصول سے روگردانی کی ہے (مرتب)

(۱۷) یہ بات درست نہیں ہے۔ مہذب اللغات چودہ (۱۴) جلدوں میں ہے۔ چودھویں جلد ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئی اور اس طرح حرف ''ی'' تک کے الفاظ اس میں آ گئے۔ گویا یہ مکمل ہے (مرتب)

(۱۸) اردو لغت بورڈ کی لغت کی ۲۲ جلدوں کی اشاعت کے بعد اب مہذب کو یہ اعزاز حاصل نہیں رہا۔ ویسے

بھی مہذب کے کل صفحات کی تعداد سات آٹھ ہزار کے لگ بھگ ہوگی جب کہ بورڈ لغت کے تقریباً بیس ہزار صفحات ہیں۔ تعدادِ الفاظ، معنی کی شقوں اور اسناد کی تعداد کے لحاظ سے بھی بورڈ کی لغت اردو کی ضخیم ترین اور بسیط ترین لغت ہے (مرتب)

(۱۹) مخزنِ فوائد کے سنِ اشاعت کے بارے میں یہ غلط فہمی عام ہے اور اس کی بنیاد مولوی عبدالحق کا لغت پر معروف مضمون ہے جس میں انھوں نے اس کا سالِ تالیف ۱۸۸۶ء لکھا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ مخزنِ فوائد ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں تالیف ہوئی اور اس کی اشاعت ۱۸۴۷ء میں عمل میں آئی (مرتب)

(۲۰) عرشی کی ''فرہنگ غالب'' کے بارے میں یہ غلط فہمی عام ہے۔ حالانکہ یہ غالب کے کلام کی فرہنگ نہیں ہے بلکہ اس میں انھوں نے غالب کے اپنے الفاظ میں فارسی، عربی، ترکی اور اردو الفاظ کی تشریح اور تحقیق کو جمع کر کے پیش کیا ہے۔ (مرتب)

(۲۱) ''لغتِ کبیر'' مولوی عبدالحق کی مرتبہ لغت ہے لیکن وہ اس کی تکمیل سے قبل ہی راہی ملک عدم ہو گئے۔ (مرتب)

☆☆☆☆

رشید حسن خاں

املا کا اختلاف اور لغت

بہت سے لفظ مطبوعہ یا خطی کتابوں میں معمولی یا غیر معمولی اختلافِ املا کے ساتھ ملتے ہیں۔ بعض صورتوں میں یہ اختلاف محض ناقل یا کاتب کی کارگزاری کا کرشمہ ہوتا ہے، مصنف سے اس کو تعلق نہیں ہوتا اور نہ ان لفظوں میں حقیقتاً وہ اختلافِ املا ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ایسے مقامات پر جب تک اس کا یقین نہ کر لیا جائے کہ کسی لفظ کی فی الواقع دو صورتیں ہیں، اس اختلافِ املا کو قبول نہیں کیا جانا چاہیے۔ نیز جب تک صحیح طور پر اس کا تعین نہ ہو جائے کہ کسی لفظ کی کوئی خاص صورت واقعتاً مصنف کی اختیار کی ہوئی ہے، اس وقت تک اس صورت کو اس مصنف سے منسوب نہیں کیا جانا چاہیے۔

آج کل یہ رجحان بڑھ رہا ہے کہ مخطوطات میں لکھے ہوئے الفاظ کے املا سے مصنف کے عہد کی زبان، بلکہ خود مصنف کے مختارات پر استدلال کیا جاتا ہے جب کہ اکثر صورتوں میں یہ صحیح نہیں ہوتا۔ نہ ان مخطوطات کا زمانۂ کتابت متعین ہوتا ہے، نہ کاتب کی شخصیت اور اہلیت کا علم ہوتا ہے، اور اگر یہ سب ہو بھی، تو اس کا علم نہیں ہوتا کہ کیا یہ مصنف کا اپنا املا تھا، اور اس طرح بہت سی

غیر مستند باتیں معرضِ اظہار میں آ جاتی ہیں، اور ان امور کا انتساب مصنفین سے روا رکھا جاتا ہے جن کے متعلق یہ بالکل علم نہیں ہوتا کہ ان مصنفین کو ان امور سے واقعتاً کسی نوع کا تعلق بھی تھا، اور اس طرح غلط فہمی کا سلسلہ دراز تر ہو جاتا ہے، اور (مثلاً) سو برس بعد کے کسی کاتب یا کمپوزیٹر کی کارگزاری اس سے سو برس پہلے کے مصنف سے منسوب ہو کر تقدمِ زمانی حاصل کر لیتی ہے۔

بہت سے قدیم مخطوطوں کی یہ صورت ہے کہ مخطوطے کا کاتب بہت خوش خط ہے لیکن غلط نویس بھی ہے اور وہ الفاظ کو عجیب عجیب لے طرح لکھ جاتا ہے مثلاً کربل کتھا کا واحد مخطوطہ جو ذخیرۂ اشپرنگر (ٹیوبن گن۔ جرمنی) میں محفوظ ہے، اس کی عمدہ مثال ہے۔ اس مخطوطے کا عکس میرے سامنے ہے، کاتب کا خط پختہ اور واضح ہے، لیکن اس میں مندرجۂ ذیل الفاظ کا یہ املا ملتا ہے:

کتاب خانی (کتاب خوانی)، ثات (سات)، خانہ دان (خاندان)، مشیں (مسیں)، ڈھارث (ڈھارس)، سکہینہ (سکینہ)، اثی (اسی)، توباہ (توبہ)، پیٹ تا (پیٹتا)، ھیہاتہ (ھیہات)، خواوند (خاوند)، اسطلا حات (اصطلا حات)، یہی صورت بہت سی مطبوعہ کتابوں کی ہے کہ ان میں کچھ لفظ کاتب یا کمپیوٹر کی استعداد یا اس کی پسندیدہ روایت کے مطابق صورت پذیر ہوئے ہیں، نہ ان کو مصنف سے واسطہ ہے نہ صحتِ املا سے ربط ہے اور نہ حقیقی اختلافِ املا سے ان کو تعلق ہے۔ اب اگر ایسے الفاظ کے املا کو مطلقاً قبول کر لیا جائے اور ان کو لغت میں اختلافِ املا کے ذیل میں بطور سند پیش کیا جائے اور اس اختلاف کی بنا پر ان لفظوں کی دو یا اس سے زیادہ مستقل شکلیں تسلیم کر لی جائیں، تو یہ طرزِ عمل کم احتیاطی سے قریں ہوگا اور صحت سے دور۔

متن کی ترتیب کا یہ عام طریقۂ کار ہے کہ مختلف نسخوں کے اختلافِ املا کو بھی ذیلی حواشی میں ظاہر کر دیا جاتا ہے۔ یہ اظہار، لازماً اس پر مبنی نہیں ہوتا کہ وہ ساری صورتیں صحیح بھی ہیں۔ یہ عمل محض اختلافِ نسخ کے اظہار کا معمولی طریقۂ کار ہوتا ہے۔ متن میں الفاظ کی صورت نویسی ترتیبِ متن کے مقررہ اصولوں کے تحت عمل میں آتی ہے۔ ضبطِ اختلاف کے ذیل میں کاتبوں کی غلط نویسی سے لے کر واقعی اختلافاتِ املا تک کی سب یا اکثر صورتیں آ جاتی ہیں، لیکن اس سے یہ غلط فہمی کسی کو نہیں

ہوتی کہ وہ سب صورتیں اس لفظ کی واقعی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔

لیکن لغت کی نوعیت اس سے جداگانہ ہے۔ لغت میں بھی سند کے اشعار یا جملے، مختلف خطی اور مطبوعہ کتابوں سے منقول ہوتے ہیں، لیکن اس میں املا کی یہ رنگارنگی جگہ نہیں پا سکتی۔ اس میں صرف ان صورتوں کو جگہ ملنی چاہیے جن کا وجود متحقق ہو، اور اگر کسی مصنف سے اس اختلاف کو منسوب کیا جائے تو اس کے لیے یہ لازم ہوگا کہ قطعیت کے ساتھ اس لفظ کی وہ مختلف صورت اس مصنف کی اختیار کردہ ثابت ہو چکی ہو۔ اس کے بغیر، اس اختلافِ املا کو اس مصنف سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ مختلف کاتبوں، ناقدوں اور کمپوزیٹروں نے کم سوادی، لاعلمی یا کسی غلط روش کی پیروی کے طور پر، اگر کسی لفظ کو مسلمہ صورت سے ہٹ کر کسی اور طرح لکھ دیا ہے تو وہ اختلافِ لغت کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوگا۔

اثباتِ مدعا کے لیے ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں:

اردو نامہ شمارہ ۲۷ کے حصۂ لغت میں لفظ ''اچنبھا'' کی ایک صورت ''اچھنبا'' بھی درج ہے اور اس کو ''اچنبھا'' کی قدیم صورت بتایا گیا ہے اور من جملہ تین مثالوں کے ایک مثال میر امن کی کتاب گنجِ خوبی سے پیش کی گئی ہے: ''اس کے کنگورے کے اونچے ہونے کا اچھنبا نہیں۔''

اب تک کی معلومات کے مطابق گنجِ خوبی، اردو رسم خط میں پہلی بار ۱۸۴۶ء میں مطبع احمدی کلکتہ میں ٹائپ میں چھپی تھی۔ یہ ایڈیشن میرے سامنے ہے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے ذخیرۂ Cordington میں اس کا وہ مخطوطہ محفوظ ہے جو میر امن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے [۲] اس مخطوطے کا عکس بھی پیشِ نظر ہے، ان دونوں قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں اس مقام پر ''اچنبھا'' ہے نہ کہ ''اچھنبا'' یہی نہیں، اس کتاب میں بعض اور مقامات پر بھی یہ لفظ ملتا ہے، مثلاً: ''اے یارو اچنبھا نہ کرو''۔ (نسخہ مطبوعہ ص ۱۴۶) یہاں بھی اس کا یہی املا ہے۔ میرے علم میں اس کا ایک اور مطبوعہ نسخہ ہے جو ۱۸۷۵ء میں بمبئی مطبع محبوب ہر دیار میں چھپا تھا، لیکن یہ میری نظر سے نہیں گزرا، میں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اردو نامے میں جو عبارت نقل کی گئی ہے، وہ اسی نسخۂ بمبئی پر مبنی ہوگی۔ اب اگر

۱۸۷۵ء کے اس نسخے میں کوئی لفظ کسی خاص طرح چھپا ہوا ہے تو وہ اس مصنف کا یا اس کے عہد کا املا کیسے ہو سکتا ہے؟ اس لغت نامے کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ مثال کے ساتھ ساتھ مصنف یا تصنیف کا زمانہ بھی لکھ دیا جاتا ہے۔ گنج خوبی کی اس مثال کے ذیل میں اس کتاب کا سالِ تصنیف ۱۸۰۲ء لکھا ہوا ہے۔ اس کا واضح طور سے مطلب یہ ہوا کہ ۱۸۰۲ء میں اس لفظ کا یہ املا بھی مستعمل تھا اور میر امن نے یہ املا لکھا ہے، جب کہ صورت حال اس سے مختلف ہے۔

دوسری مثال میر سوز کے ایک خطی دیوان سے پیش کی گئی ہے، دیوان میر سوز کے دو مخطوطے میں نے دیکھے ہیں اور ان دونوں میں اس لفظ کا وہ املا نہیں، جس کی سند میں اس شعر کو پیش کیا گیا ہے۔ کلامِ سوز کے پندرہ بیس مخطوطے ادھر اُدھر سے جمع کیے جا سکتے ہیں اور بہت سے لفظ ان میں الگ الگ انداز سے مل سکتے ہیں، ایک ایک لفظ، دو دو تین تین طرح لکھا ہوا مل جائے گا۔ واضح تعینات کے بغیر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ خود سوز نے کس لفظ کا املا کیا لکھا تھا۔ اگر دیوانِ میر سوز کے کسی مخطوطے میں ''اچھما'' لکھا ہوا ہے اور کسی میں ''اچنبھا'' اور تیسرے میں ''اچمبھا'' تو اس صورت میں یہ کیسے طے ہوگا کہ میر سوز کا پسندیدہ املا کیا تھا۔ تیسری مثال قطب مشتری سے پیش کی گئی ہے۔ میں اس کے متعلق فی الوقت کوئی رائے نہیں دے سکتا، ہاں یہ کہوں گا کہ قطب مشتری کا متن جن دو نسخوں پر مبنی ہے، ان میں سے کسی نسخے کے متعلق، مرتب نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کس عہد کا لکھا ہوا ہے؟ اس صورت میں کسی لفظ کے املا کا انتساب مصنف سے نہیں کیا جا سکتا، نہ اس کے عہد سے۔ اس سلسلے میں مرتب قطب مشتری کی یہ عبارت بھی قابل توجہ ہے:

> ''ایک دوسری خصوصیت میرے نسخے کی یہ ہے کہ اس کا رسم خط عجیب قسم کا ہے۔ خط نسخ ہے، لیکن الفاظ میں اکثر حروفِ علت کا کام اعراب سے لیا ہے، خصوصاً ان حروفِ علت کے لیے جو لفظ کے آخر میں آتے ہیں، مثلاً اس مصرع کو: ''جو بے ربط بولے تو بیتاں پچیس'' یوں لکھا ہے: جو ب ربط بولِ توں بیتاں پچیس'' (مقدمہ ص ۱۹)

اب اگر اصل کی رعایت ملحوظ ہو تو بے ربط کو ''ب ربط'' لکھا جانا چاہیے اور کیا اس بنا پر کہ ایک مخطوطے میں ''ب ربط'' اور ''بولِ'' لکھا ہوا ہے، ان لفظوں کا یہ املا، اختلافِ املا کے ذیل میں قبول کر کے، لغت میں اس اختلاف کا اظہار کیا جا سکتا ہے؟

ہمارے یہاں صحتِ املا پر بہت کم گفتگو کی گئی ہے اور یکسانیٔ املا کی ضرورت پر غور ہی نہیں کیا گیا۔ بہت سے لفظ ایسے ہیں کہ ان میں املا کا اختلاف محض شخصی پسند و ناپسند یا لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ خوش نویسی کے اساتذہ اور ان کے تلامذہ کی دنیا ہی الگ تھی۔ ان کے یہاں بنیادی حیثیت اصولِ خوش نویسی کی تھی۔

یہ اپنے اصولوں کے مطابق حرفوں کے جوڑ، دائروں کی کشش اور ان کی نوک پلک پر نظر رکھتے تھے، باقی ساری حیثیتیں ثانوی تھیں، خوش نمائی اور حسن کو برقرار رکھنا اصل مدعا ہوتا تھا، خواہ اس میں بعض حرفوں کے جوڑ تحلیل ہو جائیں یا نقطے اور مرکز غائب ہو جائیں یا ان کی جگہ بدل جائے۔ خوش نویسی ایک فنِ شریف تھا، جس کا سیکھنا اور اس میں امتیاز پیدا کرنا، اس عہد میں من جملۂ عناصرِ تہذیب تھا۔ توجہ کی جاتی تھی حروف کی صورت کشی پر، لفظوں کی نشست پر اور عبارت کی مجموعی ہیئت پر، یہاں تک بھی غنیمت تھا، لیکن پڑھے لکھے یا نسبتاً پڑھے لکھے لوگوں کے علاوہ جب یہ منصب مل جاتا تھا کم سواد حضرات کو تو پھر غلط نویسی کی کوئی حد نہیں رہتی تھی، اور اس صنعتِ غلط نگاری میں جس قدر کمالات کا مظاہرہ کیا جا سکتا ہے، کبھی کبھی سب کا حق ادا ہو جایا کرتا تھا۔ پھر بات یہیں تک محدود نہیں، بہت سے مخطوطے ایسے ہیں جن کی کتابت ان لوگوں نے کی ہے جو کم سواد بھی تھے اور اس فنِ شریف سے بیگانہ بھی، ان کی کرشمہ کاریاں دیدنی ہیں ؎ کریلا اور نیم چڑھا۔ ایسی صورت میں کسی لفظ میں واقعی اختلافِ املا کا تعین، خاصی بحث و نظر کا متقاضی ہے اور ہر قلمی اور مطبوعہ کتاب کا املا، اختلاف کے ذیل میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔

اگر مصنف کسی اور علاقے کا ہے اور کاتب کسی اور علاقے کا ہے، اور یہ دونوں علاقے لسانی اعتبار سے مختلف خصوصیات کے حامل ہیں، اس صورت میں بعض الفاظ کے املا میں کاتب کی

معصومیت کے علاوہ، بعض علاقائی اثرات کی کارفرمائی بھی ہو سکتی ہے، مثلاً جن علاقوں میں حروف علت کو ساقط کر دینے اور حرفوں کو مشدد بولنے کا رجحان قوی ہے، ان علاقوں کے کاتب صاحبان کے لکھے ہوئے بعض مخطوطوں میں اس رجحان کی جلوہ گری بھی نظر آ سکتی ہے۔

اہم مطبوعہ کتابوں کے نسخے جو مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہوں، اگر دستیاب ہو جائیں، تو مقابلہ کرنے پر معلوم ہوگا کہ بہت سے مقامات پر مطبوعہ کتاب میں جو املا اختیار کیا گیا ہے، اس کو مصنف کے املا سے تعلق نہیں، اس کا تعلق محض کاتب یا تصحیح کرنے والے کے اپنے املا سے ہے، یا اگر وہ کتاب ٹائپ میں چھپی ہے تو اس کا انحصار کمپوزیٹر اور مصحح کی صوابدید پر منحصر ہے اور اس کی سب سے اچھی مثال یہی کتاب 'گنج خوبی' ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے اس کا خطی نسخہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا موجود ہے۔ یہ کتاب معرضِ وجود میں آنے کے تقریباً ۴۲، ۴۳، ۴۴ برس بعد ٹائپ میں چھپی تھی۔ ان دونوں نسخوں کو آمنے سامنے رکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے لفظ مطبوعہ نسخے میں جس صورت میں نظر آتے ہیں، مخطوطے میں وہ اس سے مختلف صورت میں محفوظ ہیں۔ اس صورت میں اگر مطبوعہ نسخے کے ایسے الفاظ کے املا کو مصنف سے منسوب کر کے، ان الفاظ کو اختلافِ املا کی بحث میں پیش کیا جائے تو کیونکر درست ہوگا۔ ذیل میں اس کتاب کے ایسے کچھ لفظ بہ طرزِ مثال پیش کیے جاتے ہیں۔ اس مختصر فہرست میں دو طرح کے لفظ شامل ہیں:

(۱) ایسے لفظ جن کا املا مطبوعہ نسخے میں، مروجۂ حال املا سے مختلف نظر آتا ہے اور اس لحاظ سے ان کو اختلافِ املا کی فہرست میں شامل ہونا چاہیے، لیکن مخطوطے میں ان کا وہی املا ہے جو آج کل رائج ہے۔ (۲) ایسے لفظ جو مطبوعہ نسخے میں اسی طرح چھپے ہوئے ہیں جس طرح وہ آج کل رائج ہیں لیکن مخطوطے میں ان کی صورت، مروجہ حال صورت سے مختلف ہے اور یہ صورت واقعتاً اختلافِ املا کے ذیل میں آ سکتی ہے:

گنج خوبی نسخہ مطبوعہ ۱۸۴۶ء	گنج خوبی مخطوطہ ۱۸۰۴ء
جستجو (ص ۱۷۱)	جست جو

سامنے (ص ۱۲)	سامھنے (مخطوطے میں اس لفظ کا ہر جگہ یہی املا ملتا ہے)
گنج خوبی نسخہ مطبوعہ ۱۸۴۶ء	گنج خوبی نسخہ مطبوعہ ۱۸۰۴ء
دونوں (ص ۲۹)	دونو (بغیر نون) (مخطوطے میں اس لفظ کا ہر جگہ یہی املا ملتا ہے)
شان گمان (ص ۳۶)	سان گمان
ڈبرا (ص ۳۸)	ڈبرا
بھینچے (مع نون) ص ۴۹)	بھچے (بغیر نون)
بینچو (مع زن) (ص ۶۵)	بیچو (بغیر نون)
بیٹھایا (ص ۱۲۸)	بٹھایا
پروا (ص ۲۶۱)	پرواہ (ہر جگہ اسی طرح ہے)
بے پروائی (ص ۴۰۷)	بے پرواہی (ہر جگہ اسی طرح ہے)
قضاق (ص ۳۳۳)	قزاک
بھوکھ (ص ۳۵۷)	بھوک
وتناہی (ص ۳۵۰)	اتناہی
تماش بینوں (ص ۲۵۸)	تماشہ بینوں
خاطر جمی (ص ۲۶۲)	خاطر جمع
جھونپڑی (مع نون) (ص ۲۸۳)	جھوپڑی (بغیر نون)

اصولاً لغت کو مستند ترین ذریعہ ہونا چاہیے، الفاظ کے املے کے سلسلے میں بھی، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اردو کی اہم لغات اس سلسلے میں ہماری کم سے کم مدد کرتی ہیں۔ ان میں مرتبین کی توجہ مبذول رہی ہے الفاظ کے معانی و مفاہیم، ان کے محل استعمال اور ان کی اسناد فراہم کرنے پر، یہی

وجہ ہے کہ ایک ہی لغت میں ایک ہی لفظ ایک جگہ ایک انداز سے لکھا ہوا مل جائے گا اور دوسری جگہ دوسرے انداز سے، اس میں ایسے لفظ بھی ملیں گے جن کے معانی مرتب کے متعین کیے ہوئے ہوں گے اور ان کا املا کاتب صاحب کی پسندیدگی کا آئینہ دار ہوگا، اور اگر ایک لغت کی کتابت مختلف کاتب صاحبان کی ہے تو عین ممکن ہے کہ ایک ہی لفظ کی ایک سے زیادہ صورتیں مل جائیں۔ ہمارے یہاں بحثیں ہوئی ہیں رسم خط پر، صحتِ املا کا مسئلہ معرضِ گفتگو میں کم سے کم آسکا۔ ٹائپ میں بھی یہی صورت حال ملتی ہے کہ کمپوزیٹر کم سواد، اور تصحیح کرنے والے حضرات ان کے حریف یا ان سے بھی گئے گزرے۔ ابھی تک ہمارے پاس کوئی ایسی مستند کتاب بھی نہیں جو اس سلسلے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہو، ان سب پر ستم یہ ہے کہ بہت سے لفظ ہنوز اربابِ نظر کی بحث و فکر کے منتظر ہیں اور تعین سے معرّیٰ۔

اس مرحلے پر یہ بے حد ضروری ہے کہ قدیم و جدید الفاظ کے املا کے تعین میں کچھ واضح اصولوں کو پیشِ نظر رکھا جائے۔ چھپی ہوئی یا خطی کتابوں میں الفاظ کی جو صورتیں ملتی ہیں، ان میں حقیقی اور غیر حقیقی اختلافِ املا کا تعین کیا جائے اور اس کا فیصلہ کیا جائے کہ لغت کے نقطۂ نظر سے کس قسم کا اختلافِ املا قابلِ قبول ہوسکتا ہے اور اس کا انتساب کس سے کیا جائے گا۔ کیونکہ اب اگر یہ کام نہ ہوسکا اور ہماری یہ جدید لغت بھی، اس سے پہلے کی لغات کی طرح عدم تعین املا کا گنجینہ بن گئی، تو پھر کبھی اصلاح نہیں ہوسکے گی۔ اس ضمن میں مثالاً چند امور پیش کیے جاتے ہیں، ان کو وسعت دے کر، ایک واضح طریقۂ کار متعین کیا جاسکتا ہے:

مخطوطات میں کچھ الفاظ کا وہ املا ملتا ہے جس کو اختلاف کے بجائے غلط نگاری کہنا چاہیے اس غلط نگاری کی شکار عام کتاب ہی نہیں بعض اچھے خاصے مصنف بھی ہوئے ہیں۔ ان میں کہیں تو لغزشِ قلم کو دخل ہے، کہیں بے توجہی کو اور کبھی ناواقفیت کو۔ ایسے الفاظ کی ان صورتوں کو اختلافِ املا کے ذیل میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔ مثلاً میر امن کے لکھے ہوئے اسی مخطوطۂ گنج خوبی کے ان الفاظ کو دیکھیے:

ایذا، پرشش، اللہ واکبر، ذکات، سرکا، تپش، سوانحہ، رزالت۔

ظاہر ہے کہ ان الفاظ میں اختلافِ املا نہیں، یا تو لغزشِ قلم ہے یا غلط فہمی۔ وعلیٰ ہٰذا القیاس۔ یہ اختلاف متن کے مرتب کے لیے اہم ہے، وہ اس کو حاشیے میں ظاہر کرے گا، لیکن لغت کے لیے یہ قابلِ قبول نہیں، نہ قابلِ ذکر ہے، کیونکہ ایسے مقامات پر لفظ کی صورت میں حقیقی تغیر راہ نہیں پاتا اور اس کی ایک مستقل صورت کی تشکیل نہیں کرتا۔

وہ لفظ جن کا املا متعین رہا ہے اور آج بھی اسی طرح متعین ہے، لیکن غلط فہمی سے کچھ لوگ کسی اور طرح بھی ان کو لکھ دیا کرتے ہیں، ایسے الفاظ خواہ کسی مخطوطے میں ہوں یا مطبوعہ نسخے میں، ان کا شمار بھی لغت کے نقطۂ نظر سے املا کے ذیل میں نہیں کیا جا سکتا، خواہ وہ مخطوطہ کتنا ہی اہم ہو یا وہ چھپی ہوئی کتاب کتنی ہی پرانی ہو۔ مثلاً:

ذخار، ذکریا، تماشہ، معمہ، گزشتہ، نمائش ہم، معہ، موقعہ، طلاطم، طپش۔ اس کی بھی مثالیں موجود ہیں کہ ایک ہی مصنف نے ایک ہی لفظ کو دو طرح لکھا ہے۔ مثلاً گنج خوبی کے اس مخطوطے میں درج ذیل الفاظ دو طرح لکھے ہوئے ہیں:

اعلیٰ، اعلا، عقبا، عقبیٰ، ٹھٹا، ٹھٹھا، جھوٹ، جھوٹھ، دسخط، دستخط، میںنے، میں نے، خوشنودی، خشنودی، چھانو، چھاؤں۔

ایسے مقامات اختلافِ املا کے ذیل میں آتے ہیں اور ان کا ذکر ہونا چاہیے، لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، ان میں احتیاط کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، یعنی محض کسی گمنام کاتب یا مجہول ناقل کی سند پر ان لفظوں کے اس املے کو مصنف سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ اس قبیل کے الفاظ جن میں حقیقی اختلافِ املا موجود ہوتا ہے اور واقعتاً لفظ کی ایک مختلف صورت کی نمائندگی کرتے ہیں، کسی خاص مصنف سے انتساب کے بغیر بھی پیش کیے جا سکتے ہیں، کیونکہ اس نوع کے اختلافات ان لفظوں میں جگہ جگہ مل جاتے ہیں اور متعدد مخطوطوں میں ان شکلوں کا وجود، اس کے اثبات کے لیے کافی ہے کہ ان میں اختلافِ املا ہے اور یہ تکرار نہ لغزشِ قلم کا نتیجہ ہے نہ غلط فہمی کا۔

میں اس بات کو مکرر کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن الفاظ میں کسی بھی نوعیت سے املا کا واقعی اختلاف ہے اور یہ اختلاف ان لفظوں کی مختلف شکلوں کی صورت گری کرتا ہے، تو یہ ضروری نہیں کہ اس اختلاف کو کسی مصنف سے منسوب کرنے کے بعد ہی بطورِ سند پیش کیا جا سکے۔ اگر یہ ممکن ہو تو بہتر ہے یعنی اگر کسی مصنف کی خطی تحریر ہمارے سامنے ہو، تو یقیناً اس سے استناد کیا جا سکتا ہے اور اس صورت میں مصنف اور عہد، دونوں کا تعین صحیح ہوگا۔ اگر ایسی خطی تحریریں سامنے نہ ہوں اور وہ مختلف صورتیں متعدد مخطوطوں میں ملتی ہوں، تو یہ کثرت اور تکرار، استناد کے لیے کافی ہے، لیکن اس صورت میں اس اختلاف کو کسی ایک مصنف سے منسوب نہیں کیا جا سکتا نہ کسی سنہ کا تعین کیا جا سکتا ہے، صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ مثالیں فلاں فلاں زمانے کے ان مخطوطوں میں ملتی ہیں۔ اگر کوئی مثال صرف ایک مخطوطے میں ملتی ہو یا کسی ایک مطبوعہ نسخے میں، اور اس میں غلط الکاتب کا احتمال بھی ہو سکتا ہو، تو اس کو لغت میں بطورِ سند نہیں پیش کیا جا سکتا۔ یہ اختلاف صرف اس متن کے مرتب کے کام کا ہو سکتا ہے۔

جن لغت ناموں میں لفظوں کے عہد بہ عہد تغیرات معنی و املا کی نشان دہی کی جائے اور اس کے لیے مصنف یا تصنیف کا زمانہ بھی لکھا جائے (جیسا کہ ترقی اردو بورڈ کے اس لغت نامے میں ہے) ان میں اس احتیاط کو ملحوظ رکھنا بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ کسی لفظ کے املا کا انتساب، کسی مصنف سے کر دیا جائے اس صورت میں کہ اس مصنف کی خطی تحریر ہمارے سامنے نہ ہو بلکہ کسی کاتب کی تحریر ہو اور ہم منسوب کر دیں اس تغیر کو مصنف سے، اور اس مثال کے ساتھ اس تصنیف کا سنہ لکھ دیں، یہ سرتاسر غلط فہمی اور غلط آفرینی ہوگی۔ ایسے موقعوں پر سنہ کی نشان دہی کے ساتھ یہ صراحت ضروری ہے کہ یہ تحریر فلاں عہد کے مخطوطے کی ہے، اگر سنہ کتابت معلوم ہو۔ سنہ کتابت معلوم نہ ہونے کی صورت میں، صرف اس مخطوطے کا حوالہ دیا جائے، زمانے کا تعین نہ کیا جائے، جب تک کسی مخطوطے میں وہی املا نہ ملے اور اس مخطوطے کا زمانۂ کتابت معلوم نہ ہو اس وقت تک یہ اختلاف، قطعی تعیین زمانہ سے محروم رہے گا، قیاسی تعیین البتہ کیا جا سکتا ہے۔

اس سلسلے میں اس سے بھی اہم پہلو یہ ہے کہ اگر کوئی لفظ کسی ایک مخطوطے میں خاص طرح لکھا ہوا ملتا ہے، اس صورت میں یہ بھی ضروری ہوگا کہ اس کے کاتب کا تعین و تشخص کرلیا جائے۔ اگر وہ غلط نویس ہے یا اس مخطوطے کی کتابت میں اس نے دوسرے مقامات پر کم سوادی کا مظاہرہ کیا ہے تو اس صورت میں اس اختلاف کو کسی دوسری مثال کے بغیر قبول نہیں کیا جا سکتا اور لغت میں اس اختلافِ املا کو درج نہیں کیا جا سکتا۔

اگر کسی مخطوطے کی کتابت کسی معلوم شخص نے کی ہے اور اس کی علمی یا ادبی شخصیت قابلِ ذکر بھی ہے اور اس نے آدابِ احتیاط کو بھی ملحوظ رکھا ہے، اس صورت میں اگر اس نے کسی جگہ کسی لفظ کو مروجہ یا معلوم انداز کے خلاف لکھا ہے اور اس مقام پر نظر بہ ظاہر لغزشِ قلم کا گمان بھی نہیں ہوتا، اس صورت میں اس اختلافِ املا کو اسی کاتب سے منسوب کر کے، لغت میں ظاہر کیا جا سکتا ہے، اور اگر اس اختلاف کی کوئی اور مثال نہ ملے، اس صورت میں اس کی صراحت ضروری ہوگی کہ اس وقت تک کی معلومات کے مطابق یہ واحد مثال ہے اور شاذ کے حکم میں آتی ہے۔

ایسے مخطوطے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جن کے کاتب کے متعلق یا تو ہمیں کچھ نہیں معلوم یا کم سے کم معلوم ہے اور اس کی شخصیت اور حیثیت کا تعین نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس مخطوطے میں اس کی کم سوادی یا کم نظری کی کوئی مثال نہیں ملتی اور پورا مخطوطہ پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا کاتب سمجھ دار بھی تھا اور محتاط بھی، ایسے مخطوطے میں اگر کسی لفظ یا الفاظ کا املا، اس زمانے کی روش سے مختلف ہے اس صورت میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا کہ اس اختلاف کو درج کر کے، اس قبیل کے اختلافِ املا کا تعلق صرف کاتب سے ہوگا، مصنف سے اس کا رشتہ نہیں جوڑا جائے گا۔ لغت میں بنیادی حیثیت اسی لفظ یا الفاظ کے مسلمہ املا (ایک ہو یا ایک سے زیادہ صورتیں ہوں) کو حاصل رہے گی، اس اختلاف کی حیثیت محض ضمنی ہوگی۔ البتہ متن کی ترتیب کے سلسلے میں صورتحال اس سے مختلف ہوگی۔ اگر ایسا مخطوطہ، دوسرے مخطوطوں پر تقدمِ زمانی رکھتا ہے اور درجۂ اعتبار اور اصولِ ترتیب کے لحاظ سے متن کی بنیاد بنائے جانے کا مستحق ہے، اس صورت میں یہ

خاص املامتن میں برقرار رہے گا اور اس لفظ یا الفاظ کے مسلمہ املا کو یا اس املا کو جو دوسرے مخطوطوں میں ہو، ثانوی حیثیت حاصل ہوگی اور ان کو حاشیے میں درج کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں ایک اور اہم بات یہ ہے کہ لسانی اعتبار سے علاقائی اختلافات پر بھی نظر رہنا چاہیے مثلاً اگر مصنف دکن یا گجرات کا ہے اور اس کے مخطوطے کی کتابت شمالی ہند کے کسی شخص نے کی ہے تو یہ بخوبی ممکن ہے کہ شعوری یا غیر شعوری طور سے کچھ لفظوں میں دکنی یا گجری زبان کی خصوصیات کے بجائے شمالی ہند کی خصوصیات تلفظ و املا کی پیوند کاری ہوگئی ہو، یا شمالی ہند کے کسی مصنف کی تصنیف کی کتابت دکن کے کسی شخص نے کی ہو اور اسی طرح کی صنعت گری راہ پا گئی ہو۔ مصنف کے متعلق اگر یہ علم ہو کہ وہ کس علاقے کا تھا اور کس عہد کا تو جن لوگوں کو مخطوطات شناسی سے سروکار رہا ہوگا اور وہ ان علاقائی خصوصیات سے آشنا ہوں گے اور تلفظ و املا کے مسائل پر بھی ان کی نظر ہوگی، ان کے لیے یہ طے کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا کہ اس کا کاتب اسی لسانی علاقے کا ہے یا کسی دوسرے علاقے کا، یا یہ کہ جو اختلافاتِ املا ملتے ہیں، ان کا تعلق مصنف سے ہو سکتا ہے یا کاتب سے۔ اسی نسبت سے ان اختلافات کا تعین اور انتساب کیا جائے گا۔ مختلف لسانی خصوصیات رکھنے والے علاقوں کے کاتبوں کے لکھے ہوئے کسی ایک کتاب کے مخطوطوں کا تقابل کیا جائے تو اس سلسلے میں بعض دلچسپ مثالیں سامنے آئیں گی اور معلوم ہوگا کہ ایسے علاقائی اختلافات نے لفظوں کی صورت پر کس کس طرح اثر ڈالا ہے۔

بہت سی مطبوعہ کتابوں کا اگر مستند خطی نسخوں سے مقابلہ کیا جائے تو عجیب عجیب طرح کے اختلافات سامنے آئیں گے۔ یہ اختلافات بعض اوقات لفظ کی ساخت کے لحاظ سے اور بعض اوقات املا کے لحاظ سے بیحد اہم ہوتے ہیں۔ میں اثبات مدعا کے لیے گنج خوبی کے مذکورہ خطی نسخے اور اس کے مطبوعہ نسخے (مطبوعہ کلکتہ ۱۸۴۶ء) سے ایسی دو چار مثالیں پیش کرتا ہوں:

(۱) ''جو آپ ڈر سے غنیم کو لکھتے تھے'' (نسخہ مطبوعہ ص ۱۹۴) ''جو اپڈر سے غنیم کو لکھتے تھے'' (مخطوطہ ۹۔ صحیح لفظ اپڈر ہے بہ معنی خوف، اس کی یہ صورت مسخ ہوئی ہے۔ (۲) ''سورما چنا

بھاڑ نہیں پھوڑتا'' (نسخہ مطبوعہ ص ۱۴۴) ''اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑتا'' (مخطوطہ)۔ (۳) ''دروغ گوئی کی بدبو سے مغزان کا پراگندہ کرے'' (نسخہ مطبوعہ ص ۱۷۵) ''دروغ کی بدبوئی سے مغزان کا پراگندہ کرے'' (مخطوطہ) بدبوئی بجائے بدبو اور خوشبوئی بجائے خوش بو کو میر امن نے کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ غالباً مصحح نے اسے مصنف کی غلطی سمجھ کر بہ زعم خویش تصحیح فرمائی ہے۔ (۴) ''بندی خانے میں قید رہا'' (نسخہ مطبوعہ ص ۴۵۵) ''پنڈت خانے میں قید رہا'' (مخطوطہ) لفظ پنڈت خانہ، بمعنی بندی خانہ، میر امن نے اس کتاب میں بھی اور باغ و بہار میں بھی کئی جگہ استعمال کیا ہے، یہاں بھی غالباً فاضل مصحح نے بہ خیالِ خویش ایک غلطی کی تصحیح فرمائی ہے۔ (۵) ''تو قضاق اور چور کے کاٹ ہاتھ'' (نسخہ مطبوعہ ۳۴۳)۔ اگر صرف مطبوعہ نسخے پر اعتماد کیا جائے تو ایک نئے لفظ ''قضاق'' سے سابقہ پڑے گا، جس میں بہ ظاہر اختلاف املا معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ہے سرے سے مسخ شدہ صورت اور ظاہر ہے کہ اس کی ذمے داری پریس پر ہے نہ کہ مصنف پر۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مخطوطے میں یہاں ''قزاک'' ہے اور بہ لحاظِ املا یہ واقعی ایک مختلف صورت ہے اور اس کو اختلافِ املا کے ذیل میں آنا چاہیے۔

ایسے لفظ بھی ہیں جن کے املا میں آج کوئی اختلاف نہیں، لیکن ایک زمانے میں ان کی ایک اور صورت بھی مستعمل تھی، مثلاً ''ماں'' اور ''دونوں'' کہ یہ دونوں لفظ میر امن کے زمانے تک بغیر نون آخر یعنی ''ما'' اور ''دونو'' بھی ملتے ہیں۔ گنج خوبی کے اس مخطوطے میں بھی ان لفظوں کا یہی املا ہے۔ باغ و بہار کا جو ایڈیشن فورٹ ولیم کالج نے کلکتے سے شائع کیا تھا، اس میں بھی ان لفظوں کا یہی املا محفوظ رکھا گیا ہے۔ اس سے پہلے کے بھی مخطوطوں میں یہ صورت مل جاتی ہے۔ مثلاً کربل کتھا کے مخطوطے میں بھی یہ لفظ اسی طرح لکھے ہوئے ہیں[۵] یہ اختلاف قابلِ ذکر ہے۔

یہ بات ملحوظ رہنا چاہیے کہ زبان کے ارتقا کی کچھ کہانیاں لفظوں کے املا میں بھی چھپی ہوئی ہیں اور مختلف زمانوں کے تغیرات کی زبانِ حال سے ترجمان ہیں، اور اس ترجمانی میں بعض علاقائی امتیازات بھی پنہاں ہیں۔ مثلاً قصۂ مہر افروز و دلبر[۶] کے مخطوطے میں ڑ کی جگہ ڈ لکھا ہوا ہے

مثلاً بڈا، چھوٹے بڈے، وغیرہ۔ یا وہ محض قدامتِ زبان کی علامت ہیں۔ مثلاً کربل کتھا کے مخطوطے میں گیارہ، بارہ وغیرہ اعداد نون غنہ کے اضافے کے ساتھ لکھے ہوئے ملتے ہیں، یعنی: گیارھنہ، بارھنہ، تیرھنہ وغیرہ۔ یا جیتا (جتنا) کیتا (کتنا) ایتا (اتنا) اتا (اتنا) جتا (جتنا) جیسے لفظ کہ یہ سب علم زبان کے نقطۂ نظر سے تغیرات کی علامتیں ہیں۔ ان الفاظ میں بالیقین اختلافِ املا ہے۔ لغت میں اس کو درج کیا جائے گا، لیکن متروک کی حیثیت سے اور متن میں رکھا جائے اسی قدیم املا کو اصل کی حیثیت سے۔ اس میں کوئی مرتب متن تبدیل کرنے کا مجاز نہیں۔ کربل کتھا کے اس واحد مخطوطے پر سالِ کتابت درج نہیں اور ایسی بھی کوئی صراحت نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے لیکن اس کا املا اور طرزِ کتابت اس کے قدیم ہونے پر دلالت ضرور کرتے ہیں، اس لیے اگر لغت میں کربل کتھا کے ان املائی اختلافات کو بطور سند پیش کیا جائے گا تو ان کا انتساب مصنف سے نہیں کیا جائے گا بلکہ قیاساً اس کی کتابت کا جو زمانہ متعین کیا جا سکتا ہو، اس زمانے سے منسوب کیا جائے گا۔

کچھ لفظوں کے املا میں دہلی و لکھنؤ کا اختلاف ہے۔ مثال کے طور پر لفظ ''مسالا'' کو لیجیے۔ دہلی والے اسے ''مصالح'' لکھتے آئے ہیں۔ فرہنگِ آصفیہ میں بھی اسی طرح ہے، لیکن اہلِ لکھنؤ نے اسے مسالا قرار دیا ہے۔ یہ املا کا اہم اختلاف ہے، ایسے اختلافات کو خاص طور سے درج ہونا چاہیے۔ مولف نور اللغات نے امیر مینائی سے اس لفظ کے باب میں استفسار کیا تھا، امیر نے مفصل جواب دیا تھا، ان کا یہ خط مکاتیب امیر مینائی مرتبۂ ثاقب میں موجود ہے۔ مولف نور اللغات نے امیر کا یہ خط اپنی لغت میں اس لفظ کے ذیل میں درج کر دیا ہے، لیکن حوالے کے بغیر۔ امیر کے شاگرد ریاض خیر آبادی نے ایک استفسار کے جواب میں اس کو ''مسالہ'' ہے بتایا ہے، یہ درست نہیں، صحیح الف سے ہے جیسا کہ رائج ہے اور مجیب کی اس غلطی کو اختلافِ املا کے ذیل میں درج نہیں کیا جا سکتا۔ اس لفظ کی صرف دو صورتیں مانی جائیں گی۔ مصالح اور مسالا۔

کچھ ایسے لفظ ہیں جن کا املا ابھی تک قطعی طور سے طے نہیں کیا گیا ہے۔ جو جس طرح چاہتا

ہے، لکھتا ہے۔ مثلاً: ایڈیشن۔ اڈیشن، ایڈیٹر، اڈیٹر، تغیر۔ تغییر، منہدی۔ مہندی، جرأت۔ جرات۔ یہ بہت ضروری ہے کہ ایک بار ایسے تمام الفاظ کے متعلق قطعی فیصلہ کر دیا جائے، اور اسی فیصلے کے مطابق ان کو درج لغت کیا جائے تا کہ بذریعۂ استناد، انتشار سے محفوظ رہے۔

غرض یہ ہے کہ لغت میں اختلاف املا کا اندراج بہت توجہ کا طلب گار ہے۔ قدیم متنوں کی ترتیب میں جو طریقہ کبھی کبھی اختیار کیا جاتا ہے کہ ہر طرح کے اختلافِ املا کو حاشیے میں ظاہر کر دیتے ہیں، اس طرزِ عمل کو لغت میں نہیں برتا جا سکتا۔ لغت میں صرف ان اختلافِ املا کو جگہ ملنا چاہیے جو ہر حیثیت سے مستند ہوں اور یہ کہ جس مصنف کی تحریر سے اس اختلاف کی سند پیش کی جائے صرف اسی تحریر سے انتساب کی صحت کافی نہیں، اس مصنف سے اس خاص املا کے انتساب کی صحت بھی ضروری ہے۔ کاتبوں اور ناقلوں نے الفاظ کے جو جو املا لکھے ہیں اگر ان سب کو سند مان لیا جائے یا قابلِ اظہار، تو اچھا خاصا دفتر تیار ہو جائے گا اور جس کا بیشتر حصہ بے معنی ہوگا۔ جس طرح کسی مخطوطے کے املا سے، دوسرے شواہد کے بغیر اس کے مصنف کی زبان پر گفتگو کرنا درست نہیں، اسی طرح اس مصنف سے ان کا املا منسوب کر دینا بھی صحیح نہیں۔

گنج خوبی کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ اردو نامے کے اسی حصۂ لغت میں لفظ اچنبھا کے ذیل میں اس کا سال تصنیف ۱۸۰۲ء لکھا ہوا ہے۔ میر امن نے گنج خوبی کے دیباچے میں یہ صراحت کر دی ہے کہ "اس کثیر العیال نے سنہ ایک ہزار دو سو سترہ ہجری میں مطابق اٹھارہ سے دو عیسوی کے، باغ و بہار کو تمام کر کے اس کو لکھنا شروع کیا۔" (دیباچہ گنج خوبی)۔ گویا ۱۸۰۲ء سال آغاز ہے مطبوعہ نسخے میں ایسی کوئی صراحت نہیں ملتی کہ اس کی تکمیل کب ہوئی۔ البتہ گنج خوبی کے اس مخطوطے میں جو میر امن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے آخر کتاب میں یہ قطعۂ تاریخ تکمیل بھی موجود ہے جو خود میر امن کا کہا ہوا ہے:

گنج خوبی جب کیا میں نے تمام　　کہنی اک تاریخ ہوئی مجکو ضرور
تب کہا دل سے کہ کر میری مدد　　وہ لگا کہنے یہ شادی و سرور

"گنج خوبی لطف سے معمور ہے"　　لیک کر "بدگو" کو اس مصرع سے دور

اس سے سال تکمیل ۱۲۱۹ھ نکلتا ہے، لیکن اس سلسلے میں ایک اور روایت بھی قابل توجہ ہے۔ عتیق صدیقی صاحب نے اپنی کتاب "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں لکھا ہے کہ "۹ راگست ۱۸۰۳ء کو گل کرسٹ نے ان ہندوستانی مصنفین اور ان کی تصنیفات کی فہرست کالج کونسل کے سامنے پیش کی جو اس کے نزدیک انعام کی مستحق تھی" (ص۱۹۴)

اس فہرست میں گنج خوبی کا نام بھی موجود ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ترجمہ اگست ۱۸۰۳ء تک مکمل ہو چکا تھا۔ ایسا ہی ایک خلط مبحث باغ و بہار کے سال تکمیل کے سلسلے میں بھی ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ترجمہ واقعتاً اگست ۱۸۰۳ء تک مکمل ہو چکا تھا۔ ۱۸۰۴ء میں جب میر امن نے اپنے شاگرد جان رومر کے لیے اس کا ایک خطی نسخہ اہتمام کے ساتھ تیار کیا، اس وقت یہ قطعۂ تاریخ کہہ کر اس نسخے میں شامل کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ مطبوعہ نسخہ اس سے خالی ہے کیونکہ اس پہلے نسخے میں یہ شامل نہیں ہو سکتا تھا اور مطبوعہ نسخہ اسی پہلے نسخے پر مبنی ہوگا جو کالج کونسل کے سامنے ۱۸۰۳ء میں پیش کیا گیا ہوگا۔ جان رومر نے اس خطی نسخے کے شروع میں تیسرے ورق کے پہلے صفحے پر میر امن کے متعلق لکھا ہے:

"Hindoostanee Moonshee in the college of the Fort William attached to me in 1802-3-4"

۱۸۰۲ء میں میر امن نے اس کے ترجمے کا کام شروع کیا۔ ۱۸۰۳ء میں یہ مکمل ہو گیا۔ جان رومر سے میر امن کا تعلق ۱۸۰۴ء تک رہا ہے۔ اس لیے میرا خیال ہے کہ یہ مخطوطہ ۱۸۰۴ء میں میر امن نے جان رومر کے لیے لکھا اور اسی وقت اس قطعۂ تاریخ کا اضافہ کر دیا۔ ان امور کے پیشِ نظر جب تک اس سلسلے میں کوئی اور نئی بات معلوم نہ ہو گنج خوبی کا سال تالیف ۱۸۰۳ء ماننا چاہیے[۹]۔

حواشی:

۱۔ یا مثلاً مخطوطہ دیوان بقا (ذخیرۂ اشپرنگر، جرمنی) اس کا کاتب نہایت خوش خط ہے، لیکن بلا کا

غلط نویس۔ اس نے لفظوں اور مصرعوں کو عجیب عجیب انداز سے لکھا ہے۔ اس مخطوطے کا عکس پیش نظر ہے۔ ایسے مخطوطات کی اچھی خاصی فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔ (رشید حسن خان)

۲۔ یہ نسخہ میر امن نے اپنے شاگرد جان رومر کے لیے لکھا تھا۔ خط پختہ اور واضح نستعلیق ہے۔ انھوں نے بہت سے لفظوں پر اعراب بھی لگائے ہیں اور توقیف نگاری سے بھی کام لیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ نسخہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جان رومر کی تحریریں اس کے اول و آخر میں موجود ہیں اور اس نے صراحت کی ہے کہ وہ ان کا شاگرد ہے اور یہ نسخہ میر امن کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس نسخے میں قطعۂ تاریخ تکمیل کتاب بھی موجود ہے، جو مطبوعہ نسخے میں موجود نہیں۔ اس کی تفصیل اس مضمون کے آخر میں پیش کی گئی ہے۔ (رشید حسن خان)

۳۔ مثلاً جتلا و عشق میرٹھی کے ''تذکرۂ طبقات سخن'' کا ایک مخطوطہ (مخزونہ گاندھی فیض عام کالج شاہ جہاں پور) اس کی عمدہ مثال ہے۔ اس کے کاتب نے عجیب عجیب کرشمہ کاریاں کی ہیں۔ (رشید حسن خان)

۴۔ رشید صاحب اس لفظ کو نمائش کی بجائے نمایش لکھنے کے قائل تھے اور فارسی کے املا کو اس ضمن میں سند کے طور پر پیش کرتے تھے (مرتب)

۵۔ کربل کتھا میں ''تینوں'' بھی بغیر نون آخر یعنی ''تینو'' لکھا ہوا ہے۔ (رشید حسن خان)

۶۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب نے اسے حال ہی میں حیدر آباد دکن سے شائع کیا ہے۔ اس میں اس کا جو عکس شامل ہے، یہ قول ان ہی صفحات پر مبنی ہے۔ مطبوعہ نسخے میں یہ لفظ رائے ہندی (ڑ) سے لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ (رشید حسن خان)

۷۔ ''مسالہ۔ س، ہ سے صحیح ہے'' مکتوب ریاض بنام صفدر مرزا پوری (مرقع ادب جلد دوم ص ۱۶۲)۔ (رشید حسن خان)

۸۔ ایران کی چھپی ہوئی بعض کتابوں میں اس کا یہ املا بھی ملتا ہے: جرئت۔ میری رائے میں یہ املا زیادہ مناسب ہے، اور اگر اس کو بالاتفاق قبول کر لیا جائے تو بہتر ہے۔ (رشید حسن خان)

۹۔ رشید صاحب کی ان باتوں کا جواب شان الحق حقی نے جو بورڈ کے معتمد اور رسالے کے مدیر تھے، نے دیا تھا۔ ان کا جواب یہ تھا (مرتب):

فاضل مضمون نگار نے املا کے جن مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے بلاشبہ اہم ہیں اور ہم ان

کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے اس موضوع پر بطور خاص ہم سے تخاطب فرمایا۔ ہمیں اپنے کام کے آغاز ہی میں املا کے مسئلے سے سابقہ پڑا تھا، اور ہم نے یہ مجمل اصول اختیار کر لیا تھا کہ املا کو مصنف سے منسوب نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ مسئلہ اس سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ احتیاط سے تیار کیے ہوئے ایڈیشنوں کی عدم موجودگی اور مخطوطات تک رسائی نہ ہونے کے سبب ہمارے لیے اس کا سرانجام اور بھی دشوار ہو گیا ہے۔ بہر حال ہم اس اختلافِ املا کو ضرور ملحوظ رکھتے ہیں جس سے تلفظ کا اختلاف ظاہر ہوتا ہو، نیز وہ املا جو مصدقہ طور پر مصنف سے منسوب کیا جا سکے۔ باقی بہت سے اختلاف نظر انداز کر دیے گئے ہیں۔ ش۔ ح۔ ح

(سہ ماہی ''اردو نامہ'' کراچی، شمارہ ۲۹، اکتوبر ۱۹۶۷ء)

☆☆☆☆

حفظ الرحمٰن واصف

لغات کی تحقیق

راقم الحروف نے ایک کتاب بہ نام ''اردو مصدر نامہ'' چند سال قبل تالیف کی تھی۔ اس کے بعد دوسری کتاب بہ نام ''ادبی بھول بھلیاں'' شائع ہوئی۔ یہ دوسری کتاب رشید حسن خاں کی تالیف ''اردو املا'' اور ''زبان وقواعد'' پر تنقید تھی۔ میں حیران اور متعجب تھا کہ اردو زبان اور رسم الخط پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں اور کوئی مدافعت نہیں کرتا۔ اور میں نے مدافعت کی نیت سے جو کاوش کی ہے اس کی کوئی تائید نہیں کرتا۔ کیا واقعی اب اس زبان میں اور اس کے رسم الخط میں ایک دم عیب ہی عیب پیدا ہو گئے۔ اپنے بیگانے سب ہی اس پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ کوئی بناؤ سنگار کے بہانے اس کے ناک کان کترتا ہے۔ کوئی اس کے زخم وار ناخن اور ٹیڑھی چونچ دیکھ کر ترس کھاتا ہے اور نوکیں کاٹتا ہے۔ کوئی نظرِ بد سے بچانے کے لیے اس کے اوپر کالک چڑھا دیتا ہے۔ کوئی چھڑی سے اس کے کپڑوں کی گرد جھاڑتا ہے۔ غرض کہ اردو کے لیے بڑا آزمائشی دور ہے۔

اس زبان میں لغات کا بے پناہ ذخیرہ موجود ہونے کے باوجود نئے نئے الفاظ اور مکروہ تراکیب ایجاد کی جا رہی ہیں فصاحت تو ایک بے معنی لفظ ہو کر رہ گیا ہے۔ ڈیزائنر اس کے رسم الخط پر ہاتھ صاف کر رہے ہیں۔ قدیم املا میں بھی عیوب ہی عیوب تھے اس کی بھی اصلاح کی جا رہی

ہے۔ وہ حروف جو اردو املا کا جزو لاینفک تھے ان کے بارے میں بڑی جرأت سے کہا جا رہا ہے کہ مردہ لاشیں ہیں جو اردو رسم الخط محض اس لیے کندھوں پر اٹھائے ہے کہ عربی سے اس کا لسانی رشتہ قائم نہ رہے۔ مگر کوئی نہ کوئی رشتہ تو رہے گا۔ اب عرب ممالک سے جو نیا رشتہ قائم ہوا ہے اس سے کیوں کر انکار کیا جائے گا اور اس نئے رشتے کے لیے لسانی رشتے کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت پڑتی ہے۔

ابھی فروری ۱۹۸۴ء میں مجھے دو کتابیں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ایک ''زبان و لغت'' دوسری ''اردو املا اور اس کی اصلاح'' یہ دونوں کتابیں ڈاکٹر ابو محمد سحر پروفیسر و صدر شعبۂ اردو گورنمنٹ حمیدہ کالج بھوپال کی تصانیف ہیں۔ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ ایک فقیرِ بینوا کا کوئی ہم نوا تو ظاہر ہوا انتہائے اشتیاق میں سرسری طور پر ایک ہی نشست میں سب دیکھ ڈالیں۔ خوشی ہوئی کہ بڑی حد تک انھوں نے وہی کہا ہے جو میں چاہتا تھا۔

بے شک ایک مستند لغت کی ضرورت ہے۔ ابھی تو پاڑ بندھ رہی ہے۔ یہ پاڑ کب بندھ چکے گی اور کب لغت نویسی کا کام شروع ہوگا؟ اور کیا ہم جیسے مشتاق عمر رسیدہ طلبہ کو اپنی زندگی میں اس سے استفادے کا موقع مل جائے گا؟ کیا ان تجاویز کا حشر سیاسی تجاویز جیسا تو نہیں ہوگا؟ کیا یہ کھلونا دے کر بہلانے کی بات تو نہیں ہے؟ اس قسم کے متعدد سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ جواب تو وقت ہی دے گا۔

ہمیں اس سے غرض نہیں کہ حکومت اردو کے لیے کتنا روپیہ خرچ کر رہی ہے اور اس کے نتیجے میں صالح ادب سطح پر ابھر رہا ہے یا فاسد؟ ہمیں تو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔

بہرحال سحر صاحب کی دونوں کتابوں کی تالیف میں جو جذبہ کارفرما ہے وہ قابلِ تحسین ہے۔ میری ناچیز تالیف کو ڈاکٹر صاحب موصوف نے نگاہِ جوہر شناس سے دیکھا ہے اور عزت افزائی کی ہے وہ بھی موجب ممنونیت ہے۔

ممکن ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی تصانیف کے تمام مندرجات سے بالاستیعاب مجھے اتفاق نہ

ہو لیکن مجموعی طور پر ان کی سعی مشکور ہے۔ کتابوں کے سرسری مطالعے کے بعد خود بھی کچھ لکھنے کو جی چاہا جو کچھ قلم برداشتہ ضبطِ تحریر میں آیا وہ درج ذیل ہے:

پروفیسر صاحب نے ان اعتراضات کا تذکرہ کیا ہے جو آثر لکھنوی نے ''سرمایۂ زبانِ اردو'' اور ''نور اللغات'' کے بعض مندرجات پر وارد کیے ہیں اور اعتراض اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہیں۔ لیکن بعض مقامات پر راقم الحروف کو ان کی رائے کے ماننے میں تامل ہے۔

(۱)

نور الغات میں ایک محاورہ لکھا ہے۔ زارونزار رونا۔ معنی لکھے ہیں زار زار رونا، زاروقطار رونا۔ بہت رونا۔ سند میں جان صاحب کا شعر لکھا ہے:

اور لے کر چلے وہاں سے کہار
روتی جاتی تھی میں تو زارونزار

آثر لکھنوی کہتے ہیں کہ زارونزار محاورہ نہیں ہے۔ عورتیں زار زار رونے کو زاروں زار رونا کہتی ہیں۔ حضرت مولف اسی کو زارونزار پڑھ گئے۔

اس پر سحر صاحب اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں کہ آثر کی اس صراحت کی روشنی میں کہ عورتیں زاروں زار کہتی ہیں ممکن ہے جان صاحب کے شعر میں زاروں زار ہو اور اسے زارونزار لکھ دیا گیا ہو۔ لیکن زارونزار رونا عام طور پر مستعمل ہے۔ بظاہر یہ زاروں زار نہیں ہے۔ زار اور نزار دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ اگر زار زار رونا صحیح ہے تو زارونزار رونا کی صحت میں بھی کلام نہیں ہو سکتا۔ (زبان ولغت ص ۵۰)

واصف عرض کرتا ہے کہ محاورہ زاروں زار رونا ثبوت طلب ہے اور زارونزار رونا اس سے بھی زیادہ ثبوت طلب ہے۔ اگر ان دونوں محاوروں کا صحیح ہونا ثابت نہ ہو سکے تو کیا کیا جائے؟ ایک کوشش اگر شعر کی بندش کو سمجھنے کی بھی کر لی جائے تو شاید مشکل آسان ہو جائے۔

زار و نزار حال واقع ہوا ہے ضمیر متکلم (میں) کا: کہ رونے کا یعنی میں روتی ہوئی جاتی تھی اس حال میں کہ زار و نزار تھی۔ زار و نزار کے معنی عاجز و درماندہ مجبور۔

اس سے رونے کی کیفیت کا ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے۔ مصرعے کی عبارت یوں مرتب کی جائے تو مفہوم واضح تر ہو جائے گا کہ ''میں تو روتی ہوئی زار و نزار جا رہی تھی۔'' یعنی جانے پر مجبور تھی اور اپنی بے چارگی پر رو رہی تھی۔ واضح ہو کہ ''روتی'' اسم حالیہ ''روتی ہوئی'' کا مخفف ہے۔ ترکیب نحوی یوں ہوگی کہ جاتی تھی فعل، میں ضمیر متکلم ذوالحال، روتی ہوئی اور زار و نزار، تینوں حال۔ ذوالحال اور حال مل کر فاعل بنا۔ فعل اپنے فاعل سے مل کر جملہ فعلیہ خبریہ ہوا۔

(۲)

سحؔر صاحب لکھتے ہیں آب بمعنی چمک دمک مؤنث ہے۔ لیکن آتش نے ایک شعر میں مذکر نظم کیا ہے۔

نشہ ہی میں یا الٰہی میکشوں کو موت دے
کیا گہر کی قدر جب آب گہر جاتا رہا

جلالؔ نے مفید الشعر میں اس شعر کو مذکر کی سند میں پیش کیا ہے۔ جس کی تقلید میں چند دوسرے لغت نگاروں نے بھی اسے مختلف فیہ قرار دیا ہے۔ لیکن رشید حسن خاں نے اس کو آتش کا تسامح قرار دیا ہے۔ سحؔر صاحب کی رائے ہے کہ نہ مختلف فیہ ہے نہ تسامح ہے۔ بلکہ قصداً ضرورت شعری کی وجہ سے مذکر باندھا ہے کیوں کہ ردیف ''جاتا رہا'' تھی (زبان و لغت ص ۵۶)

واصفؔ عرض کرتا ہے۔ اردو کا محاورہ ہے ''آب جاتی رہی''۔ کہنا چاہیے تھا ''موتی کی آب جاتی رہی' فارسی میں آب رفتن محاورہ نہیں ہے۔ اور آبِ گوہر، آبِ مروارید، آبِ لولو، موتیا بند کو کہتے ہیں (بہار عجم) آبِ گوہر ترکیب پا کر اردو محاورے کا جزو نہیں بنا۔ خواجہ آتش تردد میں پڑ گئے کہ اس صورت میں آبِ گوہر کو مؤنث قرار دیں یا مذکر، فارسی ترکیب میں آ کر اس کی تذکیر و تانیث مشتبہ ہوگئی۔ فارسی میں تذکیر و تانیث نہیں ہے۔ پس انھوں نے قیاس سے کام لے

کر اسے مذکر قرار دے دیا۔ یہ خطائے اجتہادی ہے۔ ضرورتِ شعری کی وجہ سے زبان و لغت کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔ پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ لفظ از روئے قواعد غلط یا فصاحت سے گرا ہوا نہ ہو اور محاورے کے خلاف نہ ہو۔ ورنہ شعر کہنے ہی کی کیا ضرورت ہے۔

(۳)

آگے سحر صاحب لکھتے ہیں: آب بمعنی چمک دمک کو آتش نے مذکر باندھا۔ اس طرح کی اور مثالیں بھی اساتذہ کے کلام میں ملتی ہیں۔ مثلاً ہن عام طور پر مذکر ہے۔ لیکن داغ نے مؤنث کہا ہے۔

ہن برستی ہے دکن میں یہ مثل ہے مشہور
تو نے برسائے گہر فیض سے معدن معدن

الخ (زبان و لغت ص ۵۷)

واصف عرض پرداز ہے: ہن کو مؤنث داغ نے باندھا ہے؟ یا وہ خود مؤنث بندھ گیا؟ تحقیق طلب ہے۔ ممکن ہے کاتب کی پڑھنت سے جنس بدل گئی ہو اور کاتب تو اس سے بھی زیادہ عظیم و عجیب حرکتیں کرتے ہیں تذکیر و تانیث کے فرق سے وزن شعر میں فرق نہیں آیا۔ اگر یہ تاویل نا معقول ہو تو دوسری تاویل یہ ہے کہ حضرت داغ کی تربیت قلعۂ معلیٰ میں ہوئی ہے۔ قلعہ، معلیٰ اور شہر کی زبان میں فرق تھا۔ ممکن ہے قلعے میں ہن کو مؤنث بولتے ہوں جیسے ظفر نے گھڑیاں کو مؤنث باندھا ہے۔ (اردو مصدر نامہ ص ۳۱۶)

اسی طرح لفظ چھان بین اور چھان بنان کے متعلق ایک واقعہ تذکرۂ مسائل ص ۷۱ پر درج کیا گیا ہے۔ قلم (آلۂ کتابت) کو داغ اور دیگر شعراء نے مذکر باندھا ہے لیکن ظفر نے مؤنث باندھا ہے (فرہنگ آصفیہ)۔ پودوں کی قلم لگانا یا شورہ نمک مصری وغیرہ کی قلم مؤنث ہے۔ اسی سے دھوکا کھا کر بعض ناواقف لوگ آلۂ کتابت کو مؤنث سمجھ لیتے ہیں۔ مذکورہ مثالوں [سے] چمک دمک یا بجھاؤ کے معنی میں آب کی تذکیر کا جواز نہیں نکلتا۔

(۴)

آگے سحر صاحب لکھتے ہیں: یہ تو ایسے الفاظ کا معاملہ تھا جن میں اختلافِ رائے ہے۔ اساتذہ کے کلام میں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جو بالکل غلط ہیں اور جن کا چلن بھی نہیں ہے، کسی ایک استاد نے اپنے کسی ایک شعر میں نظم کر دیا ہے۔ آتش کے ایک شعر میں نزاع کے معنی نزع کا استعمال اسی قبیل کا ہے۔

حاصل ہوا نہ خاک بھی آپس کی نزع سے
دل میں غبار کافر و دیندار لے چلے

حالاں کہ پہلے مصرعے میں کتابت کی غلطی کا احتمال ہے۔ ممکن ہے۔ ''ان کی نزاع'' ہو لیکن اس طرح کے مقامات کی قیاسی تصحیح سے احتراز لازم ہے۔ ہاں کسی مستند ماخذ میں ''ان کی نزاع'' ملے تو اس کو درست کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ صورت میں نزع یا نزاع دونوں الفاظ یا صرف نزع کے تحت یہ صراحت کر دی جائے گی کہ آتش نے بہ معنی نزاع استعمال کیا۔ (زبان و لغت ص ۶۰)

واصف عرض کرتا ہے نزع اور نزاع دونوں لفظ اردو میں اپنے متعین اور واضح معنی کے ساتھ اس قدر عام اور غیر مشکوک ہیں کہ کسی تسامح یا تصرف کا امکان نہیں۔ آتش کے بارے میں یہ خیال کہ انھوں نے نزع کو بمعنی نزاع باندھا ہے محض بدگمانی ہے۔ یہ یقیناً نقل در نقل کی غلطی ہے۔ ''باہم نزاع'' یا اور کچھ ہوگا۔ کاتب نے سبقتِ قلم یا اپنے اجتہاد سے باہم کا ترجمہ لکھ دیا ہوگا۔ لغت کو ایسی تردد پیدا کرنے والی سندوں سے پاک رکھنا چاہیے۔

(۵)

سحر صاحب لکھتے ہیں: اساتذہ کے کلام میں ایسے تلفظ بھی ملتے ہیں جو نہ اصل کے مطابق درست ہیں۔ نہ مروجہ تلفظ کے اعتبار سے۔ ایک لفظ ہے مبرہن۔ سودا نے ایک جگہ اسے صحیح استعمال کیا ہے۔

ہے مجھے فیضِ سخن اس کی ہی مداحی کا
ذات پر جس کے مبرہن کُنہ عزوجل

لیکن ایک دوسرے قصیدے مبرہن (بسکون دوم وفتحہ سوم) نظم کیا ہے۔

سجدہ کریں ہیں مہر و مہ در پہ انھوں کے روز و شب
مبرہن اس سے یوں ہوا داغی ہیں یہ غلام دو

لغت میں ضمناً یہ لکھ دیا جائے گا کہ سودا نے اس طرح بھی کہا ہے۔ (زبان ولغت ص ۶۳)

واصف عرض گزار ہے کہ لغت میں درج کرنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ چونکہ اتنے بڑے جلیل القدر اور مستند استاد نے کہا ہے لہٰذا یہ بھی صحیح ہے اور ہم بھی اس طرح باندھ سکتے ہیں۔ ایسی لغت تو رہنما اور قابل استناد نہیں ہوسکتی۔

پہلے شعر میں تین فاش غلطیاں ہیں (۱) کنہ کو متحرک الاوسط باندھا (۲) پھر اس کی اضافت فعل کی طرف کردی۔ فعل نہ مضاف بن سکتا ہے نہ مضاف الیہ (۳) عزوجل دونوں فعل ہیں۔ اس سے ذات خداوندی مراد لینا اصولی غلطی ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہے۔ تعالیٰ کا فرمان ہے، تبارک وتعالیٰ نے قرآن نازل فرمایا، فضلِ عزوجل سے مریض شفایاب ہوگیا، صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی، کرم اللہ وجہہ کا نکاح رضی اللہ عنہا سے ہوا، علیہ السلام نے بیت اللہ تعمیر کیا۔ رحمتہ اللہ علیہ نے اسلام کو سربلند کیا، قدس سرہ کا مزار مہرولی میں ہے۔

دوسرے شعر میں مبرہن بروزن مختصر بالکل غلط اور ناجائز تصرف ہے۔ اردو میں تو یہ لفظ عام بول چال میں ہے ہی نہیں۔ غلط العام کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایک خاص علمی طبقے کا اور ایک فن کا اصطلاحی لفظ ہے۔ یہ تصرف لغتاً بھی غلط اور علمی طبقے کی بول چال کے بھی خلاف ہے۔

ضرورت شعری کو اس قدر اہمیت دینا کہ لغت، قواعد اور محاورے کو یکسر نظرانداز کردیا جائے اس کو ایک ناپسندیدہ اور ناقابل استناد ایجاد ہی کہا جاسکتا ہے اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں ایسی کیا ضرورتِ شعری تھی کہ اس کے لیے صحیح کو غلط کرنا پڑا۔ حالاں کہ سامنے کا لفظ ''منکشف''

موجود تھا۔

بہر حال سوداؔ ہوں یا آتشؔ یا نظاؔمی گنجوی یا اور کوئی استاد باایں ہمہ کمال و عظمت انسان تھے اور انسان خطا و نسیان کا پتلا ہے ایسے غلط الفاظ کو لغت میں درج کرنا، حوالہ دینا ان کی لغزش کو اجاگر کرنا اور شہرت دینا ہے اور طلبہ کے لیے بھی غیر مفید بلکہ مضر ہے۔ ہمارے اسلاف کا دستور یہ تھا کہ ایسی کوئی چیز سامنے آجاتی تھی تو تاویلات و توجیہات کرتے تھے اور مصنف کی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کرتے تھے اور جب کچھ بس نہیں چلتا تھا تو کہتے تھے: خطائے بزرگاں گرفتن خطاست۔ اللہ تعالیٰ مصنف کی خطاؤں سے درگزر فرمائے یہ مصنف کا سہو ہے۔

(۶)

سحرؔ صاحب لکھتے ہیں: ایک اور موقعے پر انھوں نے (یعنی رشید حسن خاں نے) جہالت، رفاقت، حماقت اور حقارت کے ساتھ رقابت کا بھی عام اردو تلفظ بکسر اول بتایا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ رقابت عام طور پر بہ فتح اول بولا جاتا ہے۔ رواج کے بارے میں لکھا ہے کہ اردو میں رواج کو اب بکسر اول مرجح ماننا چاہیے۔ (زبان وقواعد ص ۱۰۷، ۱۰۸)۔ میری رائے میں اب اس لفظ کا تلفظ بدل گیا ہے اور یہ زیادہ تر بفتح اول بولا جاتا ہے اسی کو مرجح ماننا چاہیے۔ رقابت اور رواج کی طرح روایت اور رذالت کی بھی یہی صورت ہے۔ الخ (زبان ولغت ص ۷۰)

واصفؔ عرض کرتا ہے کہ رواج، روایت رذالت، جہالت رفاقت، حماقت یہ ساتوں لفظ اہل دہلی کے لہجے میں بکسر اول ہی فصیح ہیں۔ لغتاً باستثنائے روایت سب بفتح اول ہیں۔ ایک لفظ رواز بالفتح ہے اس کو بعض لوگ جیم کے ساتھ رواج بولتے ہیں۔ (صحیح زے سے ہے) گوشت کے اندر کی چربی کو کہتے ہیں۔ یہ اردو لفظ ہے اور بفتح اول صحیح ہے آصفیہ میں اس کو بکسر اول غلط لکھ دیا ہے۔

(۷)

سحرؔ صاحب، لکھتے ہیں۔ طمطراق بول چال میں بکسر اول و فتح سوم بھی آتا ہے اور اردو کے

لہجے کے مطابق ہے (زبان ولغت ص ۷۶) احقر واصف اس لہجے کو سمجھنے سے قاصر اور ناواقف ہے۔

(۸)

ملائی [اور بالائی] پر بہت طویل بحثیں کی گئی ہیں۔ زبان وقواعد میں پندرہ صفحات اور زبان ولغت میں تین صفحے اس کی نذر ہو گئے۔ دودھ کو اوٹانے سے اوپر کی سطح پر جو موٹی سی تہہ جمتی ہے اس کو ملائی کہتے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ منڈلائی تھا۔ پھر مخفف ہو کر ملائی ہو گیا۔ (منڈلانا اور منڈھنا کا ایک ہی ماخذ ہے) معلوم نہیں کیوں بعض حضرات نے ایک نیا لفظ ایجاد کیا جو ملائی کا مترادف ہے [یعنی بالائی]۔ یہ ایجاد بے ضرورت بھی تھی اور بے لطف بھی۔ کیوں کہ ملائی کے معنی ہیں اوپر چھانے اور احاطہ کرنے والی چیز۔ بالائی میں احاطہ کا مفہوم نہیں ہے اس لحاظ سے یہ لفظ ناقص رہا۔ یہ جدید تحقیق اب میں نے اردو مصدر نامہ میں درج کر دی ہے جو انشاء اللہ طبع دوم میں آ جائے گی۔ (واصف)

(۹)

سحر صاحب لکھتے ہیں۔ املا نامے میں ایک جگہ اور اردو املا میں ہر جگہ مشتقات کے قاف کو مشدد لکھا گیا ہے۔ تکرار سے گمان ہوتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی نہیں ہے۔ مشتق کے قاف پر تشدید پہلے ہی حذف ہو چکی ہے جمع میں تشدید بولنے یا لکھنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ (اردو املا اور اس کی اصلاح ص ۸۷)

واصف عرض کرتا ہے یہ دلیل تو صحیح نہیں کہ چوں کہ مفرد میں سے تشدید حذف ہو چکی ہے اس لیے جمع میں بھی نہیں ہونی چاہیے۔ یہ کون کہتا ہے کہ مفرد میں سے تشدید حذف ہو چکی ہے۔ اگر وقف کی حالت میں تشدید کا تلفظ واضح طور سے نہ ہو تو اس سے یہ سمجھ لینا کہ تشدید حذف ہو چکی ہے اور جہاں اس کا تلفظ بہ آسانی ممکن ہے وہاں سے حذف کر دینا۔ یہ اجتہاد نہیں۔ اور یہ کہنا کہ مشتقات کا قاف غیر مشدد پڑھا جاتا ہے خلاف واقعہ بھی ہے۔

مشتق اسم مفعول ہے۔ یہ مادہ مضاعف ہے۔ (ش ق ق) مندرجۂ ذیل الفاظ کو ملاحظہ فرمائیے۔ مفرد کی صورت میں تشدید کا تلفظ نہیں ہوتا۔ ترکیب کی صورت میں تشدید پڑھی جاتی ہے:

شق، شقّ القمر، شقّ اول۔ حق، حقّانی، حقّی۔ مہم، مہمّات۔ محل، محلّات۔ ممتد، ممتدّہ۔ معتد، معتدّہ۔ سم، سمّیات۔ مرتد، مرتدّین۔ ردّ، ردِّ جواب۔ سد، سدّ راہ۔ ضد، ضدّی۔ جر، جرّ ثقیل۔ مد، مدّات۔ حد، حدّ نظر۔ مختل، مختلّ الحواس۔ مختص، مختصّات۔ محبّ، محبّ صادق، محبّین۔

بہرحال سحرؔ صاحب کا اقدام دوررس نتائج کا حامل اور لائقِ تہنیت ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ حرکت میں برکت ہے اور اختلاف موجبِ رحمت ہے۔ اردو پر جو ہر چار طرف سے حملے ہو رہے ہیں ان حملہ آوروں میں سے ایک گروہ ڈیزائنروں کا ہے جو کتابوں کے ڈسٹ کور اور ٹائیٹل پر ڈیزائن بناتے اور اردو کے خوب صورت نستعلیق خط پر ہاتھ صاف کرتے ہیں اور عجیب مضحکہ خیز نکلا بوچا لنجا لولا لنگڑا کانا کترا خط ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ راقم الحروف متعدد بار لکھ چکا ہے اور اب پھر عرض کرتا ہے کہ ایک زوردار مہم ان ڈیزائنروں کے خلاف بھی شروع ہونی چاہیے۔ آخر کب تک اردو کے حامی مصنفین، ادبا، شعرا، یہ ستم دیکھتے رہیں گے اور چوں نہیں کریں گے۔

آج کل کی مطبوعات کے ٹائیٹل اور ڈسٹ کور اٹھا کر دیکھیے اور اسلاف کی محنتوں کی بربادی پر آنسو بہائیے۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ با من ہرچہ کرد آں آشنا کرد

("ہماری زبان"، دہلی، ۲۲؍ ستمبر ۱۹۸۴)

☆☆☆☆

محمد فخر الحق نوری

جاپان میں اردو ــــــ لغت نویسی کے تناظر میں

اس امر کو ایک مسلمہ حقیقت کا درجہ حاصل ہے کہ زبانیں تہذیبوں کی نمائندہ، امین اور آئینہ دار ہوتی ہیں۔ چنانچہ جیسے جیسے انسانی رابطہ لسانی رابطے کی طرف قدم بڑھاتا ہے، تہذیبوں کے مابین مکالمہ و معانقہ کے امکانات روشن ہونے لگتے ہیں۔ لیکن یہ سفر مرحلہ وار طے ہوتا ہے۔ شروع شروع میں تو لسانی رابطہ محدود سماجی ضرورتوں کے تحت محض بول چال پر انحصار کرتا ہے، مگر رفتہ رفتہ وسیع تر تہذیبی و ثقافتی دلچسپیاں اسے پڑھنے لکھنے کے دائرے میں داخل کر دیتی ہیں۔ تب باقاعدہ تعلیم و تدریس کے شعبے اور ادارے قائم ہوتے ہیں اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبان و ادب اور علوم و فنون کے مختلف و متنوع شعبوں میں لین دین کی روایتیں پروان چڑھنے لگتی ہیں اور اخذ و ترجمہ، تحقیق و تدوین، تنقید و تبصرہ، تحلیل و تجزیہ، حتیٰ کہ تخلیق و اختراع کے حوالے سے بھی، تسوید و تحریر کا متناہی سلسلہ جاری و ساری ہو جاتا ہے۔ اس پراسرار سفر کے تمام مرحلوں میں جو دو طرح کی علمی کاوشیں اپنی کلیدی اہمیت و افادیت کے باعث قدم قدم پر عامی و عارف اور مبتدی و منتہی، سب کے لیے اکتسابِ نور کا سامان فراہم کرتی ہیں، ان کا تعلق قواعدِ زبان کی ترتیب و توضیح اور فرہنگ سازی یا لغت نویسی کے ساتھ ہے۔

جاپان، جسے عصرِ حاضر میں اردو کے ایک اہم توسیعی منطقے کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، میں بھی مذکورہ زبان اور اس کے ادب کی ترویج و اشاعت کا ارتقائی سفر مرحلہ وار طے ہوا ہے اور اب وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے دامن میں بھی اردو کی مختلف و متنوع موضوعات و اسالیب کی حامل رنگا رنگ تصنیفات و تالیفات کا ایک وسیع و عریض ذخیرہ جمع ہو چکا ہے جس میں ایک قابلِ لحاظ حصہ کتبِ قواعد و کتبِ لغات کا ہے۔ یہ دونوں علمی حوالے اپنی اپنی جگہ خصوصی مطالعے کے مستحق ہیں تاہم فی الوقت مجھے جاپان میں فروغِ اردو کے لیے فرہنگ سازی یا لغت نویسی کے تناظر میں کی جانے والی کاوشوں کا تعارفی جائزہ پیش کرنے پر ہی اکتفا کرنا ہے۔

قارئین کے لیے یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ جاپان میں اردو سے متعلق اب تک ملنے والے قلمی آثار میں سب سے پرانا حوالہ بھی ایک لغت کا ہے جسے مخصوص کاروباری ضرورت کے تحت ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ کوئی ''اردو جاپانی'' یا ''جاپانی اردو'' لغت نہیں ہے کہ اسے براہِ راست اردو سے متعلق قرار دیا جا سکے بلکہ اردو کے ساتھ اس کا تعلق جزوی ہے اور یہ ہے بھی اس دور کی یادگار جس کے سو سال بعد بھی جاپان میں اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس کے شواہد نہیں ملتے۔ دراصل یہ ایک پنج زبانی لغت ہے جسے ۱۷۹۶ء میں ناگاساکی میں، وہیں کے ایک تاجر اور ترجمان گی گوزائے مان (Gigozaeman) نے مرتب کیا تھا۔ اس کی دریافت کا سہرا پروفیسر ناگاشیما کے سر ہے جن کا تحریر کردہ تعارفی مقالہ ''چند زبانوں کی لغت'' انٹرنیشنل اکنامک یونیورسٹی ناگاساکی کے جرنل، باب مارچ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا [1]۔ مذکورہ لغت کے عہدِ ترتیب میں ناگاساکی بیرونی دنیا سے رابطے کی واحد بندرگاہ تھی۔ وہاں مختلف علاقوں کے تاجروں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ گوگوزائے مان نے پانچ زبانوں، جاپانی، چینی، ویت نامی، پرتگیزی اور 'موز' زبان کے منتخب متبادل الفاظ جمع کر کے مذکورہ لغت ترتیب دینے کی ضرورت محسوس کی۔

جیسا کہ اشارہ کیا گیا، اگرچہ مذکورہ زبانوں میں سے بظاہر کسی زبان کے ساتھ بھی اردو کا کوئی قریبی رشتہ یا براہِ راست تعلق دکھائی نہیں دیتا، تاہم تاریخی حوالے سے 'موز' زبان کے ساتھ

اردو کی قرابت داری کا سراغ مل جاتا ہے۔ جہاں تک 'موز' (Moors) کی اصطلاح کا تعلق ہے، یہ املا اور تلفظ کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ دنیا کی مختلف زبانوں اور تہذیبوں میں مل جاتی ہے اور اس کا اطلاق خصوصی طور پر عربوں اور افریقیوں کے مختلف ممالک (مثلاً رومانیہ، ہسپانیہ، اندلس، موریطانیہ اور سری لنکا وغیرہ) میں منتقل شدہ اور عمومی طور پر مسلم آبادی کے مختلف گروہوں پر ہوتا رہا ہے[2]۔ ظاہر ہے کہ اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں گی گوزائے مان نے پنج زبانی لغت ترتیب دیتے ہوئے مسلم آبادی کے ایسے ہی کسی گروہ کی زبان کو 'موز' زبان کے طور پر منتخب کیا ہوگا۔ اس 'موز' زبان اور مذکورہ لغت میں شامل اس کے ذخیرۂ الفاظ کے حوالے سے ڈاکٹر تبسم کاشمیری رقم طراز ہیں:

> ''...... 'موز' زبان کا اشارہ اس زبان کی طرف ہے جو مغلیہ عہد میں برِصغیر کے شمالی حصے کے مسلمانوں میں بولی جاتی تھی۔ ظاہر ہے یہ زبان فارسی تھی۔ چناں چہ اس لغت میں تجارتی لین دین کے لیے مفید فارسی جملے اور ان کا ترجمہ درج کیا گیا ہے۔ حسنِ اتفاق سے لغت میں اردو الفاظ کا ایک مختصر سا ذخیرہ بھی دیا گیا ہے۔ جاپان میں اردو کے بارے میں اب تک ملنے والے آثار میں یہ سب سے پرانا حوالہ ہے[3]۔''

اگر چہ مذکورہ حوالہ تاریخی طور پر اولیت کا درجہ رکھتا ہے تاہم اردو لغت نویسی کے ضمن میں اس کی حیثیت ایک جزوی کاوش سے زیادہ کی نہیں ہے۔ دراصل قواعدِ زبان کی ترتیب و توضیح اور فرہنگ سازی یا لغت نویسی جیسے سنجیدہ علمی کاموں کی ضرورت اس وقت زیادہ شدت سے محسوس کی جاتی ہے جب کسی زبان کی تعلیم و تدریس کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ جاپان میں اردو کی تعلیم و تدریس کا باقاعدہ آغاز گی گوزائے مان کی پنج زبانی لغت کے سالِ ترتیب (۱۷۹۶ء) کے ایک سو بارہ برس بعد، ۱۹۰۸ء میں ''ٹوکیو اسکول آف فارن لینگویجز'' کے قیام سے ہوا۔ اس اسکول میں شعبۂ ہندوستانی بھی قائم کیا گیا جہاں آغاز میں ایک سالہ اور ۱۹۱۱ء سے تین سالہ کورس پڑھایا

جانے لگا۔ ابتدا میں (۱۹۰۹ء تا ۱۹۱۴ء) ہندوستان کے مشہور انقلابی رہنما مولوی برکت اللہ بھوپالی اردو پڑھاتے رہے۔ انھیں جاپان میں اردو کی تعلیم و تدریس کا بانی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اردو کے جاپانی استادوں میں اولین نام اینوئی کا بتایا جاتا ہے، جنھیں زیادہ شہرت حاصل نہ ہوسکی۔ وہ تین برس تک اس شعبے میں کام کرتے رہے۔ ان کے بعد سب سے اہم نام پروفیسر گامو رے اپچی کا ہے جو ۱۹۲۵ء میں اس شعبے سے منسلک ہوئے اور ایک طویل عرصے تک اردو کے لیے خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۳۶ء میں جاپان کی وزارتِ تعلیم نے انھیں ایک تعلیمی مشن پر برصغیر بھی بھیجا تھا۔ ان کا انتقال ۱۹۷۷ء میں ہوا[۴]۔

اس کے بعد جاپان میں اردو کی تعلیم و تدریس کے دو بڑے مراکز ”ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز“ اور ”اوساکا یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز“ میں لغت نویسی کے حوالے سے متعدد کاوشیں کی گئی ہیں۔ لیکن اولین کاوش اور ان کاوشوں کے مابین کم وبیش پونے دوسو سال کا زمانی فصل پایا جاتا ہے۔ یہ کاوشیں جاپان کے ”بابائے اردو“ پروفیسر گامورے اپچی (آنجہانی) کے شاگردانِ عزیز پروفیسر سوزوکی تاکیشی (آنجہانی) اور پروفیسر ہیروشی کان کاگایا کی مرہونِ منت ہیں۔ یہ دونوں حضرات ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز اور اوساکا یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ ان کی علمی و ادبی خدمات میں فرہنگ سازی یا لغت نویسی کا حوالہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ پہلے ہم اس ضمن میں پروفیسر سوزوکی تاکیشی کی خدمات کا جائزہ لیتے ہیں۔

پروفیسر سوزوکی تاکیشی (۱۹۳۲ء۔ ۲۰۰۵ء) کو بھی اپنے استاد پروفیسر گامورے اپچی کی طرح جاپان کے ”بابائے اردو“ کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اردو زبان و ادب کے لیے ان کی وقیع خدمات کے اعتراف میں انھیں حکومتِ پاکستان کی جانب سے ”ستارۂ امتیاز“ کا اعزاز بھی عطا کیا جاچکا ہے[۵]۔ لغت نویسی کے ضمن میں ان کی تین کتابیں شائع ہوچکی ہیں:

(۱) اردو کے ۱۵۰۰۔ بنیادی الفاظ: یہ ایک مختصر سا کتابچہ ہے جس میں طلبہ کی سہولت کے

لیے اردو کے پندرہ سو الفاظ کو ہجّی کے اعتبار سے ترتیب دے کر جاپانی زبان میں ان کے متبادل درج کر دیے گئے ہیں۔ یہ کتابچہ دائگا کوشورین ٹوکیو، جاپان سے ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔

(۲) اردو کے روزمرہ ۶۰۰۰ ۔الفاظ: چھے ہزار الفاظ پر مشتمل دائگا کوشورین سے ۱۹۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اس لغت کی ترتیب میں پروفیسر سوزوکی تاکیشی کو اپنے شاگردِ عزیز پروفیسر یوتا کا اسادا، جو بعدازاں ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز میں صدر شعبۂ اردو بھی رہے، کی معاونت حاصل رہی۔ اس لغت میں اردو الفاظ کے اندراج کے بعد تلفظ کی وضاحت کے لیے رومن حروف اختیار کیے گئے ہیں۔ پھر جاپانی زبان میں مفہوم دیا گیا ہے۔ یہ لغت بھی بنیادی طور پر طلبہ کی ضرورتوں کو مدِنظر رکھ کر ترتیب دی گئی ہے۔ پیش لفظ میں کی گئی وضاحت کے مطابق اس کے مآخذ یہ ہیں:

(i) پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور کی جماعت اول تا پنجم کی اردو کتب (ii) سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ حیدرآباد کی جماعت اول تا پنجم کی اردو کتب (iii) ابواللیث صدیقی۔ بنیادی اردو۔ کراچی: ۱۹۶۵ء (iv) ایم۔ اے خان۔ بنیادی ہندوستانی۔ الٰہ آباد: ۱۹۴۵ء (v): Minhajuddin.Dictionaryof Terms.Lahore ۱۹۶۵ء (ix) روزنامہ جنگ، کراچی، کے بعض شمارے (x) گامورے ایچی۔ اردو قواعد۔ ۱۹۶۰ء (xi) دوای کیویا۔ ہندی کی بنیادی لغت۔ ۱۹۷۵ء (xii) سوزوکی تاکیشی۔ اردو کے ۱۵۰۰ بنیادی الفاظ۔ ۱۹۷۸ء

(۳) جاپانی اردو لغت: دس ہزار الفاظ پر مشتمل یہ لغت دائگا کوشورین نامی اشاعتی ادارے ہی سے ۱۹۹۲ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ اس کی ترتیب میں بھی پروفیسر یوتا کا اسادا نے معاونت کی۔ اس لغت کی تیاری میں بھی بنیادی طور پر طلبہ کی ضرورتوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس میں جاپانی الفاظ درج کرنے کے بعد ان کا مفہوم اردو میں تحریر کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ جاپانی اردو لغت ہے تاہم اس لغت کی تیاری بھی اردو مآخذ کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔ یہ مآخذ مندرجہ ذیل ہیں (i) ابواللیث صدیقی۔ بنیادی اردو۔ کراچی: ۱۹۶۵ء (ii) ایم۔ اے خان۔ بنیادی ہندوستانی الٰہ آباد: ۱۹۵۴ء (iii) ۱۹۶۷ء M.A.Barker.A course in Urdu. Montreal:

(iv) گاموروے اپچی اردو قواعد۔ ۱۹۶۰ء (v) دوائی کیویا۔ ہندی کی بنیادی لغت۔ ۱۹۷۵ء (vi) سوزوکی تاکیشی۔ اردو کے ۱۵۰۰ بنیادی الفاظ۔ ۱۹۷۸ء (vii) T.G.Baily.Teach Yourself Urdu. London:۱۹۵۶ء (viii) روزنامہ جنگ، کراچی، کے بعض شمارے

(۴) اردو جاپانی لغت (زیرِ ترتیب): پروفیسر سوزوکی تاکیشی ایک جامع اردو جاپانی لغت تیار کرنا چاہتے تھے۔ اور وہ اس منصوبے پر خاصا کام کر چکے تھے، مگر موت نے انھیں مہلت نہ دی۔ اس منصوبے کی اطلاع دیتے ہوئے ۱۹۸۶ء میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے لکھا تھا:

> ”......ایک نئے منصوبے کے مطابق وہ بیس ہزار الفاظ کی لغت بنانے میں مصروف ہیں۔“[۶]

اس کے انیس بیس سال بعد سویامانے نے مذکورہ لغت کی عدمِ تکمیل کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھا:

> ”......وہ چند سال قبل سے اردو جاپانی لغت تیار کرنے میں مصروف رہے مگر افسوس کہ ۱۴۔ جنوری ۲۰۰۵ء کو چل بسے۔“[۷]

اب اس منصوبے کو پروفیسر سوزوکی تاکیشی کے ایک اور شاگرد اور ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز میں اردو کے استاد اور موجودہ صدرِ شعبہ پروفیسر ہاگیتا ہیروشی مکمل کر رہے ہیں۔ امید ہے یہ لغت جلد ہی اشاعت پذیر ہو جائے گی۔

پروفیسر سوزوکی تاکیشی کی طرح پروفیسر ہیروشی کان کاگایا (پیدائش: ۱۹۳۰ء) بھی بہت باکمال شخص ہیں۔ جاپان میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے انھوں نے بھی ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں جن کے اعتراف میں انھیں بھی حکومتِ پاکستان کی طرف سے ”ستارۂ امتیاز“ کا اعزاز عطا کیا جا چکا ہے۔ یہ اس اعتبار سے منفرد ہیں کہ انھیں دوسری جنگِ عظیم کے بعد حکومتِ جاپان کی طرف سے تہران یونیورسٹی ایران میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ یہ ۷۴۔۱۹۷۳ء میں ایک سال کے لیے اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور میں جاپانی زبان کی تدریس پر بھی مامور رہے ہیں[۸]۔ یوں تو انھوں نے مقدار اور معیار، دونوں اعتبار سے بہت وقیع

کام کیا تاہم ان کا ناقابل شکست کارنامہ ''اردو جاپانی لغت'' ہے جو ان کی سال ہا سال کی محنت و ریاضت کا ثمر اور زندگی بھر کی کمائی ہے۔ اسے جاپان میں اردو لغت نویسی کا نقطۂ عروج قرار دیا جاسکتا ہے۔

اردو جاپانی لغت دائگا کوشورین، ٹوکیو، جاپان، سے ۲۰۰۵ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ سولہ سو سے زائد (xiii+۱۵۹۲) صفحات پر مشتمل اس ضخیم لغت کی قیمت تریسٹھ ہزار (۶۳۰۰۰) جاپانی ین ہے جو ہمیں خاصی زیادہ محسوس ہوتی ہے تاہم جاپان میں علمی کتابوں کی قیمتیں بالعموم اسی طرح مقرر کی جاتی ہیں۔

اردو جاپانی لغت کا سرورق اس اعتبار سے جاذبِ توجہ اور مرتب کے لسانی شعور کا مظہر ہے کہ اس پر اردو کے دو سب سے بڑے مراکز، پاکستان اور بھارت کے قومی پرچم بنائے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں اس پر جہاں 'مرتبہ۔ ہیروشی کان کا گایا۔ پروفیسر ایمریطس، جامعہ اوساکا السنہ خارجہ' کے الفاظ مندرج ہیں وہیں، 'زیرنگرانی۔ پروفیسر ڈاکٹر تبسم کاشمیری'، کے الفاظ بھی درج کیے گئے ہیں جن سے علمی اعانت کے برملا اعتراف کے ضمن میں مرتب کی کشادہ دلی ظاہر ہوتی ہے۔ یاد رہے ڈاکٹر تبسم کاشمیری چوبیس سال (۱۹۸۱ء۔۲۰۰۵ء) تک اوساکا یونیورسٹی آف فارن اسٹڈیز میں وزٹنگ پروفیسر (اردو) کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔ اس لغت کا پیش لفظ '(صفحہ iii-ii) بھی ان ہی کا تحریر کردہ ہے۔ اردو میں لکھے گئے اس پیش لفظ کا جاپانی ترجمہ بھی شامل کتاب (صفحہ v-iv) ہے جو سویامانے نے کیا ہے۔ اس کے بعد مرتب کا لکھا ہوا مقدمہ (صفحہ xiii-vi) ہے جس میں سال ہا سال پر پھیلی ہوئی محنت و کاوش کے بیان اور اظہارِ تشکر کے علاوہ لغت سازی کے فن اور زیرِ نظر لغت میں اختیار کردہ طریقِ کار، طریقِ املا اور وضع کردہ علامات وغیرہ کے بارے میں نہایت اہم توضیحی نکات پیش کیے گئے ہیں۔ بعد ازاں لغت ہے جو پندرہ سو بانوے صفحات کو محیط ہے۔ آخر میں چند صفحوں پر مطبوعہ کتب کے اشتہار دیے گئے ہیں۔ ابتدائی تحریروں کا مطالعہ اور لغت کا مشاہدہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ لغت مرتب کے تصورِ لغت کا

عملی نمونہ ہے۔ اس شاندار کاوش کی متعدد امتیازی خصوصیات قابلِ ذکر ہیں۔

اس لغت کو مرتب کرتے ہوئے اگرچہ فرہنگِ عامرہ، جامع اللغات نور اللغات، فرہنگِ آصفیہ، فیروز اللغات، علمی اردو لغت، فارسی، عربی اور ہندی لغات پلیٹس (Platts) اور فیلن (Fallon) کے لغات اور محاورات، تلمیحات اور ضرب الامثال وغیرہ کی لغات کو بھی بطور مآخذ استعمال میں لایا گیا ہے، تاہم اس کی حقیقی بنیاد اس ذخیرۂ الفاظ پر رکھی گئی ہے جو مرتب نے کلاسکی ادب کا بالخصوص اور جدید ادب کا بالعموم مطالعہ کرنے سے سال ہا سال کی ریاضت کے نتیجے میں براہِ راست حاصل کیا ہے۔ یہ ذخیرۂ الفاظ اٹھارہ ہزار (۱۸۰۰۰) بنیادی الفاظ پر مشتمل ہے لیکن محاوروں، کہاوتوں اور ضرب الامثال وغیرہ اور سابقوں لاحقوں کی مدد سے بننے والے مرکبات کو شامل کرنے سے یہ تعداد پینتالیس ہزار پانچ سو (۴۵۵۰۰) تک جا پہنچی ہے۔ اس ذخیرۂ الفاظ کے حوالے سے ایک اور اہم پہلو لائقِ توجہ ہے جس کی طرف مرتب نے خود بھی اشارہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ اس میں پاکستان اور خصوصاً پنجاب میں مستعمل اردو کو بالخصوص پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اس کا ایک سبب تو نگران و رہنما ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا پاکستانی اور پنجابی ہونا بتایا گیا ہے لیکن اس کا حقیقی سبب اردو زبان و ادب کے فروغ کے سلسلے میں گزشتہ ایک صدی سے بھی پہلے سے پنجاب کو حاصل شدہ مرکزیت ہے۔ اسی طرح اس لغت میں انگریزی الفاظ کو بھی شامل کر لیا گیا ہے جو کثرتِ استعمال سے اردو کا حصہ بن چکے ہیں۔

جہاں تک اس لغت میں اختیار کی گئی ترتیب و تنظیم کا تعلق ہے تو اولاً لغت سازی کے لیے مروج الف بائی ترتیب میں ہر حرف کے نام کی وضاحت کے بعد اردو الفاظ درج کیے گئے ہیں۔ اس کے لیے خط نسخ / ٹائپ کو استعمال کیا گیا ہے۔ شاید اس کا مقصد جاپانیوں کے لیے حروف کی شناخت میں آسانی پیدا کرنا ہے۔ اردو الفاظ درج کرنے کے بعد، تلفظ کی وضاحت کے لیے انھیں بالالتزام لائبریری آف کانگریس (L.O.C) کے وضع کردہ متبادلات کے مطابق رومن رسم الخط (Roman Script میں) ڈھال دیا گیا ہے۔ پروفیسر سوزوکی تاکیشی کی مرتب کردہ لغات

میں بھی ایسا ہی کیا گیا ہے مگر زیرِ نظر لغت میں زیادہ صراحت اور باقاعدگی دکھائی دیتی ہے۔ بہرحال متذکرہ متبادلات یوں ہیں:-

آ	=	ā	ا	=	(٩)a, i, u	ب	=	b	بھ	=	bh
پ	=	p	پھ	=	ph	ت	=	t	تھ	=	th
ٹ	=	t	ٹھ	=	ṭh	ث	=	s̱	ج	=	j
جھ	=	jh	چ	=	c	چھ	=	ch	ح	=	ḥ
خ	=	k͟h	د	=	d	دھ	=	dh	ڈ	=	ḍ
ڈھ	=	ḍh	ذ	=	z̲	ر	=	r	ڑ	=	ṛ
ڑھ	=	ṛh	ز	=	z	ژ	=	zh	س	=	s
ش	=	sh	ص	=	ṣ	ض	=	z̤	ط	=	t̤
ظ	=	ẓ	ع	=	(١٠)ʻa, ʻi, ʻu	غ	=	g͟h	ف	=	f
ق	=	q	ک	=	k	کھ	=	kh	گ	=	g
گھ	=	gh	ل	=	l	لھ	=	lh	م	=	m
مھ	=	mh	ن	=	n	نھ	=	nh	ں	=	n̲
و	=	(١١)v, ū, o	ہ	=	h	ی	=	y	-ی	=	-ī
-ے	=	-e	-ے/-ئ	=	-ā						

الفاظ کے اندراج میں اس بات کا اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ اگر ایک لفظ، تلفظ یا املا کی ایک سے زائد صورتوں میں مستعمل ہے تو اسے ان تمام صورتوں میں لکھا گیا ہے۔ مثلاً خاموشی / خموشی / خامشی، مصالحہ / مسالا / مسالہ، دگنا / دوگنا / دونا، سرمہ / سرما، صوفیا / صوفیہ۔ اسی طرح بعض اشیا کی توضیح کرتے ہوئے ثقافتی (Cultural) حوالے بھی درج کیے گئے ہیں۔ مثلاً قہوہ کی ذیل میں پشاوری اور کشمیری قہووں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ الفاظ کو اردو اور رومن میں لکھنے کے بعد ان کے لسانی مآخذ کی نشان دہی کی گئی ہے۔ مختلف زبانوں کے لیے اختیار کی گئی رومن علامتوں کی تفصیل یہ ہے: عربی =A، انگریزی =E، پرتگیزی =Po، فارسی / دری / تاجیک =P، سنسکرت =S، ترکی =T، لسانی ماخذ کی نشاندہی کے بعد صرف ونحو کے اصولوں اور زبان کے قاعدوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اسم، فعل، حرف، ان کی قابلِ ذکر اقسام، کلمہ، مہمل، مذکر، مؤنث، واحد، جمع، روزمرہ محاورہ، ضرب المثل، کہاوت، سابقہ، لاحقہ، مترادف، متضاد اور ایسے ہی بہت سے پہلوؤں کے حوالے سے مفرد الفاظ و مرکبات کی حیثیت بتائی گئی ہے۔ معروف و مقبول شخصیات کے ناموں، مثلاً اقبال، فیض اور راشد وغیرہ کی عمومی اور خصوصی یعنی اسم نکرہ اور اسم معرفہ دونوں حوالوں سے

صراحت کا اہتمام کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ تخلص، مصرعے اور بیت وغیرہ کے لیے مستعمل علامات کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے اور یہ سب کچھ اردو جاپانی دونوں زبانوں میں بتایا گیا ہے۔ لائقِ تحسین بات یہ ہے کہ لغت میں نہ صرف اس ترتیب کو ہر جگہ قائم رکھا گیا ہے بلکہ توضیحات کے لیے جو اشارات و علامات (مثلاً خطوط وحدانی کی مختلف قسمیں اور نقطے وغیرہ) شروع میں متعین کر دی گئی ہیں، انھیں آخر تک بغیر کسی تبدیلی کے یکساں طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے مؤلف کی باریک بینی اور مستقل مزاجی کا پتا چلتا ہے۔

پروفیسر کان کاگایا کی لغت کا سب سے اہم اور ممتاز وصف یہ ہے کہ انھوں نے اردو الفاظ و مرکبات کے جاپانی زبان میں مطالب و معانی درج کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ اردو نظم و نثر سے استعمال کی مثالیں اور سندیں بھی تحریر کی ہیں۔ تحقیق کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے امثلہ و اسناد کے ماخذ کا حوالہ بھی بالالتزام دیا گیا ہے اور پھر جاپانی زبان میں مثالوں کی توضیح بھی کر دی گئی ہے۔ مؤلف کی شبانہ روز محنت قابلِ داد ہے کہ انھوں نے امثلہ و اسناد کی تلاش میں درد، نظیر، میر حسن، انیس، مصحفی، آتش، نسیم، غالب، امیر مینائی، داغ، حسرت، اقبال، چکبست، فیض وغیرہ کے مصرعے اور نثر نگاروں میں میر امن، حیدر بخش حیدری، فرحت اللہ بیگ، نذیر احمد، سر سید احمد خان، شبلی نعمانی، غالب، محمد حسین آزاد، پریم چند، حسن نظامی، علی عباس حسینی، آغا حشر، منٹو وغیرہ کے جملے دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے پروفیسر کان کاگایا نے لغت سازی کے دائرے کو مثبت انداز میں بہت وسعت عطا کر دی ہے۔ انھوں نے محض لغوی معانی درج کرنے کے بجائے مختلف الفاظ کے تہذیبی و ثقافتی سطح پر لیے جانے والے مطالب بھی بیان کیے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ مؤلف نے غالب کے مندرجہ ذیل اشعار کی روح کو سمجھتے ہوئے لغت سازی کی ہے تو بے جا نہ ہوگا:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام

چلتا نہیں دشنہ و خنجر کہے بغیر

اس ضمن میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے مؤلف کو داد دیتے ہوئے بجا طور پر لکھا ہے:

> ''اگرچہ لغت ادب اور تہذیب و ثقافت کی کتاب نہیں ہے، مگر یہ حسنِ اتفاق ہے کہ زیرِ نظر لغت میں اردو کے کلاسیکی ادب سے جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ برصغیر پاک و ہند کی ہزار سالہ تہذیب و ثقافت کی عکاس نظر آتی ہیں۔ اس جائزے سے یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی ہے کہ لفظ لغوی معنی کے ساتھ ساتھ کس طرح سے نہایت خاموشی کے ساتھ اپنے تہذیبی مظاہرے کے رنگ بھی پیش کرتے ہیں اور کسی قوم کی روح کے مظہر بن جاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اردو کی کوئی دوسری لغت مشکل ہی سے اس لغت کی مثال پیش کرتی ہے''۔ ۱۲

اور اب آخر میں مجھے یہ کہنا ہے کہ لغت سازی کی یہ سب کاوشیں جاپان میں فروغِ اردو کے حوالے سے مستقل نقوش کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان سے اردو کا کلاسیکی اور جدید ذخیرۂ الفاظ منضبط صورت میں محفوظ ہو گیا ہے۔ اس ضمن میں پورے اردو دان طبقے کو جاپانی اسکالرز کا احسان مند ہونا چاہیے۔

(بازیافت، شمارہ ۲۰، جنوری۔ جون ۲۰۱۲ء،
پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور)

حواشی:

(تمام حواشی فخر الحق نوری صاحب کے قلم سے ہیں)

(۱) بحوالہ: ڈاکٹر تبسم کاشمیری۔ جاپان میں اردو۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۴۔ ۵

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے: (i) http://en.wikipedia.crg/wiki/moors.

(ii) اردو دائرۂ معارف اسلامیہ۔ جلد ۲۱، لاہور: پنجاب یونیورسٹی،

۱۹۸۷ء۔ ص۱۵۷۔ ۱۶۶

(۳) جاپان میں اردو۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔ ص ۹

(۴) ایضاً

(۵) پروفیسر سوزوکی تاکیشی کی دلکش شخصیت اور بلند پایہ علمی و ادبی کارناموں کا اجمالی جائزہ لینے کے لیے

ڈاکٹر معین الدین عقیل کا مضمون ''سورج کے دیس میں اردو کا چاند'' مشمولہ، دریافت۔ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد: شمارہ ۲، ۲۰۰۳ء۔ ص ۶۳۷۔ ۶۵۷ ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

(۶) جاپان میں اردو۔ اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء۔ ص ۹

(۷) سویامانے۔ ''جاپان میں اردو زبان و ادب کا فروغ''۔ مشمولہ، ادب عالیہ، انٹرنیشنل۔ وہاڑی: جلد ۲، شمارہ ۱

جنوری تا مارچ ۲۰۰۶ء۔ ص ۱۱۸

(۸) پروفیسر ہیروشی کان کاگایا کے بارے میں مزید جاننے کے لیے سویامانے کا محولہ بالا مضمون دیکھا جا سکتا ہے۔

(۹) مثلاً اَب = ab اِس = is اُن = un

(۱۰) مثلاً عَبد = abd عِبادت = ibadat عُثمان = usman

(۱۱) مثلاً ورق = varaq خون = khun خوف = khof

(۱۲) ڈاکٹر تبسم کاشمیری۔ ''پیش لفظ'' مشمولہ، اردو جاپانی لغت۔ مرتبہ، ہیروشی کان کاگیا۔ ٹوکیو: دائگا کوشورین، ۲۰۰۵ء۔ ص ۱۱۱

☆ ☆ ☆ ☆

شبلی نعمانی

لغتِ فُرس

از

اسدی طوسی

ہم یورپ کی علمی فیاضیوں کا شکریہ ادا کرتے کرتے تھک جاتے ہیں لیکن یورپ اپنی فیاضیوں سے نہیں تھکتا۔ عربی قدیم نادر تصنیفات کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کرنے اور ان کے شائع کرنے کا ذکر الندوہ میں بار بار آ چکا ہے۔ اب موقعہ ہے کہ فارسی سرمائے کے مہیا کرنے کے متعلق جو کچھ یورپ کر رہا ہے کبھی کبھی اس کے حالات بھی اس علمی پرچے کے ذریعے سے شائع کیے جائیں۔

اسدی کی نسبت عام تذکروں میں مذکور ہے کہ فردوسی کا استاد تھا۔ اگرچہ یہ غلط ہے لیکن بہرحال وہ اسی زمانے کا نہایت مشہور شاعر ہے اور مثنوی میں نظامی کی طرز پر بنیاد اسی نے قائم کی۔ اسدی کو تمام دنیا صرف شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے، یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ شاعر نہیں بلکہ فارسی لغت کا سب سے پہلا مدوّن ہے۔ اس نے اپنی کتاب کا نام لغتِ فُرس رکھا ہے اور

صرف نادر اور غریب الفاظ جمع کیے ہیں۔

یورپ کے ایک مشہور مستشرق پاول ہارن نے آٹھ برس کتاب کی تصحیح و تحشیہ میں صرف کیے اور ۱۸۹۷ء میں اس کو شائع کیا۔ اس کے پاس جو قلمی نسخہ تھا وہ محرم ۷۳۳ھ کا لکھا ہوا تھا۔ تصحیح و تحشیہ کے علاوہ اس نے ایک مطول دیباچہ بھی لکھا ہے۔ لیکن چوں کہ وہ جرمن زبان میں ہے اس لیے ہم اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ ایڈیٹر موصوف نے یہ کتاب پروفیسر نولدکی کے نام معنون کی، جو یورپ میں آج تمام مستشرقین کا استاد الکل تسلیم کیا جاتا ہے، چونکہ ایڈیٹر کو پروفیسر موصوف کی شاگردی کی عزت حاصل ہے، چند فارسی اشعار لکھ کر شامل کیے ہیں جس میں انتساب کو ظاہر کیا ہے، وہ اشعار یہ ہیں:

چنین بود آئینِ ایرانیاں
چو پیش آمدندے بہ گاہِ کیاں
تو در دولت علم داری دہیم لے
شہنشاہ عالی وما بندہ ایم
ولیکن بجز کے تو ہم مردمی
کہ مر مہتری رابزیبد ہمی
بدیں ہشت سال اندریں شہرِ تو
طلب کردہ ام علم باجستجو
کنون ایں کتابِ تشکر شعار
ترا باشد از من یکے یادگار

اب ہم اصل کتاب پر مختلف حیثیتوں سے نظر ڈالتے ہیں۔

(۱) مصنف نے دیباچے میں لکھا ہے کہ ”میں اس میں بلخ، ماورالنہر اور خراسان وغیرہ کی لغات لکھتا ہوں۔“ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانے میں ان ہی ملکوں کے لوگ شاعر اور ناشر

تھے اور ان ہی کا کلام مستند سمجھا جاتا تھا۔ اس سے یہ عقدہ بھی حل ہوتا ہے کہ قدما کی زبان جو بالکل نامانوس معلوم ہوتی ہے اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ افغانستان اور ترکستان کے بہت سے الفاظ ان کے کلام میں آئے تھے جو اس وقت بالکل متروک ہو گئے جب شاعری منتقل ہو کر فارس کے صدر مقام میں آ گئی۔

(۲) مصنف نے التزام کیا ہے کہ ہر لغت میں شعر کی سند لائے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ چونکہ مصنف خود قدیم زمانے کا شاعر ہے اس لیے ایسے بہت سے قدما کا کلام اس ذریعے سے محفوظ رہ گیا جو آج بالکل معدوم ہیں۔ مثلاً لبیبی، ابوطاہر خسروانی، منجیک، طیان، کسائی، آغاجی، شاکر بخاری، قریع الدہر، بوشکور بلخی، ابوالفتح لبتی، معروفی، بوالمثل، عمارہ مروزی مرضی، نشناس۔ مشہور ہے کہ مثنوی سب سے پہلے رودکی نے لکھی، یعنی کلیلہ دمنہ کو مثنوی کی بحر میں نظم کیا۔ فردوسی نے شاہ نامہ میں اس مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ لیکن آج یہ مثنوی بالکل نایاب ہے کہ اس کے دو چار شعر بھی ہاتھ نہیں آتے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مثنوی مولانا روم کے وزن پر ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

دمنہ را گفتا کہ تا ایں بانگ چیست
بانہیب و سہم این ادائے کیست
دمنہ گفت آہ راجزیں آواد گر
کارِ تو نہ؟ ہست و سہبے بیشتر
آب ہرچہ بیشتر نیرد کند
بند روغ ست بودہ بفکند
دل گسستہ داری از بانگِ بلند
رنجکے باشدت و آوازِ گزند

اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ رودکی نے شاہ نامہ کی بحر میں بھی ایک مثنوی لکھی

تھی۔ اس کا ایک شعر یہ ہے:

نکو گفت مزدور با آں خدلیش
زوجہ
مکن بد بہ کس گر نہ خواہی بہ خولیش

عنصری کے تذکرے میں اس کی مثنویوں کا بھی ذکر کرتے ہیں مگر لکھتے ہیں کہ اب ناپید ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ عنصری نے مختلف بحروں میں مثنویاں لکھی تھیں۔ شاہ نامہ کی بحر میں یہ اشعار ہیں:

چو بر گشتۂ غنچۂ سرخ گل
جہاں جامہ پوشید ہم رنگِ مل

(بہاریہ)

اگر بر سرِ مرد بذد در نبرد
سرِ قامتش با زمیں پست کرد

(رزمیہ)

ہفت پیکر کی بحر میں جو مثنوی ہے زیادہ صاف اور شستہ ہے نمونہ یہ ہے،

گفت کیں مردمان بے باک اند
ہمہ ہموارہ دزد و چالاک اند

(۳) عام طور پر مشہور ہے کہ فردوسی نے یہ التزام کیا تھا کہ عربی الفاظ نہ آئیں۔ لیکن اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے تک عربی الفاظ فارسی مثنوی میں یوں بھی کم برتے جاتے تھے۔ عنصری، رودکی، ابوشکور کی مثنویوں کے اشعار کثرت سے نقل کیے ہیں۔ ان میں بھی عربی الفاظ بہت ہی خال خال ہیں۔

(۴) ہمارا خیال تھا کہ ہزالی اور فحش گوئی، اس زمانے تک مطلق پیدا نہیں ہوئی تھی۔ فردوسی نے ہجو لکھی تو اس قدر مہذب اور شائستہ لکھی کہ مستورات کو اس کے پڑھنے میں تامل نہیں ہو سکتا۔

لیکن اس کتاب سے معلوم ہوا کہ یہ بلا[۱] اسی زمانے میں پیدا ہو چکی تھی۔ لبیبی جو اس زمانے کا ممتاز شاعر ہے جعفر زٹلی سے ذرہ بھر کم نہیں۔ بوشکور اور منجیک بھی اکثر فحش کہتے ہیں۔ فردوسی اور فرخی وغیرہ اس زمانے کے عام شاعر نہیں بلکہ مہذب شاعر ہیں۔ اگرچہ یہ یقینی ہے کہ یہ کتاب اسدی طوسی کی تصنیف ہے۔ مصنف نے خود ایک لغت کی سند میں اپنا نام لکھا ہے اور اس کے ساتھ مصنف کا لفظ اضافہ کیا ہے۔ لیکن یہ سخت تعجب ہے کہ کتاب میں جابجا معزی کے اشعار ہیں حالانکہ معزی سنجر کے زمانے کا شاعر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ الحاقی اشعار ہیں۔ یعنی کسی نے بطور حاشیہ کے لکھے تھے جو کتاب میں شامل ہو گئے۔

ایڈیٹر نے دیباچے میں کسی کتاب کی عبارت نقل کی ہے جس کے یہ الفاظ ہیں:

''تصنیف حکیم اسدی خواہر زادہ حکیم ابوالقاسم منصور فردوسی رحمۃ اللہ علیہ'' اگر یہ نقل صحیح ہو تو اسدی کی فہرست مفاخر میں یہ اضافہ ہو جاتا ہے کہ وہ فردوسی کا بھانجا تھا۔ یہ بھی کچھ کم تعجب کی بات نہیں کہ ایک ہی شہر اور ایک ہی خاندان میں دو شاعر اس رتبے کے پیدا ہوں کہ اقلیم سخن ان ہی دونوں میں تقسیم ہو کر رہ جائے۔

دوبارہ ہم پاول ہارن صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہیں جن کی بدولت ایسی نایاب اور گم شدہ کتاب بہم پہنچی اور شائع ہوئی۔

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت یادگار

(مقالاتِ شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی،
نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۸۹ء)

حاشیہ

(۱) شاید ریہیم کی تخفیف ہے۔ (شبلی)

قاضی عبدالودود

مجمع الفرس

معاصر حصہ ۱۳ص اسروری کے بروزن ضروری ہونے کے ثبوت میں کسی ایک کا شعر پیش ہوا ہے۔ یہ خود اس کتاب سے بھی ثابت ہے، دیباچے میں ہے:

کرد توفیق چو داد اتمامش
مجمع الفرس سروری نامش

ڈاکٹر نذیر احمد ایک طویل بحث کے بعد سروری کے ورودِ ہند کے متعلق اس نتیجے پر پہنچے ہیں: ''اگر برٹش میوزیم کے متذکرۂ بالا نسخے کی تاریخ ۱۰۳۶ھ قطعی ہے تو سروری کے اس سنہ میں ہندوستان چلے آنے میں شبہ نہیں، لیکن اگر یہ تاریخ مشتبہ ہے تو دوسرے مآخذ کی روایت پر اعتماد کرتے ہوئے اس کا ورودِ ہند ۱۰۳۸ھ کے بعد فرض کرنا پڑے گا''

انھوں نے ریو کی فہرست سے مجمع الفرس کے ایک نسخے کی جو عبارت نقل کی ہے، اس میں کئی جگہ الفاظ کے بدلے نقطے ہیں۔ یہ عبارت یدِ بیضا مصنفہ آزاد بلگرامی (نسخۂ خدا بخش، ترجمۂ سروری) میں اس طرح ہے: ''نمقتہ بتاریخ ثامن عشر ربیع الثانی ۱۰۳۶؁ و انا مولف ہذا الکتاب و ناظم ہٰذہ الابیات مخلص ارباب المعانی سروری الکاشانی فی دار الخلافتہ لاہور صانہا اللہ عن الفتور۔''

آزاد لکھتے ہیں کہ یہ ''پایانِ عُمر'' میں ہند آئے۔ ان کی لغت میں اغلاط بہت ہیں، صاحبِ فرہنگِ رشیدی نے ان پر اعتراض کیے ہیں۔ ''یک نسخۂ فرہنگش پیشِ ماہست کہ بر حواشی آں

الحاقاتِ بسیار بخطِ مصنف مرقوم است و در آخرِ نسخہ قریب یک صفحہ ابیاتِ خود را تسوید نمودہ کہ ایں رباعی از آں جملہ است، بے است طلب بدامن پیر زدن الخ۔“

عبارتِ سروری کے لاہور میں ۳۶ھ میں لکھے جانے سے ہے [کذا] تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ سروری اسی سال ہندوستان آئے۔ ممکن ہے اس سے کچھ قبل آئے ہوں۔ مجمع الفرس کی دو روایتیں کتب خانۂ خدا بخش میں ہیں، دوسری کے صفحات ہندسوں سے خالی ہیں، اس لیے یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ مقابلتاً اس میں کتنے صفحات زیادہ ہیں۔ ظاہراً دوسری کی ضخامت پہلی سے دونی ہے۔

ص ۲۰، ایک خاص چیز یہ ہے کہ بعض الفاظ کئی طرح پر لکھ دیے گئے ہیں، دوسرے فرہنگ نگاروں نے بھی یہ کیا ہے اور فرہنگ نگار کا فرض کہ الفاظ کی جتنی شکلیں ہوں، سب کو درجِ فرہنگ کرے۔ اس فرہنگ کا عیب یہ ہے (دوسرے فرہنگ نگار بھی اس سے بری نہیں) کہ وہ الفاظ بھی دیے ہیں جو تصحیف سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے اندراج میں مضائقہ نہ تھا، مگر ساتھ ساتھ یہ بتانا تھا کہ حقیقت کیا ہے۔ یہ اس نے کیا ہے تو بہت کم۔

میں نے اپنی کسی تحریر میں کسی فہرست کے حوالے سے لکھا تھا کہ مجمع الفرس ایران میں طبع ہو چکی ہے، لیکن بعد کو ایرانیوں سے اس کے متعلق دریافت کیا تو کوئی شخص ایسا نہیں نکلا جو اس سے واقف ہو۔ فہرست نگار کا بیان غلط معلوم ہوتا ہے۔

ص ۳، ”کوئی اس (سروری) کے بزرگوں میں سے کاشان سے آیا ہوگا ورنہ مثل غالب کے ہندوستان زا ہے“ یہ بات بقول مہیش پرشاد مرحوم غالب نے مؤید برہان کے حاشیے میں لکھی تھی۔ اس کتاب کے رد میں جو کتاب غالب کے قلم سے نکلی ہے، اس کا نام تیغِ تیز ہے، اس میں ایک لفظ بھی سروری کے وطن کے متعلق نہیں، حالانکہ طالب کا یہ دعویٰ تھا کہ ایرانیوں نے فرہنگ نہیں لکھی، تو اس کی تردید کرنی تھی کہ سروری کاشانی ہے۔

ص ۲۴، سروری کو ”گلستاں کا عربی مترجم تسلیم کیا ہے“ یہ صرف ترجمہ نہیں، شرح بھی ہے۔ اس کا ایک نسخہ کتب خانۂ خدا بخش میں موجود ہے۔

(معاصر حصہ ۱۴)

(منقولہ زبان شناسی، خدا بخش اورینٹل لائبریری، پٹنہ، ۱۹۹۵ء)

آغا افتخار حسین

کرنل سر ہنری یول

اور

اس کی اردو فرہنگ ہابسن جابسن

(HOBSON.JOBSON)[۱]

اردو زبان کی سب سے پہلی لغت ایک فرانسیسی مشنری فرانسسکو ماریا دوتور نے سترھویں صدی میں لکھی۔ اس کے بعد اردو زبان کی کئی لغات لکھی گئیں لیکن کرنل سر ہنری یول کی ''ہابسن جابسن'' اشتقاق کے نقطۂ نظر سے غالباً اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے بلکہ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ الفاظ کے مآخذ اور معانی کے ارتقا پر جس انداز سے اس کتاب میں مواد جمع کیا گیا ہے اس کی مثال اردو زبان میں مشکل ہی سے ملے گی۔ اس فرہنگ[۲] میں اردو (یا ہندی) وغیرہ کے وہ الفاظ شامل ہیں جو انگریزوں اور دوسری مغربی قوموں کے ہندوستان کے ساتھ تجارتی اور سیاسی روابط کی وجہ سے بعض مغربی زبانوں میں داخل ہو گئے ہیں یا مغربی زبانوں سے اردو (یا

ہندی) زبانوں میں آ گئے ہیں۔ ۸۷۰ صفحات کی اس فرہنگ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مصنفین نے نہ صرف ان الفاظ کے اشتقاق پر اظہار رائے کیا ہے بلکہ سند کے طور پر مغربی اور مشرقی زبانوں کی تحریروں کے حوالے دیے ہیں اور ان کے ساتھ جو تاریخیں دی گئی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تحقیق کے لیے مصنفین نے متعدد زبانوں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، پرتگیزی، ولندیزی، یونانی، عربی، فارسی، سنسکرت وغیرہ کی کوئی دو ہزار سال کی تحریروں سے استفادہ کیا ہے۔ تعجب ہے کہ اس اہم تحقیقی کارنامے پر ابھی تک پاک و ہند کے دانشوروں نے خاطر خواہ توجہ نہیں دی۔ اس کتاب میں الفاظ کے اشتقاق کے بارے میں جو نظریے بیان کیے گئے ہیں اگر متخصصین ان سے استفادہ یا ان پر تنقید فرمائیں تو زبان کی اہم خدمت ہوگی۔ اس مضمون میں اس کتاب اور اس کے مصنف کا مختصر تعارف کرایا جائے گا۔

یول کے حالاتِ زندگی

یہ کتاب دو مؤلفین کی کاوش کا نتیجہ ہے، کرنل سر ہنری یول اور آرتھر کوک برنل (Arthur Coke Burnell)۔ الفاظ پر بیشتر تحقیق یول ہی کی ہے اور کتاب کا دیباچہ اور مقدمہ بھی اس نے ہی لکھا ہے۔ ہنری یول ۱۸۲۰ء میں ایڈنبرا (برطانیہ) کے قریب بہ مقام انورسیک (Inversek) پیدا ہوا۔ اس کے والد میجر ولیم یول (پیدائش ۱۷۶۴ء، وفات ۱۸۳۹ء) ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں تھے اور مشرقی زبانوں پر اچھی نظر رکھتے تھے اور وہ جب ۱۸۰۹ء میں ریٹائر ہو کر وطن واپس گئے تو کئی عربی اور فارسی مخطوطات اپنے ساتھ لے گئے جو اب برٹش میوزیم میں ہیں۔ انھوں نے ۱۸۳۲ء میں کتاب ”Apophthegms of 'Ali' the son of Abu Talib“ ؁ شائع کی جس میں عربی متن، اس کا قدیم فارسی ترجمہ اور خود میجر یول کا کیا ہوا انگریزی ترجمہ شامل ہے۔

’ہابسن جابسن‘ کے مؤلف ہنری یول نے ابتدائی تعلیم ایڈنبرا میں اور اعلیٰ تعلیم کیمبرج میں حاصل کی۔ ریاضی اور انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کر کے ہنری یول ۱۸۴۰ء میں بنگال کی

انجینئرنگ سروس میں شامل ہو گیا۔ تین سال ملازمت کرنے کے بعد یول مختصر قیام کے لیے انگلستان واپس گیا اور وہاں شادی کر کے واپس ہندوستان آ گیا جہاں اس نے ۱۸۴۹ء تک شمال مغربی سرحدی صوبے کے محکمۂ نہر میں انجینئرنگ کی بیش بہا خدمت انجام دیں۔ اس دوران میں اس نے سکھوں کی لڑائیوں میں حصہ لیا۔ ۱۸۴۹ء سے ۱۸۵۱ء تک یول رخصت پر انگلستان میں رہا اور اس دو سال میں اس نے اسکاٹ لینڈ کی ملٹری اکیڈمی میں لیکچر دیے اور انجینئرنگ اور معاشرتی موضوعات پر کتابیں اور مقالے لکھے۔ اس کے بعد وہ پھر ہندوستان آ گیا اور ۱۸۵۵ء میں گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے محکمۂ تعمیرات میں انڈر سیکریٹری کے عہدے پر اس کا تقرر کر دیا۔ کچھ عرصے کے لیے یول ایک سفارتی عہدے پر برما گیا اور وہاں سے آ کر اس نے برما کے بارے میں ایک مقالہ لکھا جو بہت مقبول ہوا۔ ۱۸۶۲ء میں یول ملازمت سے ریٹائر ہو گیا۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں (اور غالبا ہم مشرقیوں کے لیے ایک اچھی مثال ہے) کہ یول کی سب سے زیادہ پہلودار اور علمی زندگی کا آغاز اس کے سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد ہوتا ہے۔ ۱۸۶۳ء میں یول نے سسلی کے دارالخلافے پالرمو میں سکونت اختیار کی جہاں اس نے قدیم اطالوی مشنریوں اور سیاحوں کے سفرناموں اور تاریخوں کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ اسی سال اس نے ''مشرق کے عجائبات'' نامی ایک کتاب شائع کی۔ ۱۸۶۶ء میں یول نے قدیم سیاحوں کے سفرناموں، خطوط اور یادداشتوں پر مشتمل ایک کتاب دو جلدوں میں شائع کی جس میں ایشیا کے بارے میں معلومات کا ایک خزانہ پیش کیا اور زمانۂ قدیم میں چین اور مغربی ممالک کے روابط پر بھی روشنی ڈالی۔ اسی سال اس کی فرہنگ 'ہابسن جابسن' شائع ہوئی جس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۰۳ء میں شائع ہوا اور تیسرا ایڈیشن حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ ۱۸۷۱ء میں یول نے مارکو پولو کا مشہور ایڈیشن شائع کیا جس پر اسے اٹلی کی جیاگرافیکل سوسائٹی کا نقرئی تمغا ملا اور اس کے بعد رائل جیاگرافیکل سوسائٹی کا تمغائے تاسیس پیش کیا گیا۔ اس کتاب کے کئی

ایڈیشن انگلستان اور فرانس میں شائع ہو چکے ہیں۔

۱۸۷۵ء میں یول واپس انگلستان آ گیا اور انڈین کونسل کا رکن مقرر ہوا اور آخر دم تک اس حیثیت سے کام کرتا رہا۔ ۱۸۸۷ء میں اس نے Diary of Sir William Hedges شائع کی جس میں قدیم اور جدید ایسٹ انڈیا کمپنی کے بعض دلچسپ کوائف شامل ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برتانیکا اور انگلستان کے متعدد علمی جرائد میں جغرافیہ اور سوانح کے موضوعات پر اس کے تحقیقی مضامین شائع ہوئے۔ ۱۸۸۸ء میں اس نے مشرقی تبت اور برما کے دریاؤں کے بارے میں ایک نہایت دلچسپ مضمون شائع کیا۔ ۱۸۸۹ء میں یول کو 'سر' کا خطاب اور ستارۂ ہند کا اعزاز ملا اور اسی سال اس کا انتقال ہو گیا۔

کتاب کا مختصر جائزہ:

جیسا کہ کتاب کے نام سے ظاہر ہے، یہ فرہنگ ان الفاظ اور محاورات وغیرہ پر مشتمل ہے جو ہندوستان میں انگریزوں کی بول چال میں شامل ہو چکے تھے۔ لیکن مصنفین نے محض ان الفاظ اور محاورات کے مطالب اور محل استعمال ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا (جیسے اس قسم کے اکثر لغات اور فرہنگوں میں کیا گیا ہے) بلکہ بیشتر الفاظ پر اشتقاق تاریخ، جغرافیہ وغیرہ کے نقطۂ نظر سے مدلل بحثیں کی گئی ہیں۔ سرورق کے بعد دوسرے صفحے پر مصنف نے اس کتاب کو نہایت عقیدت کے ساتھ اپنے مرحوم بھائی کے نام معنون کیا ہے اس کے بعد چار صفحوں کا دیباچہ ہے۔ اس دیباچے میں یول نے بتایا ہے کہ اس کتاب کی بنیاد وہ خط کتابت تھی جو پالرمو (سسلی) کے دوران قیام میں یول اور اس کے ایک مرحوم دوست آرتھر برنل کے درمیان ہوئی۔ برنل اس زمانے میں مدراس کی سول سروس میں عدلیہ کے عہدوں پر فائز تھا۔ یول سے برنل کی ملاقات ۱۸۷۲ء میں انڈیا آفس لائبریری میں ہوئی تھی۔ برنل نے بتایا تھا کہ وہ 'اینگلو انڈین'' الفاظ کی ایک فرہنگ تیار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یول نے اس مطلع کیا کہ وہ بھی اسی قسم کی فرہنگ تیار کر رہا ہے۔ اس کے بعد ان دونوں میں خط کتابت شروع ہوئی جو ۱۸۸۲ء

میں برنل کی وفات تک جاری رہی۔ اس عرصے میں دونوں دوستوں نے الفاظ کے بارے میں معلومات فراہم کیے۔ معانی و اشتقاق کے بارے میں خیالات کا تبادلہ کیا۔ برنل کے انتقال کے بعد اس فرہنگ کی تدوین کا سلسلہ یول نے تنہا جاری رکھا۔ یول نے لکھا کہ گو اس پوری کتاب کا بیشتر حصہ صرف یول ہی کی کاوش کا نتیجہ ہے لیکن برنل نے جو مواد بھی فراہم کیا وہ نہایت بیش قیمت تھا اور غالباً یول کی دسترس سے باہر تھا۔

کتاب کے عنوان 'ہابسن جابسن' کے بارے میں یول وضاحت کرتا ہے کہ 'ہابسن جابسن' [۵] کے الفاظ ہندوستان میں انگریزوں کی زبان میں داخل ہو چکے تھے، گو اب وہ اتنے عام نہیں ہیں۔ ان الفاظ کو یول کتاب کے عنوان کے لیے بہت موزوں سمجھتا ہے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ ان دو ناموں (حسن حسینؓ) میں کتاب کے دو مصنفوں (یول اور برنل) کی طرف اشارہ ہے۔ اس کا عقیدہ ہے کہ اس کتاب کا اس کے سوا کوئی دوسرا نام نہیں ہو سکتا۔ [۶]

اس کے بعد فہرست مضامین ہے اور پھر مقدمہ شروع ہوتا ہے جو دس صفحوں میں ہے۔ اس میں یول پہلے ہندوستانی الاصل الفاظ کے انگریزی زبان میں داخل ہو جانے کی مختصر تاریخ بیان کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ ملکۂ الزبتھ اول اور شاہ جیمز کے زمانے سے یہ الفاظ انگریزی زبان میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انگریزی زبان میں ہندوستانی الفاظ کی آورد کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس کے بعد یول نے ان الفاظ کی مثالیں دی ہیں جو مختلف مدارج میں انگریزی زبان میں داخل ہوتے گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزی زبان میں بعض الفاظ ایسے آ گئے ہیں جن کے بارے میں یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی اصل ہندوستانی ہے۔ مثلاً انگریز یہ جملہ اکثر بولتے ہیں "I don't care a dam"۔ اس جملے میں dam دراصل اکبر کے زمانے کا سکہ 'دام' ہے۔ یول فرہنگ میں 'آئینِ اکبری' کے حوالے سے لکھتا ہے کہ 'دام' ایک تولہ، ۸ ماشہ، ۷ سرخ وزن کا تھا اور ایک روپے کا چالیسواں حصہ شمار کیا جاتا تھا۔

یول لکھتا ہے کہ فرہنگ میں انتظامیہ سے متعلق اچھی تعداد میں الفاظ موجود ہیں۔ ایسے ہی

بہت سے ایسے الفاظ ہیں جن کا تعلق نباتات اور حیوانات سے ہے اور یہ الفاظ ہندوستان سے مغربی زبانوں میں آ گئے ہیں۔ یول نے ان مغربی ماہرین کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے ان ہندوستانی الفاظ کو سائنسی کتابوں میں استعمال کیا ہے۔ یول نے ایسے الفاظ کی مثالیں بھی دی ہیں جو ہندوستان سے یونان، روما اور ان تہذیبوں سے متاثر علاقوں میں مروج ہو گئے اور اس طرح ہندوستان کے تہذیبی اثرات یورپ میں دور تک محسوس کیے جا سکتے ہیں۔

عرب فاتحین اور تجار بہت سے الفاظ باہر سے ہندوستان میں لائے لیکن اسی کے ساتھ بہت سے ہندوستانی الفاظ ایسے ہیں جو عربوں کی وجہ سے ہندوستان سے مغربی ممالک میں متعارف ہوئے اور جو عربوں کے بعد کے مغربی فاتحین کو تہذیبی ورثے کے طور پر ملے۔ ایسے الفاظ جو بحیرۂ روم کے ساحلی علاقوں اور متصل ممالک میں مروج ہیں مثلاً: 'بازار'، 'قاضی'، 'حمال'، 'دیوان' وغیرہ۔

سولھویں صدی میں جب پرتگیز ہندوستان کے جنوبی ساحل کے مختلف حصوں پر قابض ہوئے تو ان کی نو آبادیوں کے نتیجے میں ایک ایسی زبان پیدا ہوئی جس میں پرتگیزی اور جنوبی ہند کی زبانوں کی آمیزش تھی۔ یہ زبان عرصے تک ان علاقوں میں آسانی سے سمجھی جاتی تھی اور دیگر مغربی فاتحین نے بھی اس زبان کو جنوبی ہندوستان میں استعمال کیا۔ اس زبان کے پیدا ہونے سے بھی کئی الفاظ ہندوستان سے مغرب کو برآمد ہوئے۔ یول نے ان الفاظ کی جو مثالیں دی ہیں، ان میں monsoon، typhon، mango، curry، palanquin شامل ہیں۔ یول نے فرہنگ میں ان الفاظ کو ہندوستانی (فارسی، عربی، جنوبی ہند کی زبانیں وغیرہ) سے مشتق ثابت کیا ہے۔ اسی طرح یول نے ان الفاظ کی مثالیں بھی دی ہیں جو پرتگیزی زبان سے اردو ہندوستانی میں آئے مثلاً بالٹی، تولیہ، صابن، نیلام وغیرہ۔

آگے چل کر یول نے مثالیں دے کر یہ وضاحت کی ہے کہ بعض اوقات الفاظ کے اصول مآخذ کچھ اور ہوتے ہیں لیکن مرور ایام اور مختلف انداز سے استعمال ہونے کے بعد ان کی شکل یا ان

کا مفہوم اس قدر بدل جاتا ہے کہ کچھ عرصے کے بعد یہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کی ابتدا کہاں سے ہوئی تھی۔

مقدمے کے بعد کتاب میں بائیس فرہنگوں کی ایک فہرست دی گئی ہے جن میں عام لغات بھی شامل ہیں اور خصوصی استعمال اور فنی اصطلاحات کی فرہنگیں بھی۔ ان میں سے بعض فرہنگیں علیحدہ نہیں بلکہ دوسری کتابوں (سفرناموں وغیرہ) کے ساتھ ضمیمے کے طور پر شامل کر دی گئی ہیں۔ فرہنگوں کی یہ فہرست بہت کارآمد ہے اور جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انتظامیہ وغیرہ کی اصطلاحات کے لیے اردو میں الفاظ کا ذخیرہ نہیں، وہ یہ فرہنگیں ملاحظہ فرمائیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ ۱۸۸۶ء سے قبل اردو زبان میں قانون مال اور انتظامیہ کے لیے اصطلاحات موجود اور مروج تھیں۔ اس فہرست میں انگریزی کے ہر شعبے کے علاوہ پرتگیزی اور فرانسیسی زبانوں کی کتابیں بھی شامل ہیں جن کے ساتھ اردو کی فرہنگیں ضمیمے کے طور پر شامل ہیں۔

فرہنگوں کی فہرست کے بعد ہند، پرتگیزی زبان کے بارے میں ایک نوٹ ہے جس میں اس کے قواعد اور صوتیات کے بارے میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔

اس کے بعد اُن کتابوں کی فہرست ہے جن کے حوالے فرہنگ کے متن میں دیے گئے ہیں۔ ان کتابوں کی تعداد سات سو دس (۷۱۰) ہے۔ ان میں انگریزی، فارسی، عربی، سنسکرت، فرانسیسی، جرمن، پرتگیزی، ولندیزی اور متعدد دیگر زبانوں کی کتابیں اور رسائل شامل ہیں۔ اس فہرست کو دیکھ کر دو وجوہ سے خاص طور پر حیرت ہوتی ہے، ایک تو یہ کہ ہندوستان اور اس کی زبان کے بارے میں دنیا کی اتنی زبانوں میں مواد موجود ہے اور دوسرے یہ کہ اس ایک کتاب کی تیاری میں مصنف نے سات سو سے زیادہ کتب کا مطالعہ کیا تھا۔ مطالعے اور تحقیق کی وہ روایت جو کبھی مسلمانوں میں تھی، افسوس کہ اب مغربی اقوام میں منتقل ہو گئی ہے۔

اس فہرست کے بعد ایک غلط نامہ ہے اور اس کے بعد اصل فرہنگ کا متن شروع ہوتا ہے۔

ہر لفظ کے جدید معنی (کتاب ۱۸۸۶ء شائع ہوئی)، اس کا اشتقاق اور معانی کا ارتقا بیان کیا گیا ہے

اوراس کے بعد حوالوں اور سند کے طور پر ان کتابوں اور تحریروں میں سے اقتباسات دیے گئے ہیں جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور ہر اقتباس کے ساتھ کتاب کا نام اور اس کا سال اشاعت درج ہے۔ چند مثالیں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں:

پشاور (Peshawur) کے شہر کا محل وقوع بیان کرنے کے بعد یوں لکھتا ہے کہ اس شہر کا اصل نام بہت قدیم ہے۔ سر جارج کننگم (کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے) نے لکھا ہے کہ اکبر نے اس شہر کا نام سرحدی شہر ہونے کی وجہ سے ’پشاور‘ رکھا تھا۔ یول کہتا ہے کہ کننگم کا خیال درست نہیں؛ اکبر کے زمانے میں پشاور صوبۂ کابل میں ایک درمیانی شہر تھا۔ ’صوبۂ کابل‘ میں کشمیر اور مغرب کا سب علاقہ شامل تھا اس لیے اکبر کے زمانے میں پشاور سرحدی شہر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس شہر کا ذکر سب سے پہلے فاہیان کے ہاں ملتا ہے جس نے اسے ’فلاشا‘ (Folau-sha) لکھا ہے۔ فاہیان سے اقتباس حسب ذیل ہے:

۴۰۰ء: گندھارا سے جنوب کی طرف چار روز کا سفر کرنے کے بعد ’فلاشا‘ کا علاقہ آتا ہے۔ قدیم زمانے میں بدھ اپنے چیلوں کے ساتھ اس علاقے سے گزرا تھا۔ (فاہیان)

۶۳۰ء: ہیون سانگ، اس نے شہر کا محل وقوع بیان کرتے ہوئے اس کا نام ‘Pu-lu-sha-pulo’ یا (’پرش پور‘) لکھا ہے۔

۱۰۰۱ء: الاطبی۔ محمود غزنوی کی آمد کے بارے میں لکھا ہے کہ اس نے اپنے خیمے ‘Purshaur’ کے باہر نصب کیے۔

۱۰۲۰ء: البیرونی۔ ‘Parshawar’ کا ذکر ہے۔

۱۲۲۰ء: یاقوت۔ ‘Farshabur’ لکھا ہے۔

۱۵۱۹ء: بابر۔ ‘Pershawar’ کے قلعے کا حوالہ دیا گیا ہے۔

۱۵۱۵ء: سدی علی۔ ‘Purrhawar’ میں آنے کا ذکر ہے۔

۱۵۹۰ء: آئین اکبری۔ ‘Parshawar’ کے چشمے کا ذکر ہے۔

۱۷۸۳ء: جی۔ فاسٹر۔ 'Peshour' میں سخت گرمی کا حال بیان کیا ہے۔

۱۸۶۳ء: کننگھم۔ اکبر کے قدیم نام 'Parashawar' کو تبدیل کر کے 'Peshawar' نام رکھ دیا۔ اس کے معنی سرحدی شہر کے ہیں۔۹

اس کے بعد ان الفاظ کی فہرست ہے جو فرہنگ کے متن میں شامل نہ ہو سکے اور انھیں ضمیمے میں شامل کر دیا گیا ہے۔

Grab: یہ لفظ انگریزی زبان میں عام طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی کسی چیز پر اچانک قبضہ کر لینے کے ہیں ۱۰ اس لفظ کے اشتقاق پر روشنی ڈالتے ہوئے یول لکھتا ہے کہ یہ عربی لفظ 'غراب' سے مشتق ہے۔ عربی زبان میں 'غراب' ایک کشتی کو کہتے ہیں ۱۱ جسے چلانے کا کام غلاموں یا مجرموں سے لیا جاتا تھا۔ اس قسم کی کشتیاں جنھیں Galley کہتے ہیں، قدیم زمانے میں رومن اور یونانی حکمران بھی استعمال کرتے رہے ہیں۔ یہ لفظ پرتگیزیوں کے آنے کی وجہ سے بعض مغربی زبانوں میں داخل ہو گیا اور ہندوستان میں مرہٹی اور کوکنی زبانوں میں آ گیا۔ لیکن انگریزی زبان میں اس کا مفہوم تشبیہی صورت اختیار کر گیا۔ لیکن مرہٹی اور کوکنی زبان میں 'گراب' اب بھی کشتی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فرہنگ میں جو اقتباسات دیے گئے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۱۸۱ء: پیزا کے آرکبشپ کے خطوط خلیفہ ابو یعقوب یوسف کے نام۔ ایک خط میں شکایت کی گئی ہے کہ اٹلی کا ایک تجارتی جہاز طرابلس کی طرف جا رہا تھا کہ وہ ہواؤں کی تیزی سے مجبور ہو کر ساحل پر آ گیا۔ ایک 'غراب' جو طرابلس سے آ رہا تھا، وہاں رکا اور اس کے آدمیوں نے ہمارے جہاز کا سامان لوٹ لیا۔

۱۲۰۰ء: ایک عربی فرہنگ کا ذکر ہے جو فلارنس میں شائع ہوئی۔ اس میں 'Galley' کے لیے عربی لفظ 'غراب' بیان کیا گیا ہے۔

۱۳۴۳ء: ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں ایک کشتی کی شکل کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ''غراب'' سے ملتی تھی۔

۱۵۵۴ء: سدی علی نے 'غراب' کا ذکر کیا ہے۔

۱۶۶۰ء: محمد معصوم نے جانی بیگ کے حملے کے سلسلے میں 'غراب' کا ذکر کیا ہے۔ یول نے یہ حوالہ ایلیٹ کی تاریخ سے لیا ہے۔

۱۶۹۰ء: تامس ہائیڈ کے مقالات میں 'غراب' کا ذکر ہے۔

۱۶۷۳ء: جان فرائر نے ہندوستان اور ایران کے سفر (۱۶۷۲ء، اختتام ۱۶۸۱ء) کے حالات بیان کرتے ہوئے 'غراب' کا ذکر کیا ہے، فرائر نے لفظ 'Grob' استعمال کیا ہے۔

۱۷۲۷ء: الیگزنڈر ہملٹن نے مسقط کی جنگوں کے سلسلے میں غراب کا ذکر کیا ہے۔ اس نے 'Grab' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

۱۷۵۰-۵۲ء: اولوف تورین نے اپنے سفرنامے 'غراب' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ولندیزی انھیں 'goerabbs' کہتے ہیں اور انگریزی 'grabbs' کہتے ہیں۔

۱۷۵۴ء: ایڈورڈ آئوز (Ives) نے ہندوستان کے سفرنامے میں 'غراب' کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ بمبئی میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس ایک 'غراب' تھا جس میں ۱۸ توپیں تھیں۔ یہاں 'Grab' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

۱۷۶۰ء: مسٹر گروز نے سفرنامے میں 'grab' کا ذکر کیا ہے۔

۱۷۶۳ء: رابرٹ اورم (Orme) نے مغل سلطنت پر اپنے مضامین میں 'grab' کا ذکر کیا ہے۔

۱۸۱۰ء: میریا گراہم نے اور الفنسٹن نے 'غراب' کا حوالہ دیا ہے۔ مؤخر الذکر نے 'Glab' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

۱۸۷۲ء: کیپٹن برٹن نے سندھ کے حالات میں 'ghurabs' کا ذکر کیا ہے۔

جمخانہ (Gym Khana): یول لکھتا ہے کہ یہ لفظ نیا ہے۔ پچیس سال پہلے (یعنی ۱۸۵۱ء) تک مستعمل نہیں تھا۔ سب سے پہلے یہ لفظ میجر جان ٹراٹر کے بیان کے مطابق ۱۸۶۱ء میں رڑکی میں استعمال ہوا جہاں ایک جم خانہ قائم کیا گیا۔ غالباً یہ لفظ 'گیند خانہ' کی بدلی

ہوئی شکل ہے۔ یہ لفظ ایسے مقامات کے لیے استعمال ہوتا ہے جہاں کھیل وغیرہ کی سہولتیں میسر ہوں۔ ممکن ہے 'gym' اصل میں لفظ 'gymnastics' کے پہلے حصے سے مستعار ہو۔ یہ لفظ مالٹا تک پہنچ چکا ہے۔ اس کے اقتباسات حسب ذیل ہیں:

۱۸۷۷ء: 'پائنیر میل' (شمارہ ۳/ نومبر) میں، 'جم خانہ کلب' کا لفظ مرقوم ہے۔

۱۸۷۹ء: ڈوڈو (۲/ جولائی) میں جم خانہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ وہاں لوگ بہت سی حرکتیں کرتے ہیں لیکن کھانا نہیں کھاتے۔

۱۸۸۱ء: رائل انجینئر جرنل (یکم اگست) میں مالٹا میں جم خانہ کا ذکر کیا ہے۔

۱۸۸۳ء: 'Tribes on my Fronteer' میں بمبئی کے جم خانوں کا حوالہ ہے۔

پنکھا (Punkha): اس لفظ پر روشنی ڈالتے ہوئے یول نے دستی پنکھوں اور چھت سے لٹکے ہوئے پنکھوں کا ذکر کیا ہے جو ہندوستان میں استعمال ہوتے ہیں۔ اس نے جو اقتباسات درج کیے ہیں وہ ۱۱۵۰ء، ۱۱۶۶ء، ۱۳۰۰ء، ۱۵۹۶ء، ۱۵۹۸ء، ۱۶۱۰ء، ۱۶۱۶ء، ۱۶۶۳ء، ۱۷۸۷ء، ۱۸۰۷ء، ۱۸۰۹، ۱۸۱۰ء، ۱۸۲۳ء، اور ۱۸۵۲ء کی تحریروں سے لیے گئے ہیں۔ قدیم ترین حوالہ فرانسیسی زبان میں مشہور مؤرخ اور محقق دوزی[۱۲] کی لغت سے ہے جس میں ہسپانوی اور پرتگیزی زبانوں کے ان الفاظ کا بیان ہے جو عربی سے لیے گئے ہیں۔ اس کتاب میں ایک تحریر کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ 'خیش'[۱۳] ایک قسم کا پنکھا تھا جو ہوا جھلنے کے کام بھی آتا تھا اور بعض اوقات اس پر خوشبو کا پانی ڈال کر کمرے کو معطر کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد الغمزی کے حوالے سے لکھا ہے کہ 'خیش' منصور (۷۵۳ـ۷۷۴) کی ایجاد ہے۔

پنجاب (Punjab): پنجاب کا محل وقوع بیان کرنے کے بعد فرہنگ میں پنجاب کے دریاؤں کے قدیم نام سنسکرت اور یونانی زبانوں میں دیے گئے ہیں اور ان کے موجودہ ناموں کے اشتقاق پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ اس کے بعد لفظ 'پنجاب' کے بارے میں حسب ذیل اقتباسات پیش کیے گئے ہیں:

قبل مسیح: رامائن میں 'پنجند' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

۹۴۰ء: مسعودی نے پانچ دریاؤں کی سرزمین کا ذکر کیا ہے۔

۱۰۲۰ء: البیرونی نے بھی 'پنجند' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

۱۳۰۰ء: وصاف نے 'پنجاب' لکھا ہے۔

۱۳۳۳ء: ابن بطوطہ نے 'پنجاب' کا ذکر کیا ہے۔

۱۴۰۰ء: تیمور نے 'پنجاب' لکھا ہے۔

۱۶۴۸ء: وان ٹوسٹ نے 'پنگاب' کا ذکر کیا ہے۔

۱۷۱۰ء: ولنٹجن (Valentjin) نے لاہور کا ذکر کرتے ہوئے 'پنجاب' کا ذکر کیا ہے۔

ان کے بعد فاسٹر (۱۷۹۰ء)، رینل (۱۷۹۳ء)، ولنگٹن (۱۸۰۴ء) اور مالکم (۱۸۱۵ء) سے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔

شلوار (Shulwaur): یول نے اس لفظ کو فارسی بتایا ہے اور عربی میں اس کی شکل 'سروال' ہے۔ اس کا ذکر 'عہد نامہ عتیق' میں 'دانیال' میں آیا ہے۔ یول نے متن کے یونانی ترجموں کے اقتباسات (سن نامعلوم ۲۰۰ء اور ۵۰۰ء) سے ظاہر کیا کہ یہ لفظ یونانی زبان میں بھی آج سے دو ہزار سال قبل رائج تھا۔ اس کے بعد لاطینی، انگریزی اور اطالوی زبان کے اقتباسات دیے ہیں۔

رن کچھ (Run of Cutch): اس علاقے کا تذکرہ اور محل وقوع وغیرہ کے ذکر کے سلسلے میں ۸۰ء، ۹۰ء، ۱۳۷۰ء، ۱۵۸۳ء، ۱۵۹۰ء اور ۱۸۴۹ء کے مورخین اور محققین کے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ ۱۳۷۰ء کا اقتباس شمس سراج عارف سے، ۱۵۸۳ء کا طبقات اکبری سے اور ۱۵۹۰ء کا آئین اکبری سے لیا گیا ہے۔

شمپو (Shampoo): یہ لفظ انگریزی، فرانسیسی اور دیگر یورپی زبانوں میں عام

ہے۔ یول نے اس کی اصل ہندی کا لفظ ''چاپنا'' (مالش کرنا وغیرہ) بیان کیا ہے۔[۱۴] اس لفظ کا سب سے پہلا اقتباس ۱۷۴۸ء کا ہے اور مشہور سفر نامے 'A voyage to the East-Indies' سے لیا گیا ہے اس کے بعد گروز، مسز شیر وڈ، ولیمسن اور فاربس کی تحریروں سے اقتباسات پیش کیے گئے ہیں۔

مذکورہ بالا مثالوں سے ظاہر ہوگا کہ مصنفین نے اس فرہنگ کی تیاری میں بہت کاوش کی ہے۔ اس فرہنگ کو شائع ہوئے اسی (۸۰) سال سے زیادہ ہو چکے ہیں لیکن اس کی افادیت باقی ہے اور لسانیات کے متخصصین کے لیے اس میں بہت سی اہم اور دل چسپ معلومات باقی ہیں۔ اس مضمون میں کتاب کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔ کتاب کے محاسن مطالعے ہی سے ظاہر ہو سکتے ہیں۔

(یورپ میں اردو، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۶۸ء)

حواشی:

(تمام حواشی آغا صاحب کے قلم سے ہیں، مرتب)

(۱)Col,Sir Henry Yule: R.E. C.B.LL.D:Hobson Jobsen being a Glossary of Anglo-Indian Colloquial words and phrases, and of kindered terms: (۱)Etymological Historical and Discursive. London:John Murry.Albemarle street,1886.

(۲) اس کی ببلیوک ناسیونال کراچی سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہوئی۔

(۳) کرنل سر ہنری یول کے حالات زندگی میں Dictionary of National Biography نے Edited by Sidney Lee. London,Smith Elder & Co.1909 سے لیے ہیں

(۴) Apophthegm کے معنی ''بلیغ'' کے ہیں۔ غالباً حضرت علیؓ کی مشہور کتاب ''نہج البلاغہ'' [کا ذکر] ہے۔

(۵) 'یا حسنؓ یا حسینؓ'۔ ان الفاظ کی مزید وضاحت فرہنگ کے متن میں ہے۔

(۶) اس کتاب کا نام 'ہابسن جابسن' ('یا حسنؓ یا حسینؓ') رکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یول کو حضرت امام حسنؓ اور حضرت امام حسینؓ سے ارادی یا غیر ارادی طور پر عقیدت ہو گئی ہو۔ اس مفروضے کی تائید اس امر سے ہوتی ہے کہ جیسا کہ مضمون کی ابتدا میں بیان کیا گیا ہے، ہنری یول کے والد میجر ولیم یول عربی اور فارسی کے عالم تھے اور انھوں نے حضرت علیؓ کی 'نہج البلاغۃ' کا انگریزی ترجمہ کر کے ذاتی طور پر شائع کیا تھا۔ چنانچہ یہ ممکن ہے کہ والد کے خیالات اور عقائد کا اثر پڑنے کے نتیجے میں یول کو والد کے ممدوح (حضرت علی ابن ابی طالب) کے دو بیٹوں حسنؓ اور حسینؓ سے بھی عقیدت ہو گئی ہو جس میں عمر کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا گیا اور یہی عقیدت آخر میں اس کی اہم تصنیف کا عنوان بن گئی۔ یول اعتراف کرتا ہے کہ اس کتاب کا تصور اور تصنیف اس کی زندگی کے بڑے حصے کی خوشیوں اور غموں میں جاری و ساری رہی۔

(۷) فرانس اور بعض دیگر ممالک میں بندرگاہ اور سرحد وغیرہ پر محصول کے افسران (Custom officers) کو 'douane' کہتے ہیں۔ اس لفظ سے غالباً ہر وہ شخص واقف ہوگا جس نے یورپ کا سفر کیا ہے۔ یول نے فرہنگ میں مثالوں سے دکھایا ہے کہ یہ لفظ دراصل 'دیوان' کی بدلی ہوئی شکل ہے۔

(۸) میں نے transliteration [یعنی نقلِ حرفی] میں وہی رومن املا استعمال کی ہے جو فرہنگ کے متن میں موجود ہے۔

(۹) جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، یول نے کننگم کے اس بیان سے اختلاف کیا ہے۔

(۱۰) آکسفورڈ انگلش ڈکشنری

(۱۱) 'منجد' میں 'غراب' ایک قدیم کشتی کے معنوں میں مرقوم ہے۔

(۱۲) Dozyet Engelmann: "Glossaire des Mots Espagnole et Portugais derive's i Arab",Leid.1869

(۱۳) عربی زبان میں 'خیش' پنکھے کو بھی کہتے ہیں۔

(۱۴) اس کی تائید آکسفورڈ ڈکشنری سے بھی ہوتی ہے۔ فرانسیسی میں لفظ 'Shampooing' استعمال ہوتا ہے لیکن یہ ان الفاظ میں سے ہے جو انگریزی سے فرانسیسی میں آ گئے ہیں اور جن کے لیے فرانسیسیوں نے 'Franglais' کی اصطلاح وضع کی ہے۔ اردو میں جہاں تک مجھے معلوم ہے 'چپی کرنا' ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

بہر حال 'چپی' یا 'چمپی' دونوں الفاظ Shampoo کا مشتق ہو سکتے ہیں

☆☆☆☆

سخاوت مرزا

تحقیقاتِ الفاظِ ہندی غرائب اللغات

مولوی محمد عبدالواسع ہانسوی معاصر عالمگیر (ف ۱۱۱۸ھ) نے سب سے پہلے اردو کی ایک لغت الموسوم بہ غرائب اللغات مدون کی تھی۔ مؤلف کے حالات تاریکی میں ہیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مولوی صاحب موصوف ایک مدرس تھے، جن کی علمی قابلیت اعلیٰ پائے کی نہ تھی۔ ہانسوی مرحوم کی تالیفات میں ایک رسالہ صرف ونحو میں ہے نیز دوسری کتاب زیرِ بحث غرائب اللغات کا ذکر تذکرہ نویسوں نے کیا ہے۔ راقم کی نظر سے ان کی ایک اور تالیف شرح مثنوی یوسف زلیخا بھی گزری ہے، جو کافی ضخیم ہے، جس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد (دکن) میں موجود ہے۔

غرائب اللغات کے الفاظ کی تحقیق اور اس میں ازدیاد کی سعی میں خان آرزو اکبرآبادی نے بڑا کام کیا اور بقائے دوام حاصل کی۔ اس کے بعد اردو زبان میں کسی اور محقق کی غرائب اللغات مؤلفہ ہانسوی پر کوئی اور تالیف ہماری نظر سے نہیں گزری۔ یوں تو شمالی ہند میں اہلِ زبان نے کئی کتابیں اس موضوع پر تالیف کیں، مثلاً مصطلحات اللغات، مؤلفہ مرزا جان طپش، نیز مولوی اوحدالدین بلگرامی، نکہت وغیرہ کی بھی تالیفات ہیں۔ مگر دکن کے ادیب بھی

تحقیقاتِ الفاظ و محاوراتِ اردو پر کام کرنے میں کچھ پیچھے نہیں رہے۔ چنانچہ مشہور صوفی، ادیب و شاعر میر شمس الدین فیض حیدر آبادی کی تالیفات میں خزائن الامثال اور دستور الشعرا اس سلسلے میں مشہور ہیں، اور کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہیں۔ ان کے تلامذہ میں نصیر الدین نقش نے بھی فنِ لغت نگاری میں بہت کچھ کام، اور یادگاریں چھوڑیں مثلاً تخلیۃ الشعرا وغیرہ جو نکہت جہاں آبادی اور مولوی اوحد الدین بلگرامی کا جواب تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ غرائب اللغات پر بھی دکن کے بعض ادیبوں نے کام کیا ہے اور اس بات کی تحقیق کی کہ غرائب اللغات میں دراصل اردو الفاظ کون سے ہیں اور فارسی و ہندی الفاظ وغیرہ کون سے ہیں۔ ہماری نظر سے ایک کتاب بعنوان تحقیقاتِ الفاظِ ہندی و اردو غرائب اللغات گزری۔ چونکہ اس تالیف میں بعض اشعار دکنی شعرا کے ہیں اس لیے ہمارا گمانِ غالب ہے کہ یہ تالیف حیدر آباد دکن کی پیداوار ہے، چنانچہ سید منور حیدر آبادی تلمیذ استاد الشعرا فیض و مصدق نے حیدر آبادی زبان کے بعض الفاظ مثلاً ''پاڑ'' نیز گویا لکھنوی کے اشعار سنداً درج کیے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس کے مؤلف خود منور حیدر آبادی ہی ہوں۔

نوادر الالفاظ کو محترمی ڈاکٹر سید عبداللہ پروفیسر جامعہ پنجاب نے مرتب فرمایا ہے اور عالمانہ بسیط مقدمے کے ساتھ انجمنِ ترقی اردو (پاکستان) نے اس کو شائع کیا ہے۔ چونکہ زیرِ نظر مخطوطہ بھی اس سلسلے میں نایاب معلوم ہوتا ہے، اس لیے ہم یہاں اس کے چند منتخب الفاظ پیش کرتے ہیں کہ نوادر الالفاظ اور اس نسخے میں کیا فرق ہے، جو قارئین کی دلچسپی سے خالی نہیں:

اوجھہ: جائے ماندن فضلۂ حیوانات کہ سوائے رودہ باشد (نوادر)۔

اوجھ: رودہ۔ اوجھڑی اردو است، (تحقیقات)

اڑد: اُرد: ماش (نوادر)۔ ارد: در اردو ماش گویند، (تحقیقات)

آفتابا: در اردو بالف باید نوشت (تحقیقات) مگر نوادر میں ''آفتاوا ولفظ صحیح آفتابہ است کہ فارسی است''، [درج ہے]۔

باوڑی: باولی بلام اردو است (تحقیقات)

باوری: باوڑی، باؤلی: چاہے کہ تا آب آں زینہ ہا باشد پایاب کذا فی الرسالہ

وایں قول ...... چاہے را گویند کہ زینہ پایہ برآں بستہ باشند تا بآسانی بہ تہ آں رفتہ آب بردارند، پایاب (نوادر)

پاڑھ: چوب بندے کہ بنایاں وکتابہ نویساں بیروں و دروں بستہ بر بالائے آں کار کنند (نوادر)۔

پاڑ: (تحقیقات الفاظ ہندی) میں بحذف ھ لکھا ہے، اور اس کے معنی کے متعلق ایک دکھنی شاعر منور حیدر آبادی (تلمیذ فیض بیگ واسطہ) کا ایک مزاحیہ شعر سنداً پیش کیا ہے جو یہ ہے:

بوسہ کی گر ہوس ہے تو گرد اوس کے پاڑ باندھ
میں اوس کو سرو باندھوں ہوں تو اوس کو تاڑ باندھ

تاڑ کا درخت سیندھی کا جھاڑ (ایک قسم کی دکنی شراب کا درخت بمشابہ درخت کھجور)۔

بانسلی: در رسالہ نے باشد کہ مطرباں نوازند، الخ (بانسری مطابق باالف) (نوادر) لکھا ہے کہ بانسری بضم سین وراہ اردو است، نہ کہ بلام (تحقیقات)

بان: تیر وبتازی سہم، ہوائی، تیر چرخ، (نوادر)، بان بمعنی تیر اردو نیست، (تحقیقات)۔

بانا: (تانا، ضد) بہمہ معنی اردو است (تحقیقات)۔

برسولا: در رسالہ آلہ مشہور نجاران، تیشہ بتازی، قدوم بفتح قاف ودال مہملہ بواؤ رسیدہ و میم و منحت بکسر میم وسکون نون وحائے مہملہ وفوقانی۔ لیکن تیشۂ سنگ تراشی بری باشد و تفصیل پیرو در سراج اللغہ مرقوم است (نوادر)

بسولا: برسولا اردو نیست، (تحقیقات)

نوٹ: دکن میں عام طور پر بسولا مستعمل ہے، (راقم) [سخاوت مرزا]۔

بنگلہ: (ق، ۲۹ الف) در رسالہ خانۂ گنبد دار کہ از چوب سازند، تالار بہ فوقانی بوزن سالار، لیکن آنچہ بہ تحقیق پیوستہ تالار بہ معنی مطلق عمارت چوبین است و بنگلا عمارت است بوضع

خاص کہ اکثر آں بکاہ پوشند وگاہے از چوب وایں وضع مخصوص بہ ہندوستان است۔ خصوصاً بنگالہ، بلکہ بنگلہ ماخوذ است از بنگالہ، کمالا یخفی (نوادر)۔

بنگلا: بہر سہ معنی اردو است۔ قسم پان ومکان ونام شہر (تحقیقات)۔

بیدھ: درر سالہ داروفروش، لیکن بید در ہندی مطلق طبیب را گویند (نوادر)۔

بید: بمعنی طبیب ہم اردو نیست (تحقیقات)۔

بیہڈ [بیہڑ]: زمینے کہ آں را کندہ باشد وگوداں ساختہ (نوادر)۔ نسخہ ب۔ ج۔ د میں، دال ہندی کے ساتھ ہے۔ بمعنی بیہڈ، نفائس اللغات ودر فرہنگ آصفیہ بیہڑ بیائے معروف ومجہول ہردو، اونچی نیچی زمین، بیلہ بن، چراگاہ، جنگل، بھیڑیا کہ بمعنی گرگ است، سعادت علی خاں مرحوم بیہڑیائے منسوب بزمین بیہڑ ی فرمودند گومتی را گھوم تی، کہ گرد لکھنو گردش ی سازد (تحقیقات)۔

بھوکنا کتے کا [بھونکنا کتے کا]: فریاد کردن سگ الخ گویا دونوں طرح ہے (نوادر) مگر تحقیقات الفاظ ہندی کی رائے یہ ہے کہ بھونکنا میں نون واجب ہے (تحقیقات صفحہ ۹۶)۔

پالک: سبزۂ خوردنی۔ اس کے دوسرے معنی پالک بمعنی پروردہ ہم اردو است (تحقیقات)۔

پیاس: تشنگی وبتازی عطش۔ وبہ ہندی تاپ وتاپی ہردو بتائے ہندی وبائے عجمی، (نوادر)۔ مؤلف تحقیقات نے اس کے تلفظ کی اس طرح صراحت کی ہے: پیاس وپیاز بیائے خفی اندو اعلان ناروا است، (تحقیقات) صفحہ ۹۶۔

پیراک: شناور، بواؤ وبعضے اشنا ہم گفتہ اند، واشنا، مزید علیہ شنا نیز ہست (نوادر)۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا لفظ پیراک اردو لفظ ہے جو مؤلف تحقیقات کی رائے ہے کہ پیراک ہندی ہندی لفظ ہے، اردو نہیں۔ تیرنے والا، اردو است (تیراک)، (تحقیقات)۔

پٹا: گلو بند سگ (نوادر) مگر مؤلفِ تحقیقات کی رائے ہے کہ پٹا بمعنی گلوبند وکاغذ پیمان بہردو معنی اردو است۔

پیڈو: پیڑو (آصفیہ) زیرِ ناف، بفارسی زہار، (نوادر)۔

پیڑو وہا لعدرائے ہندی ناروا ست، (تحقیقات) صفحہ ۱۳۵۔

تاپ: مرضے مشہور تپ لرزہ، تب بادہ بیائے موحدہ ودال مہملہ نوشتہ اند خطا ست:

حاشیہ مطابق ج، ب میں یہ لفظ سہو کاتب سے رہ گیا ہے، الف (جو نسبتاً جدید تر تلفظ کا پابند ہے) تپ جاڑہ۔ (نوادر)۔

تب جاڑا۔ دراردو تپ جاڑے سے آئی، (تحقیقات الفاظ ہندی)۔

دکھلانا: (نوادر) دکھانا، دکھلانا، (تحقیقات) اور سنداً کسی شاعر کا یہ شعر پیش کیا ہے:

دکھا نہ ہجر میں ساقی شراب شیشہ میں
بھرا ہے زہر ہمارے حساب شیشہ میں

تالی: بمعنی دو دست بہم زدن کہ صدا برآید (نوادر) مؤلف تحقیقات مذکور لکھتا ہے کہ تالی، بمعنی دست برہم زدن است وتاڑی نام نشہ اردو است نہ کہ بایں معنی، بمعنی کلید اردو نیست۔ بل آزاد دراردو کنجی گویند (تحقیقات الفاظ)۔

تاڑ: تاڑی، ع سب اوس کو سرو باندھیں ہیں تو اوس کو تاڑ باندھ۔

نوٹ: دکن میں لانبے قد والے کو مزاحیہ طور پر تاڑ کے جھاڑ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

جچا: زنے نوزائیدہ...... زچہ بزائے تازی وجیم فارسی۔ لیکن جیم غلط عوام ہندوستان است کہ تلفظ بزائے معجمہ برآنہا دشوار است (وبتازی نفساء خوانند بضم نون وفتح آں وسکون فاوسین مہملہ بالف کشیدہ)۔ زنے کہ فرزند ودختر زادہ باشد تا چہل روز آں را زچہ خوانند)۔

حاشیہ: زچہ بہ تشدید بہ تخفیف، دونوں طرح بولا جاتا ہے، شرفاء بہ تخفیف وجاہل عورتیں بہ تشدید، (افادات رضوی) Platts میں موجود ہے۔ (نوادر)۔

جچا: اردو زچا است (تحقیقات)، صفحہ ۱۷۴۔

چیونٹا: مورچۂ کلاں کہ بہ فارسی مور سواری گویند بسین مہملہ... و نیز آنچہ آتش بداں بردارند حاشیہ:

چینٹا، (نوادر)

چنوٹا: بنون خفی است و یا نا رواست (تحقیقات الفاظ ہندی، صفحہ ۲۲۶)۔

نوٹ: مولانا شیخ محمود بحری نے اپنی مثنوی من لگن (دکنی) میں اس کا تلفظ چنوٹی لکھا ہے۔ (راقم) [سخاوت مرزا]

چونا: بمعنی آہک و چکیدن ہم اردو است (تحقیقات، صفحہ ۲۱۷)، نوادر میں چوونا اور چونا دونوں طرح ہے۔

چول: طرف تختۂ در کہ بر کازہ کہ بہ ہندی دبونی گویند و تختۂ مذکور بہ سبب او گردد باشنہ۔

چول برائے دروازہ و چہار پائی ہم اردو است، (تحقیقات، صفحہ ۲۱۷)

ڈ: ''ڈنڑ'' کا لفظ نوادر میں نہیں ہے البتہ ڈنڈ بمعنی تاوان وغیرہ درج ہے۔ مؤلف تحقیقات مذکور نے لفظ ''ڈنڈ'' کی تشریح میں لکھا ہے کہ یہ لفظ صحیح ڈنڑ بہ رائے ہندی است نہ کہ دال ہندی، (تحقیقات، صفحہ ۲۶)۔

علاقۂ دکن میں ڈنڑ کا لفظ ڈنڈ بولا جاتا ہے، جس کی مؤلف نے تصحیح کی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ شاید مؤلفِ تحقیقات دکن کا باشندہ ہے۔

رانڈ: زنِ شوہر مردہ، بیوہ (نوادر) مگر مؤلف تحقیقات لکھتا ہے کہ رانڈ بہ رائے ہندی نیست۔

رال: صمغے است سفید مایل بہ زردی وغیرہ (نوادر) مگر مؤلف تحقیقات نے اس کے دو معنی لکھے ہیں۔ رال بمعنی آب دہن و نام دوا ہم اردو است، (صفحہ ۲۵۹)۔

سابونی: صابون اردو است تحقیقات صفحہ ۲۵۹۔ مگر نوادر اللغات میں لکھا ہے کہ سابن در رسالہ۔ بتازی صابون گویند ..... لیکن سابن ہماں صابون است کہ عوام سابن گویند

سابونی در رسالہ، شیرینی مدوّر بسیار سفید، (نوادر)

کنٹھ: اردو نیست، و کنٹھا اردو است (تحقیقات) صفحہ ۲۵۹۔

کدہی: از کدہی کبھی واز کبھی کبھو افصح است، (تحقیقات الفاظ ہندی)

(سہ ماہی ''اردو نامہ''، کراچی، شمارہ ۴۸، اپریل ۱۹۷۴ء)

☆☆☆☆

سید خواجہ حسینی

نور اللغات کا تقابلی مطالعہ

مولوی نور الحسن صاحب نیّر نے فرہنگ آصفیہ [مرتبہ سید احمد دہلوی] کے بعد اردو زبان میں ایک اور جامع اور مبسوط لغت لکھنے کی کوشش کی جو نور اللغات کے نام سے آج چار ضخیم جلدوں میں ملتی ہے۔ اس سے پہلے صاحبِ فرہنگ نے اپنی لغت چار جلدوں میں شائع کی اور امیر اللغات کی بھی دو جلدیں منظرِ عام پر آ چکی تھیں اس لحاظ سے لغت نویسی کے جدید نظریات اور اصولوں کے جیتے جاگتے نمونے ان کے درپیش تھے۔ تعجب یہ ہے کہ نیّر صاحب نے اپنی لغت کے دیباچے میں امیر اللغات کا ذکر تعریفی لہجے میں کیا ہے مگر فرہنگِ آصفیہ کا نام تک نہیں لیا۔ لکھنؤ اور دہلی کے دبستانوں کے درمیان جو طویل عرصے سے نوک جھونک چلی آ رہی تھی شاید یہ اسی کا نتیجہ ہو۔

نور اللغات میں الفاظ کے انتخاب، معنی اور قواعد کے لحاظ سے الفاظ کی نوع وغیرہ لکھنے سے متعلق جو نظریات ملتے ہیں وہ فرہنگِ آصفیہ اور امیر اللغات سے استفادے کا نتیجہ ہیں۔ شعوری طور پر وہ امیر مینائی سے زیادہ متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ جس کا انھوں نے اعتراف بھی کیا ہے۔ مگر

قرائن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نور اللغات گویا دبستانِ دہلی کے سید احمد کے فرہنگِ آصفیہ کے جواب میں دبستانِ لکھنؤ کی کاوش ہے۔ واقعہ جو کچھ بھی ہو اس لغت کی تدوین سے اردو زبان میں جامع اور مبسوط لغتوں میں ایک اور لغت کا اضافہ ضرور رہا ہے۔

الفاظ کے انتخاب کے سلسلے میں وہ اپنے پیش رووں یعنی امیر مینائی اور سید احمد دہلوی کی طرح زبان کے پورے الفاظ و محاورات کو اپنی لغت میں شامل کر لینا چاہتے ہیں، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر لکھنؤ میں مروج الفاظ و محاورات اور روز مروں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس لغت میں الفاظ و محاورات بھی ملتے ہیں جو صرف دہلی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ انھوں نے جگہ جگہ ان دونوں دبستانوں کی زبان کے فرق کو ظاہر کیا ہے۔ لکھنؤ میں اصلاح زبان کے سلسلے میں مختلف الفاظ جو ٹکسال باہر کیے جا رہے تھے اس کی بھی صراحت کی ہے۔ غرض مجموعی طور پر الفاظ کے انتخاب کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ نور اللغات لکھنؤ کے اس دور کی زبان کا اچھا خاکہ پیش کرتی ہے۔

الفاظ کے انتخاب کے سلسلے میں یہ حقیقت فراموش نہیں کی جا سکتی کہ زبان دیس کے کافی وسیع رقبے میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے زبان پر علاقائی اثرات ناگزیر ہیں۔ لغت نویس کو اس بات کا لحاظ رکھنا چاہیے، مگر نور اللغات کے پیشِ نظر آسانی سے یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ نیر صاحب اس معاملے میں اپنے پیش رووں سے زیادہ آگے نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور بات یہ محسوس ہوتی ہے کہ انھوں نے زبان کے سارے محاورے کو لغت میں جگہ دینے کے جذبے کے زیر اثر ایسی ترکیبیں اور جملے بھی محاوروں کے ضمن میں پیش کیے ہیں کہ جن پر کسی بھی صورت میں محاوروں کا اطلاق نہیں ہوتا جیسے ''یہ جملہ آپ ہی کا ہے'' یا ''آبِ وضو'' یا ''ظرفِ وضو''۔ البتہ انھوں نے اپنی لغت میں کئی ایسے الفاظ بھی شامل کیے ہیں جو ان کی لغت سے پہلے کی لغتوں میں جگہ نہ پا سکے۔ اس طرح ان کی لغت میں الفاظ کا ذخیرہ ملتا ہے۔ مگر ان کے ہاں اس سلسلے میں کوئی ایسا اجتہاد نہیں ملتا جس کو فنِ لغت نویسی میں کسی پیش رفت سے تعبیر کر سکیں۔

لغت نویسی میں سب سے اہم مرحلہ الفاظ کے معنی اور تعریف لکھنے کا ہے۔ اس معاملے میں بھی وہ فرہنگِ آصفیہ اور امیر اللغات کا تتبع کرتے ہیں۔ مثلاً وہ لفظ کے معنی لکھتے وقت لفظ کے زیادہ سے زیادہ مترادف لکھتے ہیں۔ ان کی لغت میں ایک اور خامی یہ ہے کہ لفظ کے معنی لکھتے وقت یہ کوشش نہیں کرتے کہ لفظ کے معنی اس طرح لکھے جائیں کہ اس میں معنی کے تمام پہلو (ALL SHADES OF MEANING) شامل ہوں۔ بعض اوقات الفاظ کی تعریف بھی لکھتے ہیں مگر وہ بھی نامکمل۔ غرض علم معانی (SEMANTICS) کے اصولوں کی روشنی میں اگر اس لغت کا جائزہ لیا جائے تو یہ لغت فرہنگِ آصفیہ سے بھی پیچھے ہے البتہ ان کے لغت میں متروک الفاظ کی تعداد اتنی زیادہ نہیں جتنی کہ ہمیں فرہنگ میں نظر آتی ہے۔ نور اللغات کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ الفاظ کے معنی لکھتے وقت اکثر یہ صراحت کر دیتے ہیں کہ لفظ فصیح ہے یا غیر فصیح۔ اہلِ لکھنؤ کس طرح استعمال کرتے ہیں اور اہلِ دہلی کس طرح استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کی صراحت فرہنگ میں بھی ملتی ہے مگر نیّر صاحب اس معاملے میں زیادہ چوکنے رہتے ہیں۔

الفاظ کے مآخذ لکھنے میں وہ امیر مینائی اور صاحبِ فرہنگ دونوں سے پیچھے ہیں۔ کہیں کہیں لفظ کا مآخذ لکھا ہے ورنہ عام طور پر ان کی لغت میں الفاظ کے مآخذ کے تعلق سے صراحت نہیں ملتی صرف اتنی وضاحت کر دیتے ہیں کہ لفظ کس زبان کا ہے۔ زبان کے اتنے جامع اور مبسوط لغت میں اگر الفاظ کے مآخذ نہ لکھے جائیں تو بہت مایوسی ہوتی ہے۔ حالانکہ ان کے سامنے فرہنگِ آصفیہ موجود تھی جس میں اس پہلو پر کافی روشنی ڈالی گئی تھی۔ اگر نیّر صاحب اس میدان میں اور آگے بڑھنے کی کوشش کرتے تو اس سے اردو میں فنِ لغت نویسی کو بہت فائدہ ہوتا۔

نور اللغات میں الفاظ کی قواعد کے لحاظ سے جو نوع بتائی گئی ہے وہ بھی فرہنگِ آصفیہ اور امیر اللغات سے استفادے کا نتیجہ ہے۔ نیّر صاحب بھی لفظ کی گرامر کے تعلق سے صراحت کرتے وقت اپنے پیش رووں کی طرح لفظ کی جنس کے دائرے سے آگے نہیں بڑھتے۔ اردو میں الفاظ کی جنس کا تعین یقیناً بڑی دردسری کی بات ہے اور کسی بھی لغت میں اس قسم کی وضاحت کی بڑی اہمیت

سمجھی جاتی رہی ہے تعین جنس لا کھ اہم سہی صرف یہی چیز اردو گرامر کی اساس نہیں۔ گرامر کے تعلق سے اور بہت سی چیزیں وضاحت طلب ہوتی ہیں۔ ایک جامع اور مبسوط لغت کو زبان کے قواعد کا ممد و معاون ہونا چاہیے۔ اگر لفظ فعل ہے تو وہ صرف یہ لکھ دیتے ہیں کہ لازم ہے یا متعدی۔ غرض اس معاملے میں بھی انھوں نے زیادہ آگے بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔

نیّر صاحب نے الفاظ کے تلفظ پر بھی زیادہ توجہ صرف نہیں کی کہیں کہیں کسی لفظ کا تلفظ لکھا ہے۔ جیسے:

آدمی (بسکونِ دوم)

کہیں لفظ پر صرف اعراب لگا کر کام چلایا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں لفظ کا تلفظ لکھتے وقت جچے تلے اصول نہیں تھے۔

(۲)

نور اللغات اور امیر اللغات

صاحب نور اللغات نے امیر اللغات سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ نظریاتی اعتبار سے الفاظ کے معانی لکھتے وقت، لفظ کے استعمال کے متعلق اشعار [سے] استناد کرتے وقت اس امر کا صریح اندازہ ہوتا ہے۔ بعض جگہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی نقل ہے۔ مثالیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

آدم = (ع) بعض کہتے ہیں کہ ادمت (سزا وار امامت) سے ماخوذ ہے[۱]۔ بعض کہتے ہیں۔ ادیم (روے زمین) سے بنا ہے۔ سنسکرت میں آد = پہلا۔ من = منش (آدمی کا مخفف ہے) مذکر۔ (نور اللغات ص ۴۶)

آدم = (اس لفظ کے اشتقاق میں کئی طرح کے اختلاف ہیں) اہلِ عرب میں بعض کہتے ہیں کہ اَدمیت سے مشتق ہے [جس کے معنی گندم گونی ہیں][۲] اور بعض کہتے ہیں کہ ادمت سے ماخوذ ہے (معنی سزاوار اُمامت)[۳] بعض کا قول ہے کہ ادیم سے بنا ہے جس کے معنی روے زمین کے

ہیں۔ (امیر اللغات ص ٧٦)

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

آدمی = (بسکون دوم) مذکر جنس انسان۔

کہتے ہیں ذوقؔ آج جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

(نور اللغات ص ٥٢)

آدمی = انسان۔ ناسخؔ۔

یہ آدمی ہے کہ برسوں جمال رہتا ہے
وگرنہ ماہ کو اِک شب کمال رہتا ہے
کہتے ہیں ذوقؔ آج جہاں سے گزر گیا
کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

(امیر اللغات ص ٧٦)

ایک اور مثال:

آدیس = جوگیوں کا سلام۔ میر حسنؔ۔

یہ سمجھا بناوٹ کا کچھ بھیس ہے
لگا کہنے جوگی جی آدیس ہے

(نور اللغات)

آدیس = (ھ) آدیش (آ + دیش) جوگیوں کا سلام۔ میر حسنؔ

یہ سمجھا بناوٹ کا کچھ بھیس ہے
لگا کہنے جوگی جی آدیس ہے

(امیر اللغات ص ٨٢)

آدیس کے جو معنی دیے گئے ہیں یقیناً ایک دوسرے کی نقل ہیں اور دونوں نے اس لفظ کے

معنی لکھتے وقت ایک ہی قسم کی غلطی کی ہے۔ آ دیس ''جوگیوں میں بڑے کا چھوٹے کو سلام'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے اور یہ صراحت دونوں جگہ غائب ہے۔

کچھ اور مثالیں ملاحظہ ہوں:

آغوش = ف۔ آگوش کے معنی ژند میں بغل کے ہیں (مذکر و مونث) بغل کنایہ گود۔ رندؔ۔

میں وہ محروم محبت ہوں لڑکپن میں بھی
وا کسی نے نہ مرے واسطے آغوش کیا

(نور اللغات)

آغوش = ف، اصل اس کی آگوش ہے جس کے معنی ژند میں بغل کے ہیں۔ مذکر۔ کنار۔ بغل رندؔ۔

میں وہ محروم محبت ہوں لڑکپن میں بھی
وا کسی نے نہ مرے واسطے آغوش کیا

(امیر اللغات)

ابجد = ع۔ مونث۔ حروف تہجی۔ عربی الف۔ بے کے ۲۸ حروف۔ آتشؔ۔

گذرا مجاز سے تو حقیقت کھلی مجھے
قرآں کا سامنا تھا جو ابجد تمام کی

حسب ذیل میں جمع کر کے تمام حروف کے اعداد قرار دیے ہیں۔

ابجد	ہوز	حطی	کلمن۔
۱۔۲۔۳۔۴	۵۔۶۔۷۔۸	۸۔۹۔۱۰	۲۰۔۳۰۔۴۰۔۵۰
سعفص	قرشت	ثخذ	ضظغ
۶۰۔۷۰۔۸۰۔۹۰	۱۰۰۔۲۰۰۔۳۰۰۔۴۰۰	۵۰۰۔۶۰۰۔۷۰۰	۸۰۰۔۹۰۰۔۱۰۰۰

اس قاعدے سے شعر یا مصرع یا جملے میں یادگار کے لیے کسی واقعہ کا وقوع یا سال وفات

نکالا کرتے ہیں۔ جس کو تاریخ کہتے ہیں۔ (نورُاللغات ص ۱۸۸)

ابجد = ع۔ مونث۔ حروف تہجی۔ عربی الف بے کے اٹھائیس حروف۔ آتش۔

گذرا مجاز سے تو حقیقت کھلی مجھے
قرآں کا سامنا تھا جو ابجد تمام کی

ان اٹھائیس حرفوں کو آٹھ کلموں میں حسب ذیل میں جمع کر کے اعداد بڑھائے گئے اس تفصیل سے حساب جمل قرار دیتے ہیں کہ ابجد سے حطی تک ایک ایک عدد۔ کلمن سے سعفص تک دس دس اور قرشت سے ضظغ تک سو سو عدد بڑھائے گئے ہیں۔

ابجد ۔ ہوز ۔ حطی ۔ کلمن ۔ سعفص ۔ قرشت ۔ ثخذ ۔ ضظغ

ا۔	ب۔	ج۔	د۔	ہ۔	و۔	ز۔	ح۔	ط۔	ی۔	ک۔	ل۔	م
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰

ن۔	س۔	ع۔	ف۔	ض۔	ق۔	ر۔	ش۔	ت۔	ث۔	خ	۔	ز
۵۰	۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰		۷۰۰

ض	ظ	غ
۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

اس قاعدے سے شعر یا مصرع یا لفظ یا جملے میں یادگار کے لیے کسی واقعے کا سال وقوع نکالا کرتے ہیں جس کو تاریخ کہتے ہیں۔

(امیراللغات ص ۶۰ جلد دوم)

بالائی مثالیں مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ اگر اس طرح دونوں لغتوں کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو اس قسم کی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ صاحب نوراللغات نے امیراللغات سے بہت فیض اٹھایا ہے یوں تو کسی ایک لغت میں الفاظ کا جو ذخیرہ ملے گا وہ دوسرے لغت میں بھی ملے گا اور الفاظ کے معنی بھی کم وبیش ہر لغت میں وہی ملیں گے۔ مگر الفاظ کے

استعمال کے متعلق جو اشعار استناد کے لیے پیش کیے گئے ہیں وہ بھی ان دونوں لغتوں میں مشترک ملتے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود نہیں ہے کہ یہ نور اللغات کی خرابی ہے کیونکہ لغت نویسی میں عموماً یہ بات پسندیدہ نظروں سے دیکھی جانی چاہیے کہ پیش رو لغتوں کی ساری خوبیاں موجودہ لغت میں آ جائیں اور لغت نویس اپنے لغت کو پچھلی لغتوں سے زیادہ کارآمد اور مفید بنا سکے۔ دوسرے معنوں میں لغتوں میں جہاں تک کام ہو چکا ہے وہاں سے لُغت نویس کو اپنا کام شروع کرنا ہوگا۔ نیّر صاحب نے اپنی لغت کے دیباچے میں اس کا ذکر کیا ہے کہ امیر اللغات تو الف اور بے کی حد تک ہر ضرورت پوری کر چکی ہے۔'' اور انھوں نے بقیہ کام کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر نیّر صاحب فرہنگِ آصفیہ کا بھی بغور مطالعہ کرتے اور فنی لحاظ سے سید احمد دہلوی نے جہاں تک اس میدان میں ترقی کی تھی وہاں سے اپنا کام شروع کرتے تو یقیناً اردو فن لغت نویسی کو آگے بڑھانے میں ان کا یہ قابل قدر کارنامہ ہوتا۔

(۳)

نور اللغات اور فرہنگ آصفیہ

نور اللغات فرہنگ آصفیہ کے بعد کی تالیف ہے اور اصولی اعتبار سے دونوں لغت ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں چاہے وہ الفاظ کے انتخاب کا مسئلہ ہو یا الفاظ کے معانی لکھنے کا مرحلہ۔ قواعد کے لحاظ سے لفظ کی نوع لکھنے کے اصول ہوں یا لفظ کو کا ماخذ لکھنے یا لفظ کے تلفظ لکھنے کا طریقہ۔ ان تمام اصولوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ نور اللغات فرہنگِ آصفیہ کا متبع ہے۔ اگر ان دونوں لغتوں میں کوئی فرق ہے تو یہ کہ فرہنگ کے مولف دبستان دہلی کے نمائندے اور نور اللغات کے مرتب دبستان لکھنؤ کے۔ اس لیے فرہنگ ''جامع مسجد کی سیڑھیوں والی زبان'' کا اچھا سرمایہ ہے اور نور اللغات میں لکھنؤ کی ترشی ترشائی زبان کا ذخیرہ مل جاتا ہے۔ نظریاتی ہم آہنگی اور مشابہتوں کے باوجود نور اللغات فرہنگِ آصفیہ سے فنی نقطۂ نظر سے زیادہ آگے نہیں بلکہ بعض اوقات پیچھے رہ جاتا ہے۔

الفاظ اور محاوروں کی تعداد نور اللغات میں فرہنگ سے زیادہ ہے۔ بعض نئے الفاظ جو اردو

زبان کو انگریزی کی دین ہیں فرہنگ میں نہیں ملتے جیسے اسٹاف (STAFF)۔ اٹلس (ATLASS) ایکسپورٹ (EXPORT) وغیرہ۔ فرہنگ میں بھی اردو میں دخیل کئی انگریزی الفاظ ملتے ہیں مگر نور اللغات اس معاملے میں فرہنگ سے آگے ہے۔ نور اللغات میں الفاظ کے ساتھ ان کے سارے مرکبات و محاورات لکھنے کی کوشش کی گئی ہے جیسے لفظ آگ کے ۱۲۶ محاورے قلمبند کیے گئے ہیں۔ اسی طرح آنکھ۔ کان۔ ناک۔ پانی وغیرہ سے سینکڑوں محاورات و مرکبات ملتے ہیں۔ فرہنگ کا بھی یہی حال ہے مگر نور اللغات اس معاملے میں فرہنگ سے آگے ہے۔ نور اللغات میں ایک خرابی یہ ہے کہ بعض اوقات مؤلف نے محاورے اور جملے کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا۔ اس خامی کے باوجود نیّر صاحب کی یہ کوشش قابل داد ہے۔

نور اللغات میں الفاظ کا تلفظ لکھنے میں بہت بے احتیاطی سے کام لیا گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لغت نویس کے لیے الفاظ کا تلفظ لکھنا اہمیت نہیں رکھتا۔ بعض اوقات لفظ کے کسی حرف کے متعلق یہ لکھ دیتے ہیں کہ بالفتح پڑھا جائے یا بالضم یا بالکسر۔ اور یہ صراحت بھی کہیں کہیں ملتی ہے۔ الفاظ کا تلفظ لکھنے کے سلسلے میں فرہنگ کا بھی یہی حال ہے مگر عام طور پر فرہنگ آصفیہ میں الفاظ کے تلفظ کا خیال بہ نسبت نور اللغات کے زیادہ رکھا گیا ہے۔

لغت میں الفاظ کے معانی پیش کرنے کے تعلق سے فرہنگِ آصفیہ اور نور اللغات دونوں میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ لفظ کے زیادہ سے زیادہ مترادفات لکھ دیے جائیں ایک عام آدمی لغت الفاظ کے معنی تلاش کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے نہ مترادفات دیکھنے کے لیے۔ لغت میں اگر لفظ کے یہ مترادفات لکھے جائیں تو کوئی حرج نہیں مگر بنیادی مقصد تو الفاظ کے معنی بتانا ہوتا ہے اور ان دونوں لغتوں میں الفاظ کی تعریف لکھنے سے احتراز کیا گیا ہے۔ البتہ فرہنگِ آصفیہ میں لفظ کے مترادفات کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں تعریف بھی ملتی ہے۔ نور اللغات میں اس قسم کی شعوری کوشش نہیں ملتی۔ ذیل کی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

آٹھ = ھ۔ صفت۔ ۸۔ ے

(نور اللغات جلد اول ص ۳۷)

اور اسی لفظ کے معنی فرہنگِ آصفیہ میں یوں ملتے ہیں۔

آٹھ = ھ۔ صفت (س आषटन) اشٹن۔ پراکرت (آٹھ आठ) ف۔ ہشت۔ انگریزی۔ ایٹ (EIGHT) چار کا دونا۔ سولہ کا آدھا

(فرہنگِ آصفیہ جلد اول ص ۲۷)

اونٹ = ھ۔ مذکر۔ شتر (۲) مذاق سے لمبے آدمی کو کہتے ہیں

(نور اللغات جلد اول ص ۴۰۰)

اونٹ = ھ۔ مذکر۔ ایک دراز گردن اور لمبی ٹانگوں والا چوپایہ جسے فارسی میں شتر اور عربی میں جمل کہتے ہیں

(فرہنگِ آصفیہ جلد اول ص ۳۲۷)

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:

پارٹی = انگ۔ مونث۔ فریق۔ جماعت۔ گروہ (۲) پھلوں کی مختصر دعوت۔

(نور اللغات جلد دوم ص ۶)

پارٹی = انگلش۔ اسم مذکر۔ فریق۔ گروہ۔

(فرہنگِ آصفیہ جلد اول ص ۴۷۵)

لفظ پارٹی کے جو معنی دونوں لغتوں میں ملتے ہیں نامکمل ہیں۔ اور نور اللغات میں اس لفظ کے جو دوسرے معنی دیے گئے ہیں یعنی "پھلوں کی مختصر دعوت" فرہنگِ آصفیہ میں یہ معنی بھی نہیں ملتے۔ نور اللغات میں یہ جو معنی دیے گئے ہیں وہ خصوص کی غلطی کے حامل ہیں۔ پارٹی صرف پھلوں کی مختصر دعوت کے لیے ہی مستعمل نہیں ہے بلکہ اس میں اور چیزیں مثلاً چائے وغیرہ بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ اس لفظ کے معنی چیمبرز ڈکشنری میں اس طرح دیے گئے ہیں:

Party:a part ، a side in a battle, game.

lawsuit, or other contest: a body of persons, united in favour of a political or other causes: the spirit of faction, a small body of persons associated together in any occupation or amusement, a detachment; a company; a meeting or entertainment of guests, one concerned in any affair, a person who enters into contract eg. of marriage, a possible match in marriage;

(اشاعت ۱۹۵۴ء ص ۷۸۷)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ پارٹی کے معنی صرف فریق یا گروہ کے نہیں۔ اس کے علاوہ اور بہت سے معنوں میں بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ نور اللغات میں جو دوسرے معنی دیے گئے ہیں وہ شاید A MEETING OR ENTERTAINMENT والے معنوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھے گئے ہیں مگر وہ بھی غلط ہیں۔

فرہنگ آصفیہ آج بھی الفاظ کے ماخذ کی وضاحت کے تعلق سے اردو کی بہترین لغت تسلیم کی جاسکتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس لغت میں الفاظ کے جو بھی مآخذ بتائے گئے ہیں وہ سو فی صد صحیح ہیں اور نہ ہی اس لیے کہ اس میں ہر لفظ کا مآخذ لکھا گیا ہے بلکہ اس لیے کہ جتنے الفاظ کا مآخذ اس لغت میں بتایا گیا ہے اور اس معاملے میں جتنی تحقیق سید احمد دہلوی نے کی ہے وہ اردو کے کسی اور لغت نویس سے اب تک نہیں ہو سکی۔ فرہنگ آصفیہ میں بھی کبھی لفظ کا مآخذ لکھا گیا ہے اور کبھی صرف اتنا بتا دینے پر اکتفا کیا گیا ہے کہ لفظ کس زبان کا ہے۔ مگر نور اللغات میں باوجود فرہنگ آصفیہ کے بعد کی تالیف ہونے کے الفاظ کے مآخذ لکھنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی اور جو کہیں کہیں خلاف عادت لفظ کے مآخذ کی صراحت کی گئی ہے وہ بھی اکثر نامکمل ہے۔ ذیل کی مثالوں سے یہ بات اور واضح ہو جائے گی۔

آپ: ھ (نور اللغات جلد اول ص ۲۱)

آپ = ھ۔ ضمیر۔ (س अत्मन آتمن) (پراکرت اتّا۔ آپا۔ اپانو)

(پرانی ہندی آپس۔ اپن)

(فرہنگِ آصفیہ جلد اول ص ۹۴) آٹھ=ھ

(نور اللغات جلد اول ص ۳۹)

آٹھ=ھ۔(س आष्टन् اشٹن)(پراکرت آٹھ आठ)ف ہشت۔

(فرہنگ آصفیہ جلد اول ص ۱۱۰)

آج=ھ۔صفت۔س۔ادیہ۔پراکرت اور پالی میں اجّ (نور اللغات جلد اول ص ۳۹)

آج=ھ۔ظرف زمان(س आद्य ادے)اجّ۔اجا۔

(فرہنگ آصفیہ جلد اول ص ۱۱۵)

غرض اس طرح نور اللغات اردو کے جامع اور مبسوط لغتوں میں اضافے کا باعث ضرور ہے مگر فن لغت کو آگے بڑھانے میں اس سے کوئی مدد نہیں ملی۔ اگر نیر صاحب اپنے کام کی ابتدا وہاں سے کرتے جہاں سے کہ سید احمد دہلوی نے چھوڑا تھا تو اردو فن لغت نویسی کو اس سے اور زیادہ فائدہ ہوتا اور یہ فن آج سے زیادہ ترقی یافتہ ہوتا جتنا کہ آج ہے۔

(اردو ادب، دہلی، شمارہ ۴، ۱۹۶۷ء)

حواشی:

(۱) نور اللغات میں یہاں ''امامت'' کا لفظ ہے لیکن حسینی صاحب نے ''امت'' لکھا ہے۔ ممکن ہے سہو کتابت ہو ہم نے نور کی بنیاد پر تصحیح کی ہے (مرتب)۔

(۲) یہاں امیر اللغات میں ''جس کے معنی گندم گونی ہیں'' کے الفاظ بھی ہیں جو حسینی صاحب نے درج نہیں کیے۔ ہم نے امیر اللغات کی بنیاد پر اضافہ کیا ہے لیکن ان الفاظ کو چوکور خطوطِ وحدانی میں درج کیا ہے۔ (مرتب)

(۳) یہاں بھی غلطی سے امامت کی بجائے امت کا لفظ ہے لہٰذا ہم نے تصحیح کی ہے (مرتب)

☆☆☆☆

عبداللہ چغتائی

تدوین وطباعت انگریزی اردو اسٹینڈرڈ ڈکشنری

مولوی [عبدالحق] صاحب کی تمام عمر کے بے شمار علمی کارنامے ہیں جو ہمیشہ زندہ رہیں گے مگر میرے نزدیک ان میں انگریزی اردو ڈکشنری کی تیاری اور طباعت کا وہ کارنامہ ہے جسے ہر آدمی بہت محسوس کرتا ہے جب وہ مطبوعہ دو جلدیں بڑی اور چھوٹی ڈکشنری کی ہزارہا صفحات پر مشتمل دیکھتا ہے۔ مگر یہ تمام مرحلہ کس طرح سرانجام ہوا اور اس کے لیے کیا کیا مراحل طے کیے گئے ہیں بذاتِ خود ایک نہایت دلچسپ داستان ہے، میرا ہمیشہ عقیدہ رہا ہے کہ انسان کے اعمال اس کی اپنی نیت کا بذاتِ خود آئینہ ہوتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے ان میں بقاے دوام کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ مجھے خوب علم ہے کہ آپ نے کس طرح اس کام کو انجام دیا ہے۔ آپ نے خود بھی مطبوعہ اسٹینڈرڈ ڈکشنری کے مقدمے کے ابتدا میں لکھا ہے:

> ”زبان کے لیے لغت کا ہونا جیسا کچھ ضروری ہے۔ وہ محتاجِ بیان نہیں لیکن لغت لکھنا بڑا ٹیڑھا اور کٹھن کام ہے اور جہاں واسطہ دو زبانوں سے ہوتا ہے وہاں یہ دشواری اور بڑھ جاتی اور بڑا پتہ مارنا پڑتا ہے۔

> غرض جب تہیہ کرلیا گیا کہ اس ضرورت کو پورا کرنا ضروری ہے تو تدبیر یہ سوچی گئی کہ یہ کام متحدہ طور پر انجام پانا چاہیے یعنی متعدد اصحاب مل کر یہ کام کریں ایک تو اس لیے کہ یہ مشکل اور بڑا کام ایک آدمی کے ہونے کا نہیں۔ دوسرے ہمیں مل کر کام کرنے کی بھی عادت ہونی چاہیے ورنہ بڑے اور اہم کام کبھی انجام نہ پا سکیں گے اور ہوئے بھی تو ناقص اور غیر مستند ہوں گے ـــــ پروف دیکھنے کا کام بھی کچھ آسان نہ تھا یہ پوری دیدہ ریزی اور ہوشیاری کا کام ہے ـــــ پروف خوانی کا کام اپنے ذمے لیا۔ کچھ دنوں کے لیے مجھے سید سراج الدین ناگامیاں بی۔ اے ناشر زلندن ہاتھ آ گئے ـــــ آج اس کے ختم ہونے پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک پہاڑ تھا کہ سر سے ٹل گیا امید ہے کہ جو صاحب اس سے کام لیں گے وہ ہماری محنت اور جاں سوزی کی داد دیں گے۔"

مولوی صاحب نے جب یہ ارادہ کیا اس وقت آپ ابھی اورنگ آباد کالج کے پرنسپل تھے یعنی ۱۹۲۶ء کا زمانہ تھا آپ نے تین چار نسخے کنسائز آکسفورڈ ڈکشنری کے لے کر، ان کو پھاڑ کر، ہر حرف کو الگ الگ کر کے ان کے حصہ کرائے اور ان کو اپنے احباب میں جن کی ایک فہرست پہلے ہی تیار کر لی تھی ان کو بغیر کسی ترتیب کے ان اصحاب کو ارسال کر دیا، اگر کسی نے خود اس کام کے لیے پیش کیا، مجھے یاد ہے کہ "بی" کا حرف مولوی صاحب نے شیرانی صاحب کے سپرد کیا جو سرِ دست اس کام کو بوجہ دیگر ذمہ داریوں کے نہیں کر سکتے تھے۔ انھوں نے مجھے ہمراہ اس کام کے لیے شامل کیا مگر ہم آخر کار اس کام کو انجام نہیں دے سکے اور اس کے لیے مولوی صاحب سے معذرت کر دی۔ اس طرح کئی اور اصحاب نے وعدے پر بھی کام کو پوری طرح انجام نہیں دیا۔ اس کے بعد آپ نے نئی ہدایات ارسال کی تھیں۔ آخر مولوی صاحب نے کئی کئی بار یاد دہانی بھی کرائی اسی اثنا میں بعض اصحاب سے ڈکشنری کے ترجمہ شدہ حصے بھی وصول

ہونے شروع ہو گئے تو مولوی صاحب نے پھر ان کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اس وقت خاص کر اورنگ آباد میں ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر مجیب (جامعہ ملیہ دہلی) مولوی سید ہاشمی، سید وہاج الدین، پروفیسر اورنگ آباد کالج، مولوی محمد حسین نحوی جیسے حضرات کو پہلے ہی مولوی صاحب نے اپنے ہاں اورنگ آباد میں جمع کر لیا تھا اور ہر روز صبح ناشتے کے بعد کام شروع ہو جاتا تھا آپ ہر ایک لفظ کے مندرجہ ترجمہ کو دیکھتے تھے اور آپس میں بحث بھی ہوتی تھی۔ زیادہ تر یہ لوگ موسم گرما کی چھٹیوں کی وجہ سے بھی یہاں جمع تھے کیونکہ ان میں اکثر تعطیلات ختم ہونے پر واپس چلے گئے۔ میں نے دیکھا کہ مولوی صاحب قریب قریب ہر لفظ پر احباب سے بعض اوقات مشورہ بھی کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ان ہی ایام میں مولوی صاحب کے نہایت عزیز دوست ڈاکٹر سراج الحق (نواب سراج یار جنگ بہادر) بلدہ سے سرکاری دورے پر اورنگ آباد تشریف لائے اور سیدھے مولوی صاحب کے ہاں آئے۔ وہ بھی ڈکشنری کے بعض الفاظ کی بحث میں شامل ہو گئے اور مفید نتائج بر آمد ہوئے۔ غرض یہ کہ جو بھی وہاں آیا وہ بھی ڈکشنری کی تدوین میں شامل ہو گیا۔

مگر اسی اثنا میں مولوی صاحب کے سامنے اس ڈکشنری یا دیگر تالیفات کے لیے انجمن اردو کے سامنے اپنے پریس کا مسئلہ بھی تھا چنانچہ مولوی صاحب نے مجھے اس کے انتظام کے لیے لاہور لکھا۔ میں نے سوچا کہ یہ اہم اور ٹیڑھا مسئلہ خاصا مشکل ہے۔ مگر میں نے ہمت کر کے لندن میں ایک کمپنی وڈ روف کو سکنڈ ہینڈ پریس کے لیے لکھا اور ان کو ہدایات یہ کی کہ وہ بمبئی میں ارسال کریں۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اپنی تمام مطبوعات کو اس پریس میں چھپوانا شروع کر دیا۔

غرضے یہ کہ ڈکشنری کے چھاپنے کا کام قریب آ گیا اتفاق سے بمبئی میں اڈوانی کمپنی سے سیر کا انتظام کیا گیا۔ اس کے لیے بھی مولوی صاحب کے ہمراہ بمبئی گیا۔ خیال محض یہ تھا کہ کسی طرح پیپر کی ضرورت میں کمی نہ ہو اور ایک قسم کا آخر تک یکساں کاغذ میسر آئے۔ ایسا ہی

ہوا۔ بلاشبہ ساتھ ہی تمام قسم کی مجلات کا انتظام بھی وہیں بمبئی سے کیا گیا اور مولوی صاحب نے ڈکشنری کے ضمن میں ہر دو اسٹینڈرڈ اور اسٹوڈنٹ دو انواع کی ڈکشنریاں ایک ہی ساتھ شروع کر دی تھیں اور ایک ساتھ ہی وہ پایۂ تکمیل کو پہنچی تھیں۔

جب ڈکشنری تیار ہو جانے کے آخر مرحلے میں آ ئی تو مولوی صاحب کو خیال آیا کہ اس پر کسی ماہر زبان کا مقدمہ بھی ہونا چاہیے۔ اس کے لیے مولوی صاحب نے اپنے مکان پر اپنے احباب کی ایک میٹنگ کی جس میں خصوصیت سے نواب مہدی یار جنگ نے بھی شرکت کی اور متفقہ طور پر یہ طے پایا کہ علامہ عبداللہ یوسف علی سے درخواست کی جائے کہ وہ اس پر ایک مقدمہ لکھ دیں۔ جیسا کہ میرے تمام خطوط سے بھی یہ امر واضح ہے اور مجھے لاہور اسی مطلب کے لیے لکھا گیا تھا۔ ڈکشنری کا اس وقت تک تمام مسودہ طبع ہو چکا تھا۔ کپڑے کی جلد کرا کر یہ چند ہدایات دے کر ارسال کر دیا۔ میں یہ لے کر سیدھا جناب علامہ عبداللہ یوسف علی کے پاس ان کے دفتر اسلامیہ کالج لے گیا۔ ویسے مولوی صاحب نے ان کو براہ راست بھی ایک الگ درخواست لکھ دی تھی اور ایک طرح اس امر سے پوری طرح وہ واقف ہو چکے تھے۔ مگر انھوں نے باوجود زیادہ مصروفیات کے وعدہ فرمادیا کہ وہ مقدمہ لکھیں گے۔ مگر ان کو اس میں چند امور کی زبان دانی کے اعتبار سے کمی نظر آئی جو ان کے خیال سے لازمی تھے مگر ویسے ڈکشنری کی ضرورت اور طباعت کے اعتبار سے اس مرحلے تک مولوی صاحب نے ان کو ضروری خیال نہیں کیا تھا اور اسی لیے مولوی صاحب نے کہیں یہ تسلیم نہیں کیا کہ یہ ڈکشنری براہ راست کنسائز آکسفورڈ کا ترجمہ ہے۔ مگر یہ ضرور اقرار کیا گیا ہے کہ اس سے استفادہ کیا گیا۔ کیونکہ تجارتی نقطے کے اعتبار سے آکسفورڈ کے ناشر ہی اس کی کبھی اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ مگر عبداللہ یوسف علی سے آخر یہ معاملہ پورے طور پر طے نہ ہوا۔ آخر ڈکشنری مکمل طور پر اپریل ۱۹۳۸ء چھپ گئی (خط مولوی صاحب مورخہ ۲۹/اپریل ۱۹۳۸ء) اور مولوی صاحب نے خود اس پر ایک محققانہ مقدمہ بھی لکھا۔ میں نے مولوی صاحب سے اس کی ایک جلد بطور تحفہ طلب

کی مگر آپ نے نہیں دی۔ مولوی صاحب کا اس ضمن میں جواب بھی اس خط میں موجود ہے۔

جب ۱۹۳۹ء میں مولوی صاحب نے اردو کانفرنس دہلی میں کی تو اس وقت انجمن کی مطبوعات کی قیمتیں نصف کر دی تھیں۔ تب مولوی صاحب نے میرے مانگنے پر خود اپنی پاکٹ سے مبلغ پندرہ روپیہ ادا کر کے ہر دو ڈکشنریاں یعنی بڑی اسٹینڈرڈ اور اسٹوڈنٹ میرے حوالے کی تھیں جو آج تک میرے استعمال میں ہیں۔

مولوی صاحب کی یہ انگریزی اردو ڈکشنری علمی خدمت اللہ کے فضل سے تا ابد رہے گی اور یہ سب ان کی ذاتی محنت اور کاوش کا نتیجہ ہے۔ اس کی صحیح قدر اس وقت معلوم ہوتی ہے جب ہم اسے استعمال کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں کوئی اور ڈکشنری لگا نہیں کھاتی۔ ویسے ہر شے اور ہر معاملہ اپنا ایک مقام رکھتا ہے۔

مولوی صاحب کا پریس اورنگ آباد میں

مولوی صاحب کو اورنگ آباد میں رہ کر عام طور پر اپنی تمام مطبوعات کی طباعت اور خاص کر رسالہ ''اردو'' سہ ماہی کا انتظام عام طور پر ہمیشہ اورنگ آباد کے باہر ہی کرنا ہوتا تھا۔ اس کے لیے ہمیشہ ڈاک کے ذریعے رجسٹری کر کے مسودات کا کبھی دہلی، کبھی لاہور، کبھی بلدہ حیدر آباد اور دیگر مقامات پر برائے طباعت ارسال کرنا بہت بڑی تکلیف تھی۔ میں جب مولوی صاحب کے ہاں ۱۹۳۰ء میں تھا تو دیکھا ایک طرف تو یہ ڈکشنری کی طباعت کی سوچ رہے ہیں جس کے لیے ان کے پاس اپنا کوئی پریس نہیں ہے۔ بہت بڑی مشکل کا سامنا ہے۔ جن دنوں ہم بمبئی میں کاغذ وغیرہ کا انتظام کر رہے تھے میں نے سوچا کہ کیوں نہ ہم کہیں سے سیکنڈ ہینڈ پریس اچھی حالت میں خرید کر اورنگ آباد لے چلیں۔ اس کے لیے کوئی عمدہ اور دیانت دار نگہبان بھی اللہ پیدا کر دے گا۔ اگرچہ اس وقت مولوی صاحب کے ہاں ان کاموں کے انتظام کے لیے مولوی محمد صدیق صاحبزادہ مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی تھے جو بذاتِ خود پرانی طرز کے لیتھو پریس سے ضرور واقف تھے۔ چنانچہ میں نے لاہور آ کر لندن سے ایک فرم

وڈ روف (Wood Roff) کی فہرست تازہ کا مطالعہ کیا تو ہم نے ایک بہت بڑے سیکنڈ ہینڈ پرنٹنگ پریس کے کوائف دریافت کیے تو ان کے جواب پر وہ ہمیں نہایت موزوں معلوم ہوئے۔ پھر وہ یہ بھی مان گئے کہ بمبئی میں وہ پریس آ کر براستہ من ماڑ آسانی سے اورنگ آباد بھی جا سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے مولوی صاحب سے بذریعہ خط و کتابت طے کر لیا اور ان کی شرائط کے مطابق ان کو آرڈر دے دیا۔ اور پریس قریب ایک ماہ کے عرصے میں بخیریت بمبئی آ گیا۔ ادھر مولوی صاحب کو اتفاق سے ایک نہایت تجربہ کار، مستعد اور واقف کار نوجوان مسٹر عبدالرشید باشندہ الہٰ آباد بھی میسر آ گیا۔ انھوں نے مولوی صاحب سے طے کر کے پریس کو سنبھال لیا۔ اس طرح مولوی صاحب کا اپنا پریس بھی ڈکشنری کی طباعت سے پیشتر خاطر خواہ طور پر مہیا ہو گیا تھا۔ مولوی صاحب کے ہاں پرانے مکانوں میں اس قسم کے انتظام میں کوئی تکلیف کا سامنا نہیں تھا البتہ وہاں صحیح آدمی کا کام کے لیے میسر آنا جو ذمے دار ہو ضرور مسئلہ تھا اور یہ مسئلہ ہمیشہ رہا۔ مگر اللہ کے فضل سے عبدالرشید نے تمام کام کو عمدگی سے شروع کر دیا۔

اس کے بعد اس شخص عبدالرشید نے خود بمبئی جا کر موزوں ٹائپ ہر دو [زبانوں یعنی] اردو اور انگریزی کا بھی انتظام کیا۔ ویسے ایسے طباعت کے کاموں کے لیے میں نے خود تجربہ کیا کہ بمبئی شہر بہت موزوں مقام ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مولوی صاحب نے بھی ان تمام کاموں میں روپیہ خرچ کرنے میں کبھی دریغ نہیں کیا، ان کے پاس بھی کوئی خزانہ جمع نہیں تھا۔ ہم دور سے دیکھتے تھے کہ مولوی صاحب ہمیشہ اپنی تمام تنخواہ اور کتابوں سے آمدنی کو ان کاموں میں فوراً لگا دیتے تھے۔ لوگوں کو بھی ان پر اعتماد تھا، اس وجہ سے بھی کام چلتا تھا۔ ویسے یہ بھی اقرار کرنا ہوگا کہ اورنگ آباد میں ابھی تک ایسے ذرائع میں نہ کمی تھی اور نہ گرانی [تھی] جو ایک طرح سے بہت بڑی قدرتی حوصلہ افزائی تھی۔ اس کے بعد پریس سے تمام کام جو پرنٹنگ سے متعلق لیے گئے اور ٹائپ بھی روز بروز ساتھ ساتھ اسی طرح کم و بیش ساتھ دیتا رہا۔ یہ ضرور اقرار کرتا ہوگا کہ وہ شخص عبدالرشید بذاتِ خود نہایت ایماندار، مستعد اور کام میں ہوشیار تھا اس وجہ سے بھی

اسے چھپائی کے کاموں میں کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ مجھے خوب یاد ہے جب ہم ڈکشنری کے پروف اٹھا کر کلکتہ گئے تو وہ تمام کم وبیش پانچ چھ سیر وزن کا گٹھا تھا۔ نہ معلوم مولوی صاحب نے اور سید سراج الدین ناگا میاں نے کتنی دفعہ تازہ پروف بار بار طلب کیے۔ ایک بار تو پروفوں کے پلندے میز پر اس طرح پڑے تھے جیسے کوئی کباڑ خانہ ہے اور یہ سب اورنگ آباد میں اپنے ذاتی پریس کا کرشمہ تھا۔ مگر ہم نے یہ بھی دیکھا کہ مولوی صاحب ماشاءاللہ کام کی کثرت اور اس کے مسائل سے کبھی گھبراتے نہ تھے بلکہ ہنسی سے کہا کرتے تھے، یہ ہے زندگی ایک مصروف منشی کی۔ مولوی صاحب نے نہ معلوم کس قدر دیگر مطبوعات کا جال بھی بچھا دیا جو اللہ کے فضل وکرم سے بخیر وخوبی طبع ہو گئے۔ جب مولوی صاحب اورنگ آباد سے بلدہ جاتے تو ان کے ہمراہ پروفوں کا الگ پلندہ یا پارسل سا ایک بہت بڑا بیگ ہوتا اور جہاں قیام کرتے وہاں جاتے ہی پہلے اس کو رکھنے کا انتظام اپنے پیچ وان حقہ کے ہمراہ رکھ دیتے اور وہیں الگ بیٹھ کر ان سے نپٹتے اور صاحب خانہ بھی مولوی صاحب کے مزاج سے خوب واقف ہوتا۔

مولوی صاحب کے ہاں ان سے ملنے والے صاحبِ غرض اکثر لوگ بھی بے شمار ہمیشہ جمع رہتے مگر ان کو پروف دیکھتے ہوئے [پاکر] کم مخل ہوتے۔ اگرچہ مولوی صاحب کبھی ان سے نہ اکتاتے اور کبھی ان کی دل شکنی نہ کرتے اس طرح ان لوگوں کے کام بھی ہو جاتے جس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ جب مولوی صاحب نے حیدر آباد سے دہلی میں نقل مکانی کی تو اس وقت ان تمام پھیلے ہوئے امور کو سمیٹ کر ہمراہ لے جانا بہت بڑا مسئلہ تھا۔ مگر مولوی صاحب نہایت عمدگی سے روپیہ خرچ کر کے تمام ساز وسامان لے کر دہلی آ گئے تھے، مگر اورنگ آباد پریس میرا خیال ہے وہیں چھوڑ دیا جس کا مجھے ہرگز علم نہیں ہے، مگر دہلی آ کر آپ نے طباعت کا انتظام خان بہادر عبداللطیف خاں کے سپرد کر دیا تھا اور اس قدر مطبوعات ہیں کہ انسان تصور نہیں کر سکتا۔ ویسے میں خود دسمبر ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹ر اپریل ۱۹۳۸ء تک ہندوستان سے باہر پیرس میں رہا جہاں مولوی صاحب کے خطوط برابر آتے رہے۔ میرا

مطلب یہ ہے کہ مولوی صاحب کی نقل مکانی کبھی ان کے روزمرہ کے معمول میں مخل نہ ہوتی۔

مولوی صاحب کا سفر کلکتہ

یہ ۱۹۳۵ء کا زمانہ ہے اردو اسٹینڈرڈ ڈکشنری اپنے پورے اہتمام سے اورنگ آباد میں طبع ہو رہی تھی اور پریس سے پروف برابر آ رہے تھے۔ یعنی مولوی صاحب ہی نہیں بلکہ تمام اہلکار انجمن ترقی اردو خوب مصروف تھے۔ مولوی صاحب خود پروف دیکھتے تھے اور آخری ہدایات پریس کو دے کر واپس کرتے تھے۔ کسی اور پر اس اہم کام کو ہرگز نہیں چھوڑتے تھے۔ مگر ان دنوں ان کے عزیز دوست عبدالرحمٰن صدیقی (سندھی) کلکتہ میں ایسٹرن فیڈرل یونین کے جنرل منیجر تھے۔ ان کی وساطت سے مولوی صاحب اپنی اسکیم جائزۂ زبانِ اردو کو کلکتہ کی حد تک انجام دینا چاہتے تھے اور انھوں نے تمام کلکتہ میں اس کا چرچا بھی کر رکھا تھا مگر صدیقی صاحب دراصل مولوی صاحب کو وہاں اپنے زمانے میں بلانا بھی چاہتے تھے اور اتفاق سے وہاں اس وقت خواجہ ناظم الدین وزیرِ تعلیم صوبہ کلکتہ (بعد میں وزیراعظم پاکستان) بھی ہو گئے تھے۔ امپیریل لائبریری کلکتہ کے لائبریرین اس وقت خلیفہ اسداللہ مرحوم جو لاہور کے باشندے تھے اور ان کی تمام تعلیم علی گڑھ میں ہوئی تھی وہ بھی قدیم دوست کی حیثیت سے مُصر تھے کہ مولوی صاحب کبھی کلکتہ تشریف لائیں۔ ان سب امور کے علاوہ کلکتہ میں اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد بھی موجود تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے ایک شام اورنگ آباد میں کلکتہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہم نے تیاری کی مگر سوال یہ پیدا ہوا کہ ڈکشنری کے پروفوں کا کیا ہوگا۔ جس پر مولوی صاحب نے کہا کہ ہم ہمراہ لے جائیں گے اور وہاں سے ٹھیک کر کے ارسال کرتے جائیں گے۔ تو بہت بڑا پلندہ پروفوں کا ہم نے ہمراہ رکھ لیا۔ جسے سید سراج الدین ناگامیاں نے اورنگ آباد سے ہمارے ہمراہ کر دیا تھا۔

چنانچہ ہم نے کلکتہ کا سفر بمبئی سے سیدھا اختیار کیا اور مولوی صاحب راستے میں پروف دیکھتے رہے جب ہم کلکتہ (ہاوڑہ) کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے تو وہاں اسٹیشن پر صدیقی صاحب

مع چند اور احباب برائے استقبال موجود تھے۔ ہم ٹیکسی کے ذریعے پانی گنج صدیقی صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم اپنے گھر میں آ گئے کیونکہ مولوی صاحب حسبِ عادت یا حسبِ معمول ہر جگہ ہمیشہ اپنے ذہن میں ایک ہی اپنا گھریلو ماحول مدنظر رکھتے یہی وجہ تھی کہ وہ ہر وقت ہر مقام کو اپنا گھر تصور کرتے تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے وہاں جاتے ہی اپنے بیگ سے اردو اسٹینڈرڈ ڈکشنری کے پروفوں کو نکال لیا جن کو وہ راستے میں بھی درست کرتے رہے تھے اور اسی طرح ان کو درست کرنا شروع کر دیا۔

(خطوط عبدالحق (بنام ڈاکٹر عبداللہ چغتائی) مرتبہ عبادت بریلوی،
مجلسِ اشاعت مخطوطات، اورینٹل کالج، لاہور، ۱۹۷۶ء)

☆☆☆☆

محمد حسن

جلال لکھنوی کی لغات

سرمایۂ زبانِ اردو

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کے قیام نے زبان کی بنیادی ضروریات کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی۔ لغت کسی زبان کی کس قدر بنیادی ضرورت ہے۔ اس پر بحث کرنا تحصیلِ حاصل ہوگا۔ غیر ملکیوں کے لیے کسی زبان کے جاننے کا پہلا ذریعہ لغت ہی ہو سکتی ہے اور اسی لیے فورٹ ولیم کالج کے کچھ اساتذہ نے اس کی کوشش کی کہ کوئی مفید مطلب لغت تیار ہو سکے۔ جان جوشوا کٹیلر نے ہندوستانی زبان کی لغت تیار کی۔ یہ لغت ڈیوڈ مل نے ۱۷۴۳ء میں شائع کی۔ اس کے بعد مل، فرزز، جان گلکرسٹ، ٹیلر، جان شیکسپیر وغیرہ نے اس طرف توجہ کی اور اس طرح ہندوستانی لغات کا ایک اچھا ذخیرہ کم از کم غیر ملکیوں کے کام کے لیے تیار ہو گیا۔

اس تحریک کے پہلو بہ پہلو لکھنؤ میں ناسخ نے زبان اور الفاظ کو جو اہمیت دی تھی وہ دن دونی رات چوگنی بڑھ رہی تھی۔ زبان کی غلطیاں روز بروز اہمیت پکڑتی جا رہی تھیں محاورے روزمرہ اور

لفظی خیال بندیوں کی بنا پر لغت کی ضرورت کا اندازہ ہمارے اساتذہ کو بھی ہوتا جا رہا تھا۔ چنانچہ لکھنؤ میں بحر اور رشک کی مثالیں موجود ہیں۔ بحر کی لغت کے بارے میں کئی تذکروں میں مختلف بیانات ملتے ہیں مگر صاحبِ گلِ رعنا کا خیال ہے کہ اس کی تکمیل نہیں ہوئی ہوگی۔ رشک کا نفس اللغۃ آج بھی ملتا ہے۔ اسی سلسلے کی کڑیاں جلال کا ''سرمایۂ زبانِ اردو''، امیر مینائی کا ''امیر اللغات'' اور نور الحسن نیر کا ''نور اللغات'' ہیں۔ اس سے ایک تحریک کا پتا چلتا ہے جو ان بزرگوں کے دلوں میں رواں تھی جس کی بنا پر ان لوگوں نے ہر بار ایک مکمل اور جامع لغت تیار کرنے کی کوشش ضرور کی۔

سرمایۂ زبانِ اردو کے دیباچے میں جلال لکھتے ہیں:

> ''جب سے اردوئے معلیٰ نے اپنے علم ایجاد کو میدانِ گاہ سخن میں بلند کیا کسی سخن ور اردو زبان نے کوئی لغت ایسا کہ جامع ہو جملہ مفردات و مرکبات یعنی لغات محاورات و کنایات و مصطلحات و مثل ہائے زبان اردو کا اور بعضے ان لغات کا جن میں باہم فصحاء میں اختلاف ہو یعنی کچھ فصیح کسی طرح ان لغات کو بولتے ہیں کچھ فصیح کسی طرح بولتے ہیں آج تک نہیں لکھا گیا۔''

اس سے جہاں ہم سرمایۂ لغاتِ اردو کے احاطۂ کمال کو اچھی طرح ذہن نشین کر سکتے ہیں وہاں ان اسباب پر بھی روشنی پڑتی ہے جنھوں نے اس لغت کی ترتیب میں زیادہ حصہ لیا۔ پھر اس لغت کی فرمائش ڈائریکٹر سررشتۂ تعلیم پبلک انسٹرکشن بنگال نے کی تھی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ کتاب ان ہی کی فرمائش پر لکھی گئی یا لکھے جانے کے بعد انھوں نے پسند کی۔ جلال کے دیوانِ سوم ''نظم نگاریں'' کے آخری صفحے پر جلال کی تصنیفات کا اشتہار درج ہے اس میں لکھا ہے:

> ''یہ لغت مفردات و مرکبات و محاورات و کنایات و مصطلحات و امثال

> زبان اردو کا جامع نہایت مفید اور کارآمد سخنورانِ اردو زبان ہے اور بہ فرمائش جناب ڈائریکٹر صاحب بہادر آف پبلک انسٹرکشن بنگال طبع ہوا ہے۔"

لغت کے آخر میں میرزا ذاکر حسین یاسؔ کی تقریظ میں یہ جملہ موجود ہے:

> "...... یہ واقعی لغت اسم بامسمیٰ سرمایہ زبان اردو کا ہے جس کو فصحائے ہند کیا علمائے فرنگ تک نے پسند کیا چنانچہ حسب الحکم جناب والائے معلی القاب حضور ڈائریکٹر صاحب بہادر سررشتہ تعلیم آف پبلک انسٹرکشن بنگال یہ شاہد بے مثال زیور طبع سے آراستہ ہو کر انجمن اہل سخن میں جلوہ گر ہوا۔"[۱]

ان دونوں بیانات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی طباعت میں ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن نے خاطر خواہ دلچسپی لی لیکن آیا یہ لکھا بھی ان ہی کی فرمائش سے گیا تھا اس کا ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔ جلالؔ کی پہلی تصانیف کی نوعیت البتہ اس بات کی ضامن ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات خود ہی آئی ہوگی۔ عروض و قوافی کے رسالے سے لے کر رسالہ تذکیر و تانیث تک بھی اس چیز کا پتا دیتے ہیں کہ انھوں نے زبان کے اصول اور لغات کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ سرمایہ زبانِ اردو ۱۳۰۴ھ میں چھپی سن عیسوی کے حساب سے یہ ۱۸۸۴ء اور ۱۸۸۶ء کے لگ بھگ کوئی سال ہو سکتا ہے اور ۱۸۸۴ء میں ایک عجیب و غریب شہادت ہمیں امیر مینائی کی زبانی ملتی ہے:

> "۱۸۸۴ء[۲] میں علوم کے قدرداں الفرڈ لائل صاحب بہادر لیفٹنٹ گورنر ممالک مغربی و شمالی و چیف کمشنر اودھ نے نواب خلد آشیاں طاب ثراہ سے اردو زبان کے ایک جامع لغت کی فرمائش کی۔"

ظاہر ہے کہ یہ بھی اسی دوران کی بات ہے۔ "سرمایۂ زبانِ اردو" اس زمانے میں تصنیف ہو رہی ہوگی یا تصنیف ہو چکی ہوگی اور بہت بڑی حد تک سرمایۂ زبان اردو کی طباعت نے لوگوں کی

توجہ عموماً اور امیرؔ مینائی کی توجہ خصوصاً اس طرف مبذول کرائی ہوگی۔ امیرؔ مینائی ۵۔۱۸۸۴ء میں "آنکھ" کے لفظ کا نمونہ تیار کر کے پیش کرتے ہیں اس کے بعد نواب خلد آشیاں کی موت اور سر الفرڈ لائل کے واپس انگلستان جانے کے بعد:

> "...... میں نے ۱۸۸۸ء میں اس تجربے کے واسطے سفر کیا کہ دیکھوں اردو لغت کی طرف ملک کے خیالات کیسے ہیں لکھنؤ، فیض آباد، اور بنارس ہوتا ہوا پٹنہ تک گیا......"

اس دوران میں "سرمایۂ زبان اردو" چھپ چکی تھی۔ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن بنگال نے قدردانی کی تھی اور فصحاء اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ ان چیزوں سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ امیرؔ مینائی کے ذہن میں لغات لکھنے کا خیال ۳ سرمایۂ زبان اردو کی طباعت نے پیدا کیا۔ پھر دونوں کے احاطۂ کمال پر نظر ڈالنے سے یہ بات اور بھی صاف ہو جاتی ہے کہ امیرؔ مینائی نے اسی احاطے میں ذرا زیادہ وضاحت اور تفصیل سے کام کرنے کی کوشش کی۔

احاطۂ کمال

جلال نے دیباچے میں اس کا احاطۂ کمال یوں بیان کیا ہے:

> "پس بنابریں مؤلف مستہام بہ سعی بلیغ و کوشش و استقرائے تام چند سال کی مدت میں جامع اس کتاب جامع کا ہوا بدیں نہج کہ جملہ محاوروں اور کنایوں اور اصطلاحوں اور مثلوں کے معانی اور محلِ استعمال لکھ دیے اور بیشتر کے استناد و نظائر کلامِ نظم شعرائے نامور و معتبرِ اردو زبان سے اخذ کر کے تحت میں معانی و مقامات استعمال کے درج کیے اور جن محاوروں کنایوں وغیرہ کی فارسی یا عربی دستیاب ہوئی وہ بھی بعد حل معنی و بیانِ محلِ استعمال کے لکھ دی...... جو محاورات کہ مختص تھے عورتوں کے ساتھ یا مشترک تھے مرد و زن میں ان کی اطلاع بھی جا بجا کی گئی اور محاورات

عوام یعنی بازاریوں کے محاوروں پر بھی آگاہی دی گئی۔''[۵]

اس سے پہلے لکھ چکے ہیں:

''ایسا لغت کہ جامع ہو جملہ مفردات و مرکبات یعنی لغات و محاورات و کنایات و مصطلحات و مثلہائے زبان اردو کا۔''

چنانچہ، اس لغت کی ترتیب میں زیادہ زور الفاظ کے معنی اور لغات کی تفصیل میں نہیں دیا گیا بلکہ محاورات اور امثال پر وقت صرف کیا گیا ہے کہ عوام سے زیادہ سخن وروں اور شاعروں کو نظر میں رکھ کر لکھا گیا جیسا کہ اس کے دوسرے نام ''تحفۂ سخنوران'' سے ظاہر ہوتا ہے۔

رشکؔ نے لغت میں فارسی مفردات کو جگہ نہیں دی کہ ''طالبِ اردو کو فارسی لغت میں مل جائے گا'' اور اس طرح اپنی لغت کو محض مرکبات، اردو کے محاورات اور امثال کے لیے وقف رکھا امیرؔ نے اس سے زیادہ وسیع پیمانے پر کام کیا اور اپنے احاطے ان میں فارسی اور عربی مفردات سے لے کر جو ہمارے ہاں نظم و نثر میں مستعمل ہیں امثال محاورات اور اصطلاحات کا بالتفصیل تذکرہ کیا۔ ان دونوں کے بیچ میں جلالؔ کا راستہ ہے انھوں نے رشکؔ کی طرح تمام مفرداتِ فارسی کو اپنے ہاں سے خارج البلد نہیں کیا اور اسی کے ساتھ ساتھ محاورات، کنایات، اور امثال کی تفصیل میں بھی نہیں پڑے اس طرح ان کی لغت جامع و مانع تو نہیں ہوئی لیکن بہت بڑی حد تک کفایت ضرور کرتی ہے۔ یہ رہنما زبان کے پرخار راستوں پر ہماری رہنمائی اور اکثر جگہ خود دوسری لغات کی رہنمائی کرتا ہے۔ محاورات اور مصطلحات کے سلسلے میں یہ کارنامہ تحقیقی نہیں بلکہ زیادہ تر یادداشت پر منحصر ہے اور ذہن میں جس قدر مرکبات اور محاورات آئے ہیں لکھ دیے گئے ہیں۔ جتنی کچھ جانفشانی کی گئی ہے وہ اساتذہ کے کلام سے سند ڈھونڈنے اور نظائر تلاش کرنے میں صرف ہوئی ہے، مثال کے طور پر ''پیٹ'' کے ضمن میں وہ لاتعداد امثال نقل کرتے ہیں اور ان کی سندیں دیے چلے جاتے ہیں۔

پیٹ بھرا، پیٹ بھرنا، پیٹ پاٹنا، پیٹ پالنا، پیٹ چلنا، پیٹ رکھوانا، پیٹ رہ جانا، پیٹ سے

پاؤں نکالنا، پیٹ سے ہونا، پیٹ کا دھندا، پیٹ کا ہلکا، پیٹ کو لگانا، پیٹ کے بال، پیٹ کی مار، پیٹ کے لیے دوڑنا، پیٹ گرانا، پیٹ لگ جانا، پیٹ میں پانی نہ پچنا، پیٹ میں بیٹھنا، پیٹ میں گھسنا، پیٹ میں چوہے چھوٹنا، پیٹ والی۔

جیسا کہ ظاہر ہے کہ اس میں اکثر محاورے صرف روزمرہ کی بات چیت میں آتے ہیں اور کسی استاد کے کلام سے سند پیش کرنے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جلالؔ نے ان تمام محاورات کی سند اساتذہ کے کلام سے پیش کی ہے جو شاعری میں راہ پا سکتے تھے۔ ''پیٹ کا ہلکا'' کا محاورہ بحرؔ کے ہاں ملتا ہے:

بڑ مار اُٹھا چھپ نہ سکا رازِ محبت
ہر مست ہے شیشے کی طرح پیٹ کا ہلکا

اسی طرح پیٹ لگ جانے کا محاورہ ناسخؔ کے ہاں سے ڈھونڈ نکالتے ہیں۔

جویا بدل ماتحلّل کا پیٹ
چٹ کر گئی اشتہا تمام اپنا پیٹ
روٹی ہی کا اس کو ہے تصور دن رات
لگ جائے نہ کس طرح چپاتی سا پیٹ

''پیٹ مارنا'' بمعنی پیٹ میں چھری مار کر اپنے کو ہلاک کرنا۔ ناسخؔ کے ہاں سے اس کی سند لیتے ہیں:

نظر آیا جو پیٹ ساقی کا
شیشۂ مے نے اپنا مارا پیٹ

پیٹ میں پانی نہ پچنا کی نظیر پیش کرتے ہیں:

شیشے کی طرح پیٹ میں پچتا نہیں پانی
پی ہے مے غم راز چھپایا نہیں جاتا

اب کچھ ان شعرا کے بارے میں کہنا مناسب ہوگا جن کی اسناد اور نظائر جلالؔ نے اپنی لغت

میں پیش کیے ہیں ان اساتذہ میں سے سب سے اہم نام ناسخؔ کا ہے اور انھوں نے ہر جگہ کوشش کی ہے کہ ان ہی کے کلام سے سند پیش کریں اور اکثر جگہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ناسخؔ کے بعد رشکؔ و برقؔ سے سندیں لی گئی ہیں لیکن سب سے زیادہ سناد اسناد ناسخؔ کے بعد بحرؔ کے کلام سے ہیں۔ پرانے اساتذہ میں جراَتؔ، میرؔ، دردؔ، اور آتشؔ اور صباؔ زیادہ نمایاں ہیں۔ دہلی سے ذوقؔ اور غالبؔ کے نام ملتے ہیں۔ امیرؔ اور داغؔ سے کوئی سند نہیں دی گئی۔ اپنے کلام سے معدودے چند نظائر پیش کی ہیں اس سے ایک خالص لکھنوی استاد اور ناسخؔ دبستانِ شاعری کے ایک باعثِ فخر پیرو کی ذہنیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ لُغت میں جن مصطلحات اور محاورات کا تذکرہ کیا ہے وہ زیادہ تر وہی ہیں جو لکھنؤ میں بولے جاتے ہیں چونکہ ان کا مقصد اردو کی لغت کو اس پیمانے پر تیار کرنا نہ تھا جسے امیرؔ مینائی نے پیشِ نظر رکھا تھا اس لیے انھوں نے لکھنؤ کے محاورات اور مصطلحات سے واسطہ رکھا اور اسی مخصوص زاویے سے زبان کا جائزہ لینے کی کوشش کی تھی۔

اس مخصوص زاویۂ نظر کے باوجود ان کی لغت کا اردو زبان میں کیا مرتبہ ہے یہ اس وقت معلوم ہو سکتا ہے جب کہ ہم اس سے قبل لکھی ہوئی اور اس کے بعد میں لکھی جانے والی لغات کا جائزہ لیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس دور سے پیشتر ہمارے شعراء اور اساتذہ نے لغات کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور اس وقت جب کہ بچہ بچہ زبان کی باریکیوں اور بیان کی نکات سے اچھی طرح واقف ہے یہ بے توجہی حیرت ناک نہیں۔ لکھنؤ میں بحرؔ کی لغت سب سے پہلے اس توجہ کا پتہ دیتی ہے لیکن اس لغت کے بارے میں اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ بحرؔ کا خیال تھا کہ ایک لغت مرتب کی جائے اس کی تکمیل ہوئی یا نہیں اسے کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ اس کے بعد رشکؔ کی نفس اللغات آتی ہے۔ یہ لغت فارسی میں ہے۔ اردو محاورات کے معنی فارسی میں لکھے گئے ہیں اور اسی لحاظ سے فارسی مفردات کو انھیں اپنی لغت سے علیحدہ کرنا پڑا۔ رشکؔ کے سامنے اردو لغت کا کوئی واضح نمونہ موجود نہ تھا اور اس لیے انھیں اپنی یادداشت پر بھروسہ کرنا۔ پڑا یہ لغت کی ترتیب سے بھی ظاہر ہے کہ الفاظ حتی الامکان ذہن پر زور دے کر لکھے گئے ہیں مثلاً پیٹ، پیٹھ

اور بیٹا ساتھ ساتھ آتے ہیں اور اس کے پیٹ کے سارے محاورات لکھے گئے ہیں۔

جلالؔ کی لغت اس لغت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے اور اسی لیے اس کے بہت سے اسقام خود جلالؔ کی لغت میں آ گئے ہیں۔ جلالؔ نے اس پر سب سے زیادہ قابلِ قدر اضافہ یہی کیا ہے کہ جن باتوں کو رشکؔ نے اشاروں میں اور بغیر سند کے کہا تھا ان کی تفصیل اور نیز اساتذہ کے کلام سے اس کی سند پیش کی۔ جلال کی لغت نے رشکؔ کی لغت کو بہت کچھ استناد بخشا۔ اب تک جن الفاظ، مصطلحات اور محاوروں کو صرف رشکؔ نے ذاتی معلومات پر لکھ دیا تھا ان کی سندیں جلالؔ نے فراہم کیں اور اس طرح گویا اپنے استاد کے کلام کے اس حصے کو بھی پورا کر دیا جو نا تمام رہ گیا تھا۔ اسی لحاظ سے جلالؔ کی لغت اسناد و نظائر پیش کرنے میں زیادہ کام آنے لگی۔

جلال کی لُغت کا مرتبہ کیا تھا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ان کے مشہور ہم عصر امیرؔ مینائی جو خود ایک جامع مستند اور قابل قدر لغت کے مصنف ہیں جلالؔ کی سندیں پیش کرتے ہیں۔

”......مسالا......میری رائے ہے کہ اردو میں جو بولیں وہی لکھیں جس طرح مسالہ بولتے ہیں اسی طرح لکھا بھی جائے اور یہی مشرب متوسطین و متاخرین شعرائے لکھنؤ کا ہے جیسا کہ جناب رشکؔ نے اپنی لغت میں لکھا ہے......اور اس کی تقلید حضرت جلال لکھنوی نے اپنی لغت میں کی ہے۔“[۶]

جلالؔ نے اساتذہ کے اشعار سے استناد کے طریقے کا اپنی لغت میں اضافہ کیا تھا، محاورات و مصطلحات کی زیادہ تعداد چنی تھی اور تحقیقِ زبان اور تذکیر و تانیث کی طرف زیادہ توجہ دی تھی۔ امیرؔ مینائی نے اس سے آگے بڑھ کر استناد کا احاطہ وسیع تر کیا، محاورات و مصطلحات میں پیشہ وروں، مزدوروں، فقیروں اور عورتوں سبھی کے محاورات چنے اور قصے کہانیوں اور شاعروں کی سوانح عمریوں کا اضافہ کیا، تذکیر و تانیث پر وقت صرف کیا اور اس عمارت کو مکمل طور سے تعمیر کرنے کی کوشش کی جس کی بنیاد رشکؔ نے کھودی تھی اور جس کی خشتِ اول جلالؔ نے رکھی تھی۔

اس تحریک کی بہت بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ جلالؔ نے پہلے ایک اردو کی لغت ”گلشنِ فیض“ کے نام سے فارسی میں لکھی تھی۔ یہ لغت بہت کچھ رشکؔ کی لغت کی پیروی تھی، اس کے بعض الفاظ اور محاورات پر لوگوں نے اعتراضات کیے اور اعتراض کرنے والوں کی صف میں ان کے درباری معاصرین پیش پیش تھے اور ان اعتراضات سے لغت کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول ہوئی۔ ان میں سے کچھ اعتراضات صحیح بھی تھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلالؔ نے ان اعتراضات کو پیشِ نظر رکھا۔ ”گلشنِ فیض“ کے بعد ”سرمایۂ زبان اردو“ مرتب ہوئی۔ کچھ لفظ ایسے ہیں جو ”گلشنِ فیض“ میں ملتے ہیں مگر ”سرمایۂ زبان اردو“ میں نہیں ملتے۔ اس کی دو وجہ ہوسکتی ہیں ایک یہ کہ انھوں نے فارسی لغت میں کچھ ایسے الفاظ دینا مناسب سمجھا ہو جو اردو میں عام ہیں اور اردو کی لغات میں نہ دیے ہوں یا یہ کہ ان اعتراضات کا لحاظ کیا ہو جو دوسرے لوگ ان پر کر رہے تھے، ایسے لفظوں کی ایک مثال لفظ ”سنہ“ ہے گلشنِ فیض میں ہے:

سن: بسین مہملہ مفتوح بہ نون بمعنی سال آید

سنہ: بفتحتین و در آخر تائے موقوفہ و بفتح و بفتحہ سین مہملہ عضوے کہ بے حس و حرکت شدہ باشد و امر بود از شنیدن۔“ ۸

امیرؔ مینائی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ”سن بمعنی سال نہیں نکلتا فارسی میں بہت تلاش کیا کوئی سند قابلِ اعتبار نہ ملی ان معنی میں سنہ ہے۔ اردو میں بغیر ترکیب اگر سن بمعنی سال کہے تو تاویل ہوسکتی ہے محققین اس کی جگہ سال کہتے ہیں۔“ ۹

”سرمایۂ زبان اردو“ میں لفظ ”سن“ اس طرح ملتا ہے۔

”سن۔ بے حس و حرکت عضو اور خاموش و حیران آدمی“

اور اس کے سوا کوئی اور شکل نہیں ملتی۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ یا تو سرمایۂ زبان اردو میں داخل کرنا مناسب نہیں سمجھا گیا یا جان بوجھ کر داخل نہیں کیا گیا۔

بہر حال ــــــ یہ مانتے ہوئے کہ ”سرمایۂ زبان اردو“ کی قدر و قیمت ایک جامع لغت کی حیثیت سے نہیں ہو سکتی یہ کہنا پڑتا ہے کہ وہ لغت کے ابتدائی نمونوں میں سے ایک کامیاب اور بہت بڑی حد تک مکمل نمونہ ہے، کامیاب اس وجہ سے کہ جلالؔ کے سامنے جو مواد تھا وہ یقیناً ہمت افزا نہ تھا اور ان کی کوشش اولین کوششوں میں سے ایک ہونے کی حیثیت سے بہت کامیاب ہے اور مکمل اس وجہ سے کہ وہ امیر اللغات کی طرح اُدھوری نہیں اور دوسرے اس میں رشکؔ کی طرح ہر بات مصنف نے اپنے بوتے پر نہیں کہی بلکہ ہر لفظ اور محاورے کے لیے اساتذہ کے کلام سے استناد کیا ہے اور روز مرہ اور محاوروں کا صحیح طریقۂ استعمال بتایا ہے۔ لہٰذا کسی قدر محدود اور غیر جامع ہوتے ہوئے بھی جلالؔ کی یہ لغت ہماری زبان اور ادب کے ابتدائی کارناموں میں شمار کیے جانے کے قابل ہے۔

تنقیح اللغات

یہ رسالہ انتہائی کوشش کے باوجود کہیں دستیاب نہ ہو سکا البتہ اس کے بارے میں جو کچھ معلومات مل سکی ہے اس کو جمع کر کے پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت آرزوؔ اپنے مضمون کے آخر میں جلالؔ کی تصنیفات کے سلسلے میں اس رسالے کا بھی تذکرہ کرتے ہیں:

> ”صحت لغات میں ہے، مطبوعہ نسخہ دستیاب نہیں ہوتا۔ ایک قلمی نسخہ میرے پاس ہے جس میں سنہ تالیف درج نہیں۔“[۱۰]

سکسینہؔ نے عجیب و غریب طرح پر اس کا تذکرہ کیا ہے جلالؔ کی تصانیف کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

> ”سرمایۂ زبان اردو۔ جو محاورات و اصطلاحاتِ زبان اردو کی ایک مبسوط کتاب ہے...... اور (۵۔۶) دو لغات زبان اردو کے موسوم بہ ”تنقیح اللغات“ و ”گلشنِ فیض“[۱۱]

حالانکہ ''سرمایۂ زبان اردو'' کا جو اشتہار جلالؔ کے دیوان سوم ''مضمون ہائے دل کش'' کی پشت پر درج ہے اس میں صاف الفاظ میں ''سرمایۂ زبان اردو'' کو لغت قرار دیا گیا[12] ہے اور خود دیباچے میں جلالؔ نے اسے لغت قرار دیا ہے۔

> ''کسی سخن ور اردو زبان نے کوئی لغت ایسی کہ جامع ہو جملہ مفردات و مرکبات...... آج تک نہیں لکھی۔''[13]

جلالؔ نے اس عقدہ کو اس طرح حل کیا ہے

> ''......ہیچمدان کی تالیفات سے ۸ کتابیں تمام ہندوستان میں شائع ہیں کہ ہر ایک ان میں سے مطبوع طبائع و دل پسند یعنی تمام عالم ان کا خواہش مند ہے چنانچہ یہ آٹھوں کتابیں یہ ہیں۔ تنقیح اللغات۔ گلشن فیض۔ سرمایۂ زبان اردو لغت میں۔ مفید الشعرا بحثِ تذکیر و تانیث میں۔ افادۂ تاریخ بحث قواعد تاریخ گوئی میں۔ شاہد شوخ طبع اردو کا۔ دیوان اول کرشمہ گاہ سخن دیوان دوم مضمون ہائے دل کش۔ دیوان سوم......''[14]

اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ یہ رسالہ لغات قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ بہر حال اس کا تعلق صحت لغات سے ضرور ہے اور اس کے کئی ثبوت ملتے ہیں پہلا ثبوت خود اس سے قبل لفظ ''رسالہ'' کا استعمال ہوتا ہے ظاہر ہے کہ رسالے کا لفظ لغت سے پیشتر استعمال نہیں کیا جا سکتا دوسرا ثبوت نہایت قوی یہ ہے کہ ظہیر احسن شوقؔ نیموی عظیم آبادی اور جلالؔ کے دوسرے مخالفین نے جس انداز سے ''تنقیح اللغات'' کا تذکرہ کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لغات نہیں تھی بلکہ صحت لغات پر کوئی رسالہ تھا ظہیر احسن شوقؔ نیموی عظیم آبادی لکھتے ہیں:

> ''...... اس زمانے میں ایک رسالہ تنقیح اللغات نام مولفہ جناب حکیم میر ضامن علی صاحب جلالؔ لکھنوی میری نظر سے گزرا جس میں جا بجا لغزشیں پائیں، اکثر لفظوں کی نسبت بے جا تغلیط دیکھی، بیسوں الفاظ کی

فارسیت سے انکار پایا......"[۱۵]

"تنقیح اللغات" میں جو مباحث اٹھائے گئے تھے ان کا اس سے کچھ اندازہ ہوتا ہے۔

"تنقیح اللغات" کے جواب میں بہت سے رسالے نکلے جن میں سے ایک "ازاحۃ الاغلاط" کے نام سے ظہیر احسن شوقؔ نیموی کا رسالہ میری نظر سے گزرا۔ یہ رسالہ فارسی میں ہے اور اس میں "تنقیح اللغات" کے مختلف مسائل کا رد چھاپا گیا ہے۔ ظہیر احسن شوقؔ نیموی چونکہ منشی امیر اللہ تسلیمؔ کے شاگرد تھے رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں:

> "......کہا جاتا ہے کہ جلالؔ ایک مغرور و متکبر اور ہمچو من دیگرے نیست کے خیال کے آدمی تھے...... اپنے زمانے کے اکابر شعرا تک سے ملنے میں ان کو عار تھا۔ دوسروں کے اشعار کی تعریف کرنے کی انھوں نے قسم کھائی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا حقارت آمیز برتاؤ جھگڑے اور فساد کا باعث ہوا کرتا ہے چنانچہ تسلیمؔ کے ایک شاگرد ظہیر احسن شوقؔ نیموی نے دو کتابیں لکھ ڈالیں جس میں کہ جلالؔ کی خوب خبر لی گئی اور ان کے کلام کی غلطیاں نکالی گئیں......[۱۶]

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رسائل ذاتی مخاصمت اور جلالؔ و تسلیمؔ کے جھگڑوں کی بنا پر لکھے گئے اور اس کے جواب میں جلالؔ کے شاگردوں نے مختلف رسائل لکھے ان میں سے ایک رسالہ 'ردتردید موسوم بہ کتاب مجید بردِ تردید" کے نام سے سید محمد اسمٰعیل معاصی نے تصنیف کیا۔ اس رسالے کے جواب الجواب میں ظہیر احسن شوقؔ نیموی نے "سرمۂ تحقیق" کے نام سے ایک اور رسالہ نکالا اور اس رسالے کا جواب یہ فرض کر کے دیا کہ وہ حضرت جلالؔ کی تصنیف ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> "......اور جلال میں آ کر اس کی رد لکھ ہی ڈالی اور ردتردید غیر تاریخی نام اور کتاب مجید بردتردید اسم تاریخی رکھ کر اپنے ایک شاگرد کا نام ڈال کر

چھپوادی۔'' [۱۷]

اس کے ثبوت میں انھوں نے عجیب منطق پیش کی ہے۔

> ''......عبارت کہے دیتی ہے کہ اس کے مؤلف حضرت جلالؔ ہیں خصوصاً فافہم وفتامل جو آپ کا سخن تکیہ کہنا چاہیے اور آپ کی کل تصانیف میں ان کی کثرت پائی جاتی ہے۔ اس رسالے میں بھی ایک دو جگہ نہیں بیسیوں جگہ آیا ہے۔'' [۱۸]

ظاہر ہے ان باتوں سے یہ قیاس نہیں کیا جاسکتا کہ حضرت جلالؔ کی تصنیف ہے۔ ''سرمۂ تحقیق'' میں ''رد تردید'' کے لفظ لفظ سے اختلاف کیا ہے۔ مگر یہ بحث کہ ''ازاحۃ الاغلاط'' میں وارد کیے ہوئے اعتراضات میں سے کس قدر اعتراضات صحیح تھے اور کتنے محض بے بنیاد تھے فی الحال ہمارے دائرۂ بحث سے خارج ہے۔ ''رد تردید'' کی نسبت کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت جلالؔ کی تصنیف تھی۔ ''سرمۂ تحقیق'' نے ''رد تردید'' کے جواب میں جو کچھ لکھا اس کی کیا اصل ہے ہمیں اس سے بھی سروکار نہیں کیوں کہ یہ بحث ہمیں ایک لغت کے مصنف کی حیثیت سے جلالؔ کا مرتبہ متعین کرنے میں مدد نہیں دیتی۔ ہم ان رسائل سے صرف دو چیزیں دیکھ سکتے ہیں ایک یہ کہ ان میں ''تنقیح اللغات'' کا کیا پتا ملتا ہے اور دوسرے یہ کہ ''تنقیح اللغات'' میں انھوں نے جو اعتراضات وارد کیے ہیں ان کی نوعیت کیا ہے۔

ظہیر احسن شوقؔ نیموی لکھتے ہیں:

''تنقیح اللغات جس کے سبب سے حضرت جلالؔ اپنے زعم میں محقق نامور بنے ہوئے ہیں کسی زمانے میں مَیں نے اس کی خوب سیر کی ہے۔ آپ کا مآخذ غیاث اللغات ہے یا بہارِ عجم، سندوں کو دیکھیے تو بہار عجم کے لائے ہوئے اشعار کی بھرمار ہے، تتبع و تفحص کی تو ہوا تک نہیں لگی اور جہاں آپ نے اجتہاد فرمایا ہے وہ وہ بے تکی ہانکیں لگائی ہیں کہ خدا کی پناہ۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی مگر اس کی کوئی حد ہوتی ہے۔ اگر وہ رسالہ عشر عشیر بھی صحیح ہو تو غنیمت جانیے۔ میں نے ''ازاحۃ

الاغلاط‘‘ تو خاص ان کی رد میں لکھی نہ تھی کہ سب کا اظہار کرتا جہاں جہاں مناسب معلوم ہوا اس کا تدارک کر دیا تھا۔‘‘[۱۹]

جلالؔ کے اس سخت ترین مخالف کے بیان سے ’’تنقیح اللغات‘‘ کی بہت سی خوبیوں پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ تو پہلے ہی معلوم ہو چکا ہے کہ یہ رسالہ صحت لغات میں ہے۔ اس سے یہ چیز ثابت ہو جاتی ہے کہ لغات کی بحث میں حضرت جلال نے پرانے ماخذوں اور سندوں کو سامنے رکھا ہے اور جہاں کہیں ذاتی طور سے فیصلہ دیا اور اجتہاد کیا ہے وہ بھی ان ہی کی روشنی میں کیا ہے۔ ظہیر احسن شوقؔ نیموی کا یہ بیان کہ آپ کا مآخذ غیاث اللغات اور بہار عجم ہے اور پھر یہ کہنا کہ رسالہ عشر عشیر بھی صحیح نہیں متضاد بیانات ہیں۔ یا تو وہ سرے سے بہار عجم اور غیاث اللغات کی صحت سے بھی منکر ہو جائیں ورنہ رسالے کو اس سے کوئی نسبت نہ دیں۔ ایسی صورت میں تو رسالے کا عشر عشیر سے زیادہ غلط ہونا ممکن معلوم نہیں ہوتا۔

جس قسم کے اعتراضات ’’تنقیح اللغات‘‘ پر وارد کیے گئے ہیں وہ بھی عجیب ہیں مثلاً ’’تنقیح اللغات‘‘ کی بحث دوبارہ چھیڑتے ہوئے شوقؔ نیموی لکھتے ہیں:

’’...... میں نے جو اس رسالے میں اعادہ کیا ہے آپ کو نثر لکھنے کا ڈھنگ نہیں اور جا بجا ’’رد تردید‘‘ کی رکاکتِ عبارت دکھا دی ہے احتیاطاً اس ’تنقیح‘ کے دیباچے کی کچھ عبارت لکھی جاتی ہے......‘‘[۲۰]

اور اس کے بعد نثر کی غلطیاں پکڑنے کی کوشش کی ہے جو کہ ظاہر ہے نہایت لغو اور غیر متعلق ہے۔ اعتراضات جس طرح کیے جاتے تھے ان کی سب سے زیادہ صاف مثال ایک رسالہ ’’دنداں شکن‘‘ ہے۔ اس رسالے کو منشی محمد عبدالاحد قدسؔ نے لکھا ہے اور اس میں ۳۲ غلطیاں چھانٹی گئی ہیں۔

نمونے ملاحظہ ہوں:

’’(۱) رد تردید کا تاریخی نام ’’کتابِ مجید برد تردید‘‘ رکھا ہے جس سے قرآن پاک کے

ساتھ کمال درجے کی بے ادبی ہوتی ہے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف عالمِ باعمل لکھی ہے، یہ تعریف ایسی ہے جیسے سلطانِ ہفت اقلیم کو رئیسِ شہر لکھیں۔

(۳) صفحہ ۱۰ پر استادی المعظم لکھا ہے ظاہر ہے کہ یہاں ترکیب عربی ہے اور عربی میں استاد بواؤ و دال مہملہ نہیں بلکہ استاذ بے واو بذال معجمہ ہے یہاں استاد کی جگہ استاذ لکھنا تھا۔''؎۱

ان سب چیزوں سے اعتراضات کی نوعیت پر خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے چونکہ ''تنقیح اللغات'' باوجود کوشش دستیاب نہ ہوسکی اس لیے زیادہ دقیق اختلافات اور اعتراضات کا جائزہ نہیں لیا جاسکا۔ لیکن ان سب چیزوں سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ تنقیح اللغات صحت لغات میں ایک رسالہ تھا جس میں بقول شوق نیموی 'بہارِ عجم' اور 'غیاث اللغات' کی سند سے اور بہت سی جگہ ان ہی کی روشنی میں اجتہاد سے کام لیا گیا تھا۔

(منقول از ''جلال لکھنوی'' از محمد حسن، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۶ء)

حواشی:

(تمام حواشی محمد حسن صاحب کے قلم سے ہیں)

(۱) سرمایۂ زبان اردو۔ تقریظ میرزا ذاکر حسین یاس ۲۴۸

(۲) امیر اللغات۔ جلد اول دیباچہ ۳

(۳) حضرت کاوش جلال کے ارشد تلامذہ میں سے تھے اور جب بھی رام پور جاتے ان ہی کے ہاں قیام فرماتے تھے، ان کے صاحبزادے مکرمی جناب ظفر شاہ خاں صاحب کا بیان ہے کہ حضرت جلال امیر مینائی سے اس بنا پر ناراض ہوگئے تھے کہ امیر نے ان کی اپنی تجویز کو ان سے لے کر خود جامۂ عمل پہنایا لیکن اس کے باوجود انھوں نے کبھی امیر کے کمال سے انکار نہیں کیا۔

(۴) سرمایۂ زبان اردو دیباچہ

(۵) امیر اللغات دیباچہ ص ۷

(۶) مکاتیب امیر مینائی بنام مولوی نور الحسن۔

(۷) اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جناب امیر مینائی اپنے ایک شاگرد نعیم الحق آزاد شیخپوری کو نہایت اشتیاق سے لکھتے ہیں:

"رشک مرحوم نے کس کتاب میں تانیث و تذکیرِ حروف تہجی کا تذکرہ کیا ہے، اس کتاب کا نام و نشان ضرور لکھ دیں اور اگر آپ کے پاس ہو تو چند روز کو مستعار مجھے دیجیے۔

میرے نزدیک 'سیم' ضرور مذکر ہے اور میں نے مذکر ہی کہا ہے۔" مکاتیب امیر ص ۲۶۹

(۸) گلشنِ فیض

(۹) مکاتیب امیر مینائی ص ۲۶۹

(۱۰) رسالہ ہندوستانی جولائی ۱۹۳۳ء

(۱۱) سکینہ، تاریخ ادب اردو صفحہ ۴۴۲

(۱۲) آخر صفحہ دیوان سوم مطبوعہ انوری پریس گولہ گنج

(۱۳) دیباچہ سرمایۂ زبان اردو

(۱۴) دیباچہ قواعد المنتخب ص ا

(۱۵) دیباچہ سرمۂ تحقیق، ظہیر احسن شوق نیموی

(۱۶) سکینہ صفحہ ۴۴۳

(۱۷) دیباچہ سرمۂ تحقیق ص ۲

(۱۸) ایضاً ص ۳

(۱۹) سرمۂ تحقیق صفحہ ۴۴

(۲۰) سرمۂ تحقیق صفحہ ۴۴

(۲۱) سرمۂ تحقیق کے ساتھ ہی دو رسالے اور نکلے ایک "دنداں شکن" جو محمد عبدالاحد قدس کی تصنیف ہے اور دوسرا "طور مار تو بیخ" یہ بھی جناب قدس کی تالیف تھی دوسرے رسالے میں ان قطعاتِ تاریخ پر اعتراضات کیے گئے ہیں جو "ردِ تردید" کے آخر میں لکھے گئے ہیں۔

☆☆☆☆

محمد ذاکر حسین

مخزنِ فوائد ۱

دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح اردو زبان میں بھی لغت نویسی کی روایت قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہے، جس کا سلسلہ اب تک کی تحقیق کے مطابق خالق باری، لغات گجری اور واحد باری وغیرہ سے شروع ہو کر زمانۂ حال میں جدید علم لسانیات اور سائنٹفک اصولوں کو پیش نظر رکھ کر مرتب کی جانے والی فرہنگوں تک ملتا ہے۔ اس دوران اردو کی متعدد فرہنگیں لکھی گئیں۔ لیکن ۱۲۰۷ھ سے قبل جتنی بھی فرہنگیں مرتب کی گئیں، سب عام لغات سے بحث کرتی ہیں، مصطلحات ومحاورات وغیرہ کے لیے مخصوص نہیں۔ اس سلسلے کی اردو کی پہلی فرہنگ جو صرف مصطلحات کے لیے مختص ہو اور جس میں شعرا کے کلام سے سند دینے کا بھرپور التزام کیا گیا ہو، مرزا جان طپش دہلوی کی تالیف کردہ فرہنگ ''شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان'' ہے۔ یہ ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء میں زیورِ تحریر سے آراستہ ہو کر ۱۲۶۵ھ/۱۸۴۷ء میں مرشد آباد سے شائع ہوئی۔

''شمس البیان'' کے بعد بھی اردو کی متعدد فرہنگیں لکھی گئیں، جن میں مفتاح اللغات، عرف نام مالا (۱۲۳۶ھ)، دلیل ساطع از واصف (۱۲۴۸ھ)، نفائس اللغات از اوحدالدین بلگرامی (۱۲۵۳ھ)، اور نفس اللغة از رشک (۱۲۵۶ھ) اہم ہیں۔ لیکن یہ چاروں فرہنگیں بھی

عام لغات سے بحث کرتی ہیں، مصطلحات وغیرہ کے لیے مخصوص نہیں۔ نفائس اللغات اور نفس اللغتہ میں مفرد الفاظ کے ساتھ چند مصطلحات وغیرہ مل جاتے ہیں۔ تاہم تعداد میں کمی کے ساتھ اس کی سند میں شعرا کے کلام سے شواہد و نظائر نہیں پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے برعکس اس دوران چند کتابیں ایسی منظرِ عام پر آئیں، جو براہِ راست اردو لغت سے تعلق نہیں رکھتی ہیں۔ لیکن ان کے مؤلفوں نے افادۂ عام کی خاطر اپنی اپنی کتابوں میں ایک دو ابواب کو اردو مصطلحات و لغات کے لیے خاص کر دیا۔ مثلاً دریائے لطافت از انشا (۱۲۲۲ھ)، جس کے دردانۂ چہارم میں مصطلحاتِ دہلی، اور دردانۂ پنجم میں مصطلحاتِ زنانِ دہلی کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ ''دیوان ریختی'' از رنگین (۱۸۲۸ء) جس کے آغاز میں رنگین نے چند مشکل مصطلحات و محاورات کی ایک فرہنگ شامل کر دی ہے۔ اور ''رسالہ قواعد صرف و نحو اردو'' از صہبائی (۱۲۶۱ھ) جس کے دو ابواب لغات اور ضرب الامثال کے لیے خاص ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان مذکورہ کتابوں کے یہ ابواب ایک مختلف الفنون کتاب کا ایک حصہ ہیں۔ اس لیے اس میں وہ خصوصیات پیدا ہو ہی نہیں سکتیں، جو ایک لغت کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ پھر بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ باوجود اس کے ان میں ایک کمی یہ نظر آتی ہے کہ ان مؤلفوں نے کلامِ شعرا سے سند پیش کرنے کی روایت برقرار نہیں رکھی ہے۔

البتہ اس سلسلے کی اردو کی دوسری فرہنگ، جو کلامِ شعرا سے اسناد کے ساتھ مصطلحات وغیرہ کے لیے مختص ہو، نیاز علی بیگ نکہت دہلوی کی تالیف ''مخزن فوائد'' ہے۔ یہ ''شمس البیان'' کے ۵۴ سال بعد یعنی جولائی ۱۸۴۵ء/۱۲۶۱ھ میں لکھی گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ اولیت کا سہرا شمس البیان کے سر ہے اور یہ ایک اہم اور مستند رسالہ بھی ہے۔ لیکن یہ نکتہ بھی پیشِ نظر رہے کہ اس میں صرف مصطلحات ہی بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی زبان فارسی ہونے کے ساتھ یہ ایک مختصر رسالہ ہے، جس میں صرف ۲۹۰ مصطلحات ہی جگہ پا سکے ہیں۔ اس کے برخلاف مخزن فوائد کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں الفاظ کی تین قسمیں، اصطلاح، محاورہ اور مثل، کی گئی ہیں ساتھ ہی اس کی زبان بھی اردو ہی ہے۔ نیز یہ ایک ضخیم فرہنگ ہے، جس میں ۲۸۵۸ اصطلاحات، ۱۱۶

محاورات، ۱۱۱۸ امثال اور بدون ذکر اصطلاح وغیرہ ۱۲۸ الفاظ ہیں۔ گویا ۳۲۲۰ الفاظ پر مشتمل یہ ایک ضخیم فرہنگ ہے۔ اس سے شمس البیان کے بالمقابل اس کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔

مصنف کتاب:

''مخزن فوائد'' کے مصنف[2] نیاز علی بیگ نکہتؔ شاہ جہاں آباد کے رہنے والے تھے اور اپنے وقت کے ممتاز دانشوروں میں شمار ہوتے تھے۔ وہ ابتدا ہی سے ذہین اور فطین واقع ہوئے تھے اور طبیعت بچپن ہی سے شعر و سخن کی طرف مائل تھی، طبیعت کے اس رنگ کو شاہ نصیرؔ کی شاگردی نے مزید جلا بخشی۔ شعر و شاعری میں مہارت تھی اور مضامین بھی اچھے باندھتے تھے۔ اخلاق و مروت کا عمدہ نمونہ تھے۔ مزاج میں شوخی اور ظرافت بھری ہوئی تھی۔ فراخ دل اور کشادہ دست ہونے کی وجہ سے برابر مالی دشواریوں سے دوچار رہتے تھے۔ ابھی مالی مشکلات سے ابھر نہیں پائے تھے کہ دوسری مصیبت یہ پیش آئی کہ ان کا پاؤں ٹوٹ گیا اور ذریعۂ معاش کا حصول ایک مسئلہ بن گیا۔ تاہم وہ مایوس نہ ہوئے اور فوراً لاہور کا قصد کیا۔ اس وقت راجہ رنجیت سنگھ کا لڑکا راجہ شیر سنگھ گدی نشیں تھا۔ اس کی خدمت میں انھوں نے ایک قصیدہ پیش کیا۔ راجہ کو یہ قصیدہ کافی پسند آیا اور اس نے نکہتؔ کا وظیفہ دربار سے جاری کر دیا۔ رفتہ رفتہ دونوں میں اتنی قربت بڑھی کہ سیر و شکار میں بھی ان کی معیت لازمی قرار دے دی گئی۔ بے فکری اور خوش حالی کا یہ دور بھی دیرپا ثابت نہ ہوا اور جس دن راجہ کے ہاتھوں نکہت کو انعام و اکرام سے نوازا جانا تھا، اسی روز راجہ کو قتل کر دیا گیا۔ داد و دہش تو کیا ملتی خود نکہتؔ کو راہِ فرار اختیار کرنا پڑی۔ چنانچہ وہ پنجاب [کذا] چلے گئے اور جب یہ ہنگامہ فرو ہوا اور راجہ شیر سنگھ کا لڑکا نونہال سنگھ مسند نشیں ہوا تو یہ شاہ جہاں آباد چلے گئے اور باقی عمر گوشہ نشینی میں گزار دی۔ مخزن فوائد اور سکندر نامہ ان کی یادگار ہیں[3]۔

نکہتؔ کا تذکرہ مختلف تذکروں میں مل جاتا ہے۔ لیکن سوائے صاحب گلستانِ سخن کے کسی نے بھی تفصیل سے کام نہیں لیا ہے۔ اکثر نے صرف چند رسمی تعارفات پر اکتفا کیا ہے، جس سے

مصنف کی زندگی کے بہت سارے گوشے پوشیدہ رہ گئے ہیں۔

نسخے کی کیفیت:

"مخزن فوائد" آج سے ایک سو ترپن سال قبل یعنی ۱۸۴۵ء میں صرف ایک بار شائع ہوا اور جلد ہی اس کے نسخے نایاب ہو گئے۔ پھر اس کی دوبارہ اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر تذکرہ نویس بھی اس کتاب کے اصل نام سے واقف نہ ہو سکے۔ چہ جائیکہ اس کی تفصیل فراہم کرتے۔ یہ مطبوعہ نسخہ بہت دنوں تک اصحاب علم کی نظروں سے اوجھل رہا۔ اور جب ۱۹۵۴ء کے معاصر حصہ ۵ میں عندلیب شادانی مرحوم نے اس کا تعارف کرایا تو لوگوں کی نگاہیں اس طرف منعطف ہوئیں اور اس کتاب کی اہمیت و افادیت کا اندازہ ہوا۔ شادانی صاحب کے پیشِ نظر جو نسخہ تھا، اس کے متعلق وہ تحریر فرماتے ہیں:

> "جو نسخہ اس وقت میرے پیشِ نظر ہے، وہ کسی زمانے میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کی ملکیت تھا۔ یہ نسخہ ابتدا سے انتہا تک مکمل ہے۔ لیکن اس میں سرورق موجود نہیں۔ البتہ خاتمے پر اہل مطبع کی طرف سے چند سطروں کا اضافہ کیا گیا ہے، جس سے مطبع کا نام اور سنِ طباعت وغیرہ معلوم ہو جاتا ہے۔
>
> کتاب مخزن فوائد مشتمل اوپر اصطلاحات اور محاورات اور مثلوں زبان اردو کے مع اشعار و نظائر شعرائے نامی ہند تصنیف سرآمد شعرائے عالی فطرت، مرزا نیاز علی بیگ نکہت تخلص بموجب ارشاد مع الالقاب پرنسپل مدارس دہلی دام اقبالہم مطبع دارالسلام میں جو مکان منشی نورالدین احمد واقع محلہ پیپل مہادیو گذر شہر شاہ جہاں آباد میں ہے باہتمام عنایت حسین بانی مطبع چھاپہ کی گئی ماہ جولائی ۱۸۴۵ء۔"

اسی مطبوعہ نسخے کے خاتمے پر نکہت کے طبع زاد سترہ اشعار کا ایک قطعہ درج تھا، جس سے

معلوم ہوتا ہے کہ نورالدین احمد جو کمشنر دہلی کے میر منشی تھے، ان کی اعانت و دلچسپی سے مخزن فوائد کی طباعت عمل میں آئی۔

الحق ہیں حق شناس و حق آگاہ حق بنوش
ہاں نوردین احمدِ مرسل ہے ان کا نام
دہلی کا جواجنٹ و کمشنر ہے فخر جم
وہ میر منشی اس کے ہیں ذی لطف والکرام
دائم ہو ان کا منصرم کار کردگار
تائید سے انھوں کی ہوا یہ خوش انصرام

اور آخری شعر، جس سے کتاب کا سال تصنیف برآمد ہوتا ہے، یہ ہے۔

ملہم نے دی صدا از سرِ وجد غیب سے
تازہ بہار خلد ہے تاریخ اختتام

"تازہ بہار خلد" سے ۱۲۵۵ کے اعداد نکلتے ہیں اور "سر وجد" یعنی "و" کے چھ ملانے سے ۱۲۶۱ نکلتا ہے اور یہی مخزن فوائد کا سال تصنیف و طباعت ہے۔

نسخۂ شادانی کا باوجود تلاش بسیار کے اب تک کوئی سراغ نہیں مل سکا ہے خود انھوں نے بھی اس کی کوئی نشاندہی نہیں کی ہے۔ بہر کیف میں نے اس کتاب کی تدوین و ترتیب میں جن دو نسخوں سے مدد لی ہے۔ ان میں سے ایک انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان کی ملکیت ہے۔ اس نسخے کا زیراکس میرے پیش نظر ہے۔ ۳۴۰ صفحات پر مشتمل اس نسخے میں سرورق نہیں ہے۔ ساتھ ہی یہ ایک نامکمل نسخہ ہے، جس کے صفحات ۱۰۴ تا ۱۰۷ اور ۱۴۹ کے بعد ایک دو ورق غائب ہیں نیز لفظ "ہ" کے درمیان سے آخر تک کے بقیہ صفحات بھی غائب ہیں۔

دوسرا نسخہ "لغت محاورات اردو" کے نام سے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ میں محفوظ ہے۔ لیکن یہ صرف "مخزن فوائد" کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اس کے علاوہ جامع کتاب

نے ''دریائے لطافت'' اور ''محاورۂ زنان'' وغیرہ سے بھی الفاظ کی جمع آوری کا کام کیا ہے اور ان تینوں میں تفریق پیدا کرنے کے لیے انھوں نے الفاظ کی توضیح وتشریح کے بعد ''ازمخزن فوائد''، ''از دریائے لطافت'' اور ''در محاورہ زنان'' کے ذریعے اس کا حوالہ بھی دیا ہے۔ جس سے ہر ایک کی شناخت آسان ہوگئی ہے۔

گرچہ یہ ''مخزن فوائد'' کا مکمل نسخہ نہیں ہے، تاہم اس کا بڑا حصہ اس میں آ گیا ہے اور اسی کی مدد سے ان صفحات کی تکمیل کی گئی ہے، جو نسخۂ کراچی سے غائب تھے۔ اس نسخے کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں اصطلاح، محاورہ اور مثل وغیرہ درج نہیں کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پیشِ نظر کتاب میں جن مقامات پر نسخۂ خدا بخش سے استفادہ کیا گیا ہے وہاں ص (اصطلاح)، ح (محاورہ)، ث (مثل) کا اہتمام نہیں ملے گا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ دونوں نسخوں کی شناخت اس مذکورہ کتاب میں بآسانی ہو جائے گی۔

نسخۂ خدا بخش کے سلسلے میں ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ یہ نامکمل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مختصر نسخہ ہے۔ مؤلف نے اپنی صوابدید کے مطابق جسے چاہا نقل کیا اور جسے چاہا ترک کر دیا۔ چنانچہ دونوں نسخوں کے تقابلی مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ نسخہ خدا بخش میں ایک لفظ کے بعد کئی کئی الفاظ ترک کر دیے گئے ہیں۔ نیز ''ی'' کا تھوڑا حصہ ہی اس میں آ سکا ہے، موجودہ کتاب میں ''ہ'' کا بقیہ اور ''ی'' کا مکمل حصہ اسی سے اخذ کیا گیا ہے۔

طریق تالیف:

نسخۂ کراچی کی سترہ سطر پر مشتمل مؤلف کے دیباچے سے واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کی تالیف مسٹر بوترس کی فرمائش پر کی۔ نیز انھوں نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ اس لغت کو ''الف'' تا ''یا'' اٹھائیس ابواب پر منقسم کیا گیا ہے۔ اس کی تالیف میں مؤلف کا طریق کار یہ رہا ہے کہ اولاً واصطلاح، محاورہ اور مثل کو جلی حروف میں لکھتے ہیں، پھر الفاظ دیتے ہیں، پھر اس کی توضیح وتشریح اور اس کے بعد ''بقول انشا'' وغیرہ سے اس کی سند میں اشعار نقل کرتے ہیں۔ بطور

نمونہ ایک مثال ملاحظہ ہو:

اصطلاح الف اللہ یعنی اللہ واحد ہے اور نہیں شریک اس کا کوئی ۔ یہ اصطلاح آزاد فقیروں کی ہے کہ وہ ماتھے پر اپنے ایک الف سیاہ کھینچتے ہیں واسطے نشانی کے

بقول منیرؔ

خیالِ سروقد میں کب دل گمراہ اور میں ہوں
کہ میں آزاد ہوں بس ہے الف اللہ اور میں ہوں

بقول انشاؔ

ماتھے پہ مرے خط الف اللہ کا کھینچو، سونپو مجھے بستر
تم ہو، نہ گرو پیر یہ بندہ ہی ہو چیلا، جی سے کرے خدمت

لیکن مصنف کے اس طریق تالیف کو موجودہ تدوین میں برقرار نہیں رکھا گیا ہے بلکہ جدید علم لغت کے اصول کی پابندی کرتے ہوئے اس کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔ مثلاً مذکورہ بالا نمونے کو موجودہ تدوین میں یوں لکھا گیا ہے:

الف اللہ (ص) = اللہ واحد ہے اور نہیں شریک اس کا کوئی، یہ اصطلاح آزاد فقیروں کی ہے کہ وہ ماتھے پر اپنے ایک الف سیاہ کھینچتے ہیں واسطے نشانی کے:

خیالِ سروقد میں کب دل گمراہ اور میں ہوں
کہ میں آزاد ہوں بس ہے الف اللہ اور میں ہوں (منیرؔ)

ماتھے پہ مرے خط الف اللہ کا کھینچو، سونپو مجھے بستر
تم ہو نہ گرو پیر یہ بندہ ہی ہو چیلا جی سے کرے خدمت (انشاؔ)

یعنی مصنف کے درج کردہ اصطلاح، محاورہ اور مثل کے لیے بالترتیب ص، ح اور ث کا لفظ

وضع کیا گیا ہے اور الفاظ کے بعد قوسین میں اس کو درج کیا گیا ہے۔ نیز الفاظ کی تشریح سے قبل ''یعنی'' اور اس کے بعد ''بقول......'' وغیرہ کو ختم کر کے شعر کے سامنے قوسین میں شاعر کا نام لکھا گیا ہے۔

مخزن فوائد کے مآخذ:

نکہت نے اس کتاب کی تالیف میں کن مآخذ سے استفادہ کیا ہے؟ خود انھوں نے اس کے متعلق کچھ نہیں لکھا ہے۔ حالانکہ ''مخزن فوائد'' کی تالیف سے قبل اردو کی متعدد فرہنگیں مرتب کی جا چکی تھیں۔ اس لیے اگر یہ گمان کیا جائے کہ انھوں نے ان سب سے استفادہ کیا ہوگا تو میرے خیال سے بے جا نہ ہوگا۔ خاص طور سے الفاظ کی جمع آوری اور معانی کے تعین اور اس کی توضیح میں بڑی حد تک ان سے استفادہ کیا جا سکتا تھا۔ لیکن جب مخزن فوائد کا ان لغات سے تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو واضح ہوتا ہے کہ رنگین کے ''دیوان ریختی'' کے علاوہ مصنف کے پیش نظر کوئی اور مآخذ نہیں تھا۔ الغرض الفاظ کی تلاش، معانی کا تعین اور اسناد کی دریافت خود انھیں کرنی تھی اور انھوں نے کیا بھی۔ مزید وضاحت کے لیے ذیل میں ''مخزن فوائد'' کا ان لغات سے تقابلی مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے، جو صرف مصطلحات و محاورات وغیرہ سے بحث کرتے ہیں تا کہ ان مطالعات کی روشنی میں یہ واضح ہو سکے کہ مصنف کے پیش نظر کون سا مآخذ تھا۔

اس ضمن میں سب سے پہلا نام جو سامنے آتا ہے وہ ''شمس البیان'' کا آتا ہے، جس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ اردو کی پہلی فرہنگ ہے جو مصطلحات وغیرہ کے لیے مخصوص ہے نیز مصنف نے ہر ایک کی مثال شعرا کے کلام سے دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ چونکہ اس کی تالیف مخزن فوائد سے ۵۴ سال قبل ہو چکی تھی۔ اس لیے اس سے استفادے کی بہت حد تک گنجائش نظر آتی ہے۔ لیکن دونوں کا تقابلی مطالعہ اس عام خیال کو مسترد کر دیتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کو یا تو اس کے بارے میں معلوم نہ تھا یا وہ اس کا کوئی نسخہ مہیا نہیں کر پائے ہوں گے۔ کیونکہ دونوں فرہنگوں میں بہت سی اصطلاحات مشترک ہیں۔ لیکن دونوں نے سند میں الگ الگ شعر نقل

کیا ہے۔ مثلاً

شمس البیان	مخزن فوائد
پانی پی پی کوسنا = کنایہ از کثرت بددعاست کہ در ہیچ حال فوت نکند۔ مرزا علی نقی محشر کا شعر	پانی پی پی کوسنا= جلے دل کو ٹھنڈا کر کر کے اور دم لے لے کر بددعائیں دیتے ہیں۔ رنگین اور جرأت کے شعر۔
تنکے چنے= کنایہ از غلبہ سکر کہ نہایت بیہوشی آرد و مجازاً در محل مسخ شدن نیز مستعمل۔ شرف الدین مضمون کا شعر	تنکے چنے= دیوانہ اور مجنون اور سودائی ہو گیا۔ ظفر، نصیر، معروف اور رنگین کے اشعار

اس کے علاوہ بعض مصطلحات کے معنوی تعین میں بھی دونوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً

ہاتھ اٹھانا ایک چیز سے= دست بردار شدن از امریست۔ مصطفیٰ خاں کا شعر	ہاتھ اٹھایا= اول فاتحہ پڑھنے کے معنی ہیں دوسرے ترکِ دنیا کے ہیں یعنی دست بردار ہوا۔ میر اور نکہت کے اشعار

نیز بہت سے مصطلحات ایسے بھی ہیں، جو شمس البیان میں تو موجود ہیں لیکن مخزن فوائد سے غائب ہیں مثلاً آش، آش پکانی، اودھیڑ بننا، اودھیڑ بن، آنکھوں میں آنا، بک لگنی، بک بک، بسرام لینا وغیرہ۔ اس کے برعکس دو چار مصطلحات ایسے بھی نظر آتے ہیں، جس کی سند میں دونوں نے ایک ہی شعر نقل کیا ہے۔ میرے خیال سے یہ ایک اتفاقی امر ہے اور ایسا اکثر کے یہاں پایا جاتا ہے۔ اس لیے اسے بطور ثبوت پیش نہیں کیا جا سکتا چنانچہ میرے رائے میں مخزن فوائد کی تالیف کے وقت مصنف کے پیش نظر شمس البیان نہیں تھی۔

انشا کی کتاب "دریائے لطافت" بھی مخزن فوائد سے ۳۷ سال قبل یعنی ۱۲۲۲ھ/۱۸۰۸ء میں مرتب ہوئی۔ جس کے دروانہ چہارم اور دردانۂ پنجم میں بالترتیب مصطلحاتِ دہلی اور مصطلحاتِ

زنانِ دہلی کو شامل کیا گیا ہے۔ اندازہ تھا کہ یہ کتاب بھی نکہتؔ کے مآخذ میں ہونی چاہیے۔ لیکن دونوں کا تقابلی موازنہ اس اندازے کو غلط ثابت کرتا ہے۔ ایک دو مثالوں سے اس کی وضاحت ہو جائے گی:

دریائے لطافت (مترجمہ برجموہن دتاتریہ کیفی)	مخزنِ فوائد
آنکھوں کے اندھے نام نین سکھ = ایک بات کا دعوی کرے مگر اس سے مناسبت نہ ہو (ص ۱۰۵)	نادان محض ہیں اور دعویٰ ہمہ دانی کا ہے
جی چراتا ہوں = اس کام سے پرہیز کرتا ہوں (ص ۱۰۵)	پہلوتہی کیا اور کنارہ کش ہوا اور دوسرے معنی وزدی کرنے کے ہیں۔
گھر کی مرغی دال برابر = یہ فقرہ اس مقام پر بولتے ہیں جب کوئی اپنے بیٹے یا عزیز یا دوست یا وفادار غلام یا لائق ملازم کی قدر نہیں کرتا اور دوسروں کی تعریفیں کرتا ہے اور روپیہ خرچ کر کے ان سے کام لیتا ہے۔ (ص ۱۰۶)	جو شخص کہ بدوضع اور قماش ہیں ہوتا ہے اس کو اپنی بیوی سے رغبت نہیں ہوتی اور لذت نہیں اٹھتی۔

رنگینؔ کا "دیوانِ ریختی" بھی ان کتابوں میں ہے، جس کی تالیف مخزنِ فوائد سے ۱۷ سال قبل یعنی ۱۸۲۸ء میں عمل میں آئی۔ دونوں کتابوں کے تقابلی مطالعے کے بعد ایسے شواہد ملتے ہیں، جس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ نکہتؔ نے اس "دیوان" سے استفادہ کیا ہے۔ کیوں کہ اس "دیوان

ریختی" کے "فرہنگِ الفاظ" کے سارے کے سارے الفاظ مخزن فوائد میں موجود ہیں۔ نیز بعض الفاظ کی تشریح و توضیع میں دونوں کی عبارتوں میں اتنی مشابہت اور یکسانیت پائی جاتی ہے کہ رنگین کی عبارت اصل اور نکہت کی نقل معلوم ہوتا ہے۔ ساتھ ہی جو اشعار نقل کیے گئے وہ رنگین ہی کے ہیں۔ بطور نمونہ دو مثالیں ملاحظہ ہوں۔

دیوان ریختی	مخزن فوائد
باجی= اس کو کہتے ہیں کہ جو چھوٹے سن میں جنتی ہے تو اس کو اس کی بیٹی اگر ماں کہے تو شایان شان نہیں۔ پس وہ باجی کہتی ہے۔ غرض یہ لفظ ترکی کا ہے باجی بہن کو کہتے ہیں۔ (دیوان رنگین، انشاء ص ۵)	اس کو کہتے ہیں کہ جو عورت چھوٹی عمر میں صاحبِ اولاد ہوتی ہے اگر اس کی بیٹی یا بیٹا اسے ماں کہے تو پھبتا نہیں اور یہ خوف ہوتا ہے کہ نظر نہ لگے وہ لاڈ سے باجی کہتے ہیں۔ یہ لفظ ترکی کا ہے کہ ترکی زبان میں چھوٹی بہن کو باجی کہتے ہیں۔
گوئیاں= اصطلاح پورب کی ہے۔ یہ لفظ اگرچہ اردو میں ٹکسال باہر ہے اور بیگمات کے نزدیک بھی معیوب ہے۔ لیکن حال میں ازراہ تمسخر کے اکثروں کی زبان پر آجاتا ہے۔ مگر ان سب باتوں سے مراد یہ ہے کہ اکثر باہم چپٹی کھیلنے والیوں کے یہ رشتہ ہوتے ہیں (ایضاً ص ۴)	یہ اصطلاح پورب والوں کی ہے۔ اگرچہ محاورے میں بیگمات کے نہیں، اس واسطے یہ لفظ ٹکسال سے باہر ہے اور بیگمات قلعہ معلیٰ شاہ جہاں آباد کے نزدیک معیوب ہے، لیکن اب ہنسی کی راہ سے اکثروں کی زبان پر آجاتا ہے۔ البتہ وہ باعث سند کا باہر والوں کے ہے۔ مگر اس نام سے مراد یہ ہے کہ اکثر آپس میں چپٹی کھیلنے والیوں کے ایسے رشتے ہوتے ہیں۔

اب رہا امام بخش صہبائی (م ۱۸۵۷ء) کا "رسالہ قواعدِ صرف و نحو" جس کا ایک باب

''لغات'' اور ایک باب ''ضرب الامثال'' کے لیے مختص ہے تو چونکہ مخزن فوائد اور اس کا سال تصنیف وطباعت ایک ہی ہے۔ اس لیے اس سے استفادے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے۔ البتہ دونوں کتابوں میں قدرِ مشترک جو چیز ہے وہ یہ کہ یہ دونوں مسٹر بوترس کی فرمائش پر لکھی گئیں۔

ان مطالعات کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نکہتؔ نے سوائے رنگینؔ کے ''دیوان ریختی'' کے کسی اور مآخذ سے استفادہ نہیں کیا ہے۔ البتہ شعرا کے دواوین /کلیات ضرور ان کے مطالعے میں رہے ہوں گے۔ انھوں نے بطور سند جن شاعروں کو شامل کیا ہے۔ وہ یہ ہیں:

آبرو، آخر، آشنا، آشفتہ، آفتاب، خان آرزو، اثر، احمد، افسوس، امیر، امین، انشا، احمدی، اسد، امیر خسرو، بیدم، بقا، بیتاب، بیدار، بے جان، بیغم، بہار، بیمار، پاکباز، تجمل، تسکین، تمکین، تاباں، تسلی، ترساں، ثنا، جہاندار، جرأت، جلیس، حسرت، حسن، حفیظ، حشمت، حقیقت، حیف، حیرت، شاہ حاتم، حیراں، حقیر، خواجہ حسن، خادم، درد، دردمند، ذوق (الف خاں)، ذوق، ذوقی، رضا، رفعت، رنگین، رفاقت، رقت، رند، رافت، زار، زکی، سرور، سُرور، سائل، سوز، سودا، سبقت، سلطان، سید، سجاد، سعادت، شور، شوق، شیفتہ، شاعر، شیدا، شہیدی، شاہ، صنعت، صادق، صلاح، ضیا، طاہر، طپش، ظفر، عشق، عاصی، عظیم، عشرت، غافل، غالب، غضنفر، غیرت، فرحت، فراق، فدوی، فریفتہ، قائم، قسمت، قدرت، قلندر، قوت، قیس، قاسم، قاصر، کامل، کرم، کمال، کفایت، گویا، محب، مصحفی، معروف، مہر، منیر، میر، مومن، منعم، ممنون، مسرور، محبت، مظفر، منتظر، محشر، مقتول، مشتاق، محنت، منشی، مہدی، محزون، معین، مہجور، نثار، ناسخ، نعیم، شاہ نصیر، نکہت، نوا، ندیم، ناصح، نیاز، نہاں، والا، وحدت، والہ، وسعت، واقف، ہوس، ہمت، ہدایت، ہمدم، یقین وغیرہ۔

ظاہر ہے کہ اتنے شاعروں کے اشعار موقع محل کی مناسبت سے زبان زد ہونا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ اس کے لیے مصنف کو ضرور ان کے دواوین کا مطالعہ کرنا پڑا ہوگا۔

مخزن فوائد بحیثیت مآخذ:

''شمس البیان'' کی طرح ''مخزن فوائد'' بھی برابر مآخذ میں شمار ہوتا رہا ہے اور بعد کے

لغت نگاروں نے اس سے بھرپور فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ جس کے شواہد موجود ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ استفادہ کرنے والوں نے دیدہ و دانستہ اس کا اعتراف نہیں کیا۔ کیوں کہ انھیں اس بات کا خوف تھا کہ ”لڑکپن سے علم، زبان اور تدوین لغات کا جو عشق“ ان کے سر سوار تھا، کہیں اس کی قلعی نہ کھل جائے۔ ان حضرات کی اس علمی خیانت سے برسوں علمی دنیا ایک اہم مآخذ سے محروم رہی۔

مخزن فوائد کے بعد ویسے تو متعدد اردو لغات لکھی گئیں۔ لیکن ان میں جو سب سے زیادہ مشہور ہوئیں اور جنھیں بطور مآخذ آج بھی استعمال کیا جاتا ہے ان میں فرہنگ آصفیہ از سید احمد دہلوی (۱۸۹۲ء)، امیر اللغات از امیر مینائی (۱۸۹۱ء)، نور اللغات از نور الحسن نیر کاکوروی (۱۹۱۷ء) اور مہذب اللغات از مہذب لکھنوی (۱۹۶۰ء) ہیں[۴]۔ ان میں صاحب مہذب اللغات کے علاوہ کسی نے بھی اپنے مآخذ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ امیر اللغات اور نور اللغات پر تو خود صاحب فرہنگ آصفیہ نے سرقہ کا الزام لگایا ہے[۵]۔ اب رہی فرہنگ آصفیہ تو اس کا تقابلی مطالعہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے تا کہ اس کی حقیقت بھی کھل کر سامنے آ جائے۔

”فرہنگ آصفیہ“ کی تالیف ”مخزن فوائد“ کے ۴۷ سال بعد یعنی ۱۸۹۲ء میں ہوئی گرچہ اس پر کام ۱۸۷۸ء سے قبل ہی شروع ہو چکا تھا۔ لیکن بزعم مصنف ”چند موانعات“ کی وجہ سے اس میں تاخیر ہوتی چلی گئی۔ الغرض اس فرہنگ کا شمار ابتدا ہی سے اردو کے معتبر و مستند مآخذ میں ہوتا چلا آ رہا ہے۔ جس کی مآخذیت آج بھی برقرار ہے۔ لیکن اس کا سب سے تاریک پہلو، جس کی طرف ابھی تک اہل علم کی نگاہیں منعطف نہیں ہوئی ہیں، یہ ہے کہ اس فرہنگ کی تالیف میں نیاز علی بیگ نکہت کے مخزن فوائد سے نقل کی حد تک استفادہ کیا گیا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مصنف اپنی علمی دیانت داری کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے دیباچے میں اس اہم مآخذ کا تذکرہ ضرور کرتے تا کہ علمی دنیا ایک اہم مآخذ سے روشناس ہو جاتی۔ لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کے برخلاف ایک نیا ہی راگ الاپا کہ:

> ”ایک کشمیری دشمن نما دوست نے ہمارا انطباع لغات کی غرض سے امانتی

> رکھا ہوا اکٹھا تین ہزار روپیہ غصب کر لیا...... آتش زدگی نے ہمارا دل جلایا۔ تصنیف کے ڈاکوؤں نے ہماری تصنیف پر ہاتھ مارا اور دن دہاڑے ڈاکہ ڈالا...... بعض نامی گرامی شاعروں، عربی فارسی کے ماہروں، فن سے ناآشناؤں نے ارمغان دہلی کا چربہ اتار کر لغت تراشی پر کمر باندھی...... جس طرح جامع امیر اللغات نے ارمغان دہلی مطبوعہ ۱۸۷۸ء میں لفظ ''آنکھ'' لے کر اس کے مشتقات اور معانی کی ہو بہو نقل بطور نمونہ چھاپی تھی۔ اسی طرح مؤلف نور اللغات نے بھی ان کی پیروی کر کے سنہ اشاعت سے پورے تین قرن بعد فرہنگ آصفیہ سے لفظ ''بات'' اور اس کے مشتقات کی ہو بہو نقل بطور نمونہ شائع فرمائی۔''[۶]

اس قسم کے الزامات کے پس پردہ مصنف کی یہ حکمت عملی کارفرما تھی کہ وہ خود ان الزامات سے بری ہو جائیں جو دوسروں پر لگائے ہیں۔ ڈاکٹر حامد حسن قادری نے مصنف کے ان الزامات کا تجزیہ کرتے وقت دوٹوک باتیں لکھی ہیں:

> ''یہ بڑا سخت اعتراض ہے۔ حضرت امیر مینائی اور مولوی نور الحسن نیر کاکوروی ایسے آدمی نہ تھے کہ کسی کی کتاب ہو بہو نقل کر کے اپنے نام سے چھپوا دیں۔ ہمارے سامنے فرہنگ آصفیہ، امیر اللغات اور نور اللغات تینوں موجود ہیں۔ اور ہم نے لفظ آنکھ اور لفظ بات کو ان میں پڑھا ہے۔ بات یہ ہے کہ الفاظ اور محاورات کسی خاص مصنف کی ملکیت نہیں ہوتے۔ ہر شخص ان کو تلاش کر سکتا ہے۔ البتہ پہلی مرتبہ جمع کر کے مرتب کر دینا مؤلف کا کارنامہ ہوتا ہے۔ لیکن لغات کی تشریح اور سند کے اشعار بلاشبہ جامع و مؤلف کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ان کی ہو بہو نقل بے شک سرقہ اور قابل الزام ہے۔''[۷]

قادری صاحب کے مذکورہ بالا تجزیے سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ ہوتے ہیں:

۱۔ پہلی مرتبہ الفاظ و محاورات کی جمع آوری مؤلف کا کارنامہ کہلاتا ہے۔
۲۔ لغات کی تشریح اور سند کے اشعار بلاشبہ جامع اور مؤلف کی ملکیت ہوتے ہیں۔
۳۔ لغات کی تشریح اور سند کے اشعار کی ہو بہو نقل بے شک سرقہ اور الزام کے زمرے میں آتی ہے۔

اس کی روشنی میں اگر مخزن فوائد اور فرہنگ آصفیہ کے تقابلی مطالعہ کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو اس کو چار اقسام میں منقسم کرنا پڑے گا۔ جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

اول: تشریحات اور اسناد میں مطابقت:

ان دونوں فرہنگوں کے تقابلی مطالعے کے دوران جو چیز سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ یہ کہ ان دنوں لغات میں ایسے الفاظ کثیر تعداد میں ہیں، جن کی تشریحات و توضیحات اور ان کے شواہد و نظائر میں اس حد تک مطابقت پائی جاتی ہے کہ اول لمحے میں معلوم ہوتا ہے دونوں ایک ہی لغت کے دو ایڈیشن ہیں۔ جب کہ ان دونوں کے درمیان ۳۳ سال کا ایک لمبا عرصہ حائل ہے۔ کیوں کہ ''مخزن فوائد'' (۱۸۴۵ء) کی طباعت کے ۳۳ سال بعد یعنی ۱۸۷۸ء میں صاحب فرہنگ آصفیہ نے اس پر کام کرنا شروع کیا تھا، جس کا نتیجہ ۱۸۹۲ء میں فرہنگ آصفیہ کے نام سے سامنے آیا۔ گویا مخزن فوائد کو فرہنگ آصفیہ پر تقدم زمانی حاصل ہے۔ اس زمانی فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے دیکھا جائے تو فرہنگ آصفیہ ہی شک و شبے کے گھیرے میں آتی ہے۔ یہ درست ہے کہ الفاظ اور محاورات کسی خاص مصنف کی ملکیت نہیں ہوتے بلکہ اسے ہر شخص تلاش کر سکتا ہے البتہ لغات کی تشریح اور سند کے اشعار بلاشبہ جامع و مؤلف کی ملکیت ہوتے ہیں، ان کی ہو بہو نقل بے شک سرقہ اور قابل الزام ہے۔ اور صاحب فرہنگ آصفیہ بلا ریب اس کے مرتکب ہوئے ہیں۔ یہ صرف قیاسی باتیں نہیں ہیں بلکہ اس کے شواہد و نظائر موجود ہیں۔ مثلاً:

مخزن فوائد	فرہنگ آصفیہ
پارے کی دیوار = وہ دیوار کہ جو بے گارے اور چونے فقط سنگ و خشت سے چنی جائے۔ معروفؔ اور خود اپنا شعر۔	وہ دیوار جو گارے اور چونے کے بغیر صرف پتھروں سے چنی جائے۔ صرف معروفؔ کا شعر۔
پتھر تلے کا ہاتھ = عالم مجبوری اور بے اختیاری اور ناچاری اور بے بسی۔ دردؔ، جرأتؔ، شاہ نصیرؔ، عظیمؔ اور خود مصنف کے اشعار	مجبوری اور بے اختیاری کا عالم، ناچاری، بے بسی۔ دردؔ اور جرأتؔ کے اشعار۔
کنویں کی مٹی کنویں کو لگتی ہے = جس قدر آمد ہوتی ہے اتنا ہی خرچ ہوتا ہے۔ شاہ نصیرؔ کا شعر۔	جس قدر آمدنی ہوتی ہے اسی قدر خرچ ہوتا ہے۔ شاہ نصیرؔ کا شعر۔
کانا ٹو بدھو نفر = عیب میں عیب۔ رنگینؔ کا شعر۔	عیب میں عیب……رنگینؔ کا شعر
کاکلود = فرط الفت کا تقاضا اور بے قراریٔ محبت سے ناچار ہونا۔ رنگینؔ کا شعر۔	……فرط الفت کا تقاضا۔ رنگینؔ کا شعر۔
کڑھنا پچنا = غمگین و آزردہ دل ہونا اور یاد کرنا اور جدائی میں رونا۔ انشاؔ کا شعر۔	غمگین اور آزردہ خاطر ہونا، یاد کرنا، جدائی میں رونا۔ انشاؔ کا شعر۔
کس حساب میں ہے = دائرۂ حساب سے خارج	……دائرۂ حساب سے خارج ہے۔ محوؔ کا شعر۔
کانٹے بوئے = کارزشت و زبوں اور گناہ عظیم کیا۔ معروفؔ کا شعر۔	……کارزشت و زبوں اور گناہ عظیم کرنا۔ معروفؔ کا بھی شعر۔
کھلے بازار = سربازار اور بے خوف و اندیشہ۔ معروفؔ کا شعر۔	سربازار، بے خوف و خطر۔ معروفؔ کا شعر۔

کس کس دکھ کو جھیلا ہے= طرح طرح کے دردوغم اٹھائے ہیں...... رنگین کا شعر۔	طرح طرح کے دردو غم اٹھائے۔ رنگین کا شعر۔
کنوٹھا = بغل، کنار، آغوش اور براور پہلو۔ رنگین کا شعر۔	بغل، کنار، آغوش اور براور پہلو۔ رنگین کا شعر۔
کمر مار کر چلنا= کمری ہو جانا گھوڑے کا بارگراں سے...... معروف کا شعر	گھوڑے کا بارگراں کے سبب کمری ہو جانا...... معروف کا شعر۔
کمر مارے= صف لشکر کے درمیان حملہ اور حربہ کیا...... معروف کا شعر۔	صف لشکر کے درمیاں حملہ اور حربہ کرنا...... معروف کا شعر۔
کون پرائی آگ میں گرتا ہے= کوئی کسی کے عوض جانِ شیریں کو تلخ نہیں کرتا اور شریکِ رنج و بلا اور مصیبت نہیں ہوتا۔ معروف...... کا شعر۔	...... کوئی شخص کسی کے عوض جانِ شیریں کو تلخ نہیں کرتا اور شریکِ رنج و بلا و مصیبت نہیں ہوتا۔ معروف کا شعر۔
کھٹے پیالے کو جی چاہتا ہے= مباشرت کی رغبت اور خواہش ہے۔ رنگین کا شعر	مباشرت اور مجامعت کی خواہش کرنا...... رنگین کا شعر۔
کہاں سر پھوڑوں= کیا کروں اور کدھر جاؤں، کچھ تدبیر بن نہیں آتی ہے، عالمِ مجبوری ولا چاری ہے۔ معروف کا شعر۔	...... کیا کروں اور کہاں جاؤں، کچھ تدبیر بن نہیں آتی، عالمِ مجبوری اور امرِ ناچاری ہے۔ معروف کا شعر۔
کلا توڑ ہیں= برابر کے بھائی ہیں کسی بات میں اور ذات میں کم نہیں ہیں اور زبردست بھی ہیں۔ مؤلف کا اپنا شعر۔	برابر کا بھائی جو کسی بات اور ذات بلکہ زور قوت میں بھی کم نہ ہو۔ صاحبِ مخزن فوائد کا شعر۔
کس قطار میں ہے= کچھ قدر و منزلت اور توقیر و عزت نہیں رکھتا۔ مصحفی کا شعر۔	...... کچھ قدر و منزلت اور توقیر و عزت نہیں رکھتا۔ مصحفی کا شعر۔
کیا چلے = کچھ قابو اور ذرا اختیار نہیں ہے۔ عالم مجبوری اور باعثِ لاچاری ہے۔ مصحفی کا شعر۔	کچھ قابو اور ذرا اختیار نہیں ہے۔ عالمِ مجبوری اور باعثِ ناچاری ہے۔ مصحفی کا شعر۔

کوئی تقدیر کے لکھے کو نہیں مٹا سکتا= کسی کی تدبیر سے سرنوشتِ تقدیر دگرگوں نہیں ہوتی۔ انشا اور مؤلف کے شعر۔	کسی کی تدبیر سے سرنوشتِ تقدیر دگرگوں نہیں ہوتی۔ انشا اور صاحب مخزن فوائد کے شعر۔
کھوٹی راہ کرنی= عداوت سے بروقت روک رکھنا اور بے محل رخصت کرنا اور باز رہنا صلح سے اور بگاڑنا بنی بات کو۔ جرأت کا شعر۔	عداوت کے باعث بروقت روک رکھنا یا بے محل رخصت کرنا، صلح یا کام سے باز رکھنا، بنی بات کو بگاڑنا۔ جرأت کا شعر۔
گیہوں کی بال نہیں دیکھی= نادان اور ناواقف کار ہے کہ گھر سے باہر قدم نہیں نکالا۔ مؤلف کا اپنا شعر۔	......نہایت نادان اور ناواقف کار ہے کہ اس نے گھر سے باہر قدم نہیں نکالا۔ صاحبِ مخزن فوائد کا شعر۔
گونگے کا خواب= جس چیز کو آدمی دیکھے اور زبان سے کہہ نہ سکے۔ مؤلف کا اپنا اور جرأت کا شعر۔	وہ بات جسے آدمی دیکھے زبان سے کچھ نہ کہہ سکے۔ جرأت اور صاحبِ مخزن فوائد کا شعر۔
گہری سانس بھرنی= دمِ سرد کھینچنا اور دیر دیر میں سانس لینی۔ انشا کا شعر۔	......دمِ سرد کھینچنا، دیر دیر میں سانس لینا۔ انشا کا شعر۔
گھر بیٹھے بیر دوڑانا= از روئے سحر و جادو کسی کو اپنے گھر طلب کرنا۔ رنگین کا شعر۔	......سحر و جادو کے زور سے کسی کو اپنے گھر بلوانا۔ رنگین کا شعر۔
لال پردہ= وہ پردہ کہ در دولت خاص شاہی پر آویختہ رہتا ہے۔ مؤلف اور آتش کے اشعار۔	وہ سرخ پردہ جو خاص شاہی در دولت پر آویزاں رہتا ہے۔ نکہت اور آتش کے اشعار۔
لاکھ سر کا کیوں نہ ہو= زبردست، قوی ہیکل، فولاد بازو، پُرزور، دلیر، شجاع اور زردار کیوں نہ ہو۔ آتش کا شعر۔	بہت بڑا زبردست، قوی ہیکل، فولاد بازو، پُرزور، دلیر، شجاع، زردار...... آتش کا شعر۔
لگا بندھا= ملازمِ قدیم، محکوم، مطیع و فرماں بردار۔ مؤلف و میر کے اشعار۔	ملازمِ قدیم، محکوم، مطیع، فرماں بردار... نکہت اور میر کے شعر۔

لہو لگا کر شہیدوں میں ملے = بے سبب اور بے وجہ اپنے کو خرابی میں ڈالا۔ رنگین، مؤلف، شاہ نصیر اور ذوق کے شعر۔	بے سبب اور بلا وجہ اپنے کو خرابی میں ڈالنا۔ رنگین، نکہت، نصیر اور ذوق کے اشعار۔
موہت گھر دیکھ گئی ہے = جو آفت آئے گی وہ مجھ پر آئے گی۔ مؤلف کا شعر۔	...... جو آفت آئے گی وہ مجھ پر آئے گی...... نکہت کا شعر۔
منھ کہاں = کیا مجال اور کیا تاب و طاقت۔ میر حسن اور معروف کے شعر۔	کیا مجال اور کیا تاب و طاقت ہے۔ میر حسن اور معروف کے اشعار۔
منھ سے سنا چاہتے ہیں = برا سننے اور گالیاں کھانے کو جی چاہتا ہے۔ شاہ نصیر کا شعر۔	کیا گالیاں کھانے اور برا بھلا سننے کو جی چاہتا ہے۔ شاہ نصیر...... کا شعر۔
وہ کملی نہیں جس میں تل بندھتے تھے = وہ شئے نہیں کہ جس کے باعث خلق اللہ کی رجوع تھی اور نہ وہ حسن رہا کہ جو کوئی عاشق ہو۔ مؤلف اور رنگین کے اشعار۔	اب وہ چیز نہیں رہی کہ جس کے باعث خلق اللہ کی رجوع تھی یا وہ حسن نہیں رہا کہ جس پر کوئی عاشق ہو۔ نکہت اور رنگین کے شعر۔
وہ دن گئے = ایامِ جوانی و روزِ کامرانی پیری ہو گئے اور زمانہ موافق ہو گیا۔ جرأت اور سودا کے شعر۔	ایامِ جوانی و روزِ کامرانی پیری ہو گئے اور زمانہ ناموافق ہو گیا۔ جرأت، مصحفی اور سودا کے شعر۔
وہ دن بھی غنیمت تھے = ایامِ گذشتہ و سابق غنیمت و مغتنم تھے۔ جرأت کا شعر۔	ایامِ گذشتہ و سابق نہایت غنیمت اور مغتنم تھے۔ جرأت کا شعر۔
وہ نہیں تو اس کا بھائی اور سہی = کچھ ایک ہی پر مقرر اور موقوف نہیں اور سینکڑوں ہیں۔ میر کا شعر۔	کچھ ایک ہی پر مقرر اور موقوف نہیں اور سینکڑوں ہیں۔ میر کا شعر۔
وہ دل نہیں رہا = عشقِ سابق اور خواہش و محبتِ دیرینہ نہیں رہی۔ جرأت کا شعر۔	عشقِ سابق اور خواہش و محبتِ دیرینہ نہ رہی جرأت کا شعر۔

ہت تری کی = خدا تیرا خانہ خراب کرے اور دونوں جہاں میں ذلیل ورسوا ہو۔ شاہ نصیر، جرأت، رنگین، غازی، انشا اور طالب کے اشعار۔	......خدا تیرا خانہ خراب کرے، تو دونوں جہاں میں ذلیل ورسوا ہو۔ رنگین، شاہ نصیر، غازی، طالب، انشا اور جرأت کے اشعار۔
ہاتھ پر پٹھے نہیں رکھنے دیتا = نہایت چست و چالاک اور شوخ و شنگ ہے۔ مؤلف کا شعر۔	نہایت چست و چالاک اور شوخ و شنگ ہونا...... صاحب مخزن فوائد کا شعر۔
ہتھیلی پر سرسوں جمائی = کارِ سخت و دشوار تر کو بہت شتاب اور نہایت جلد بہ کمال چابکدستی انصرام کو پہنچایا اور طلسم سازی اور شعبدہ بازی کی کہ جس کے دیکھے سے خردِ دوربین آئینہ سا حیران و ششدر ہوئی۔ میر، نصیر، مومن اور میر حسن کے اشعار	......کار سخت و دشوار تر کو بہت شتاب اور نہایت جلد بہ کمال چابکدستی انصرام کو پہنچانا طلسم سازی اور شعبدہ بازی سے کوئی کام جھٹ پٹ کر کے دکھا دینا۔ ایسی جلدی کوئی کام کرنا کہ جس سے عقل حیران اور ششدر رہ جائے۔ میر، نصیر اور مومن کے اشعار۔

کہاں تک ان الفاظ کو گنایا جائے۔ چونکہ یہ مختصر مقالہ اس سے زیادہ کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اتنے پر بس کیا جاتا ہے۔ تاہم بطور ریکارڈ ان الفاظ کی ایک فہرست ذیل میں درج کی جا رہی ہے، جن کی تشریحات وتوضیحات اور اس کی اسناد میں ہو بہو یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ پورے الفاظ ریکارڈ ہونے سے رہ گئے ہیں:

کھوٹی کی، کہاں لاکر پھنسایا، کوئی ہے، کیا شاخ نکلی ہے، کمینے سے خدا کام نہ ڈالے، کس شمار وقطار میں ہے، کھٹ پٹ کرنی، کس پورے پر، کہاسنا، گور میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں، گہ بیٹھا، گنگا پار کیا، گٹکا، گھرے یار ہیں، گیا جان سے، گل بوٹا، گھمسان، گور کا منھ جھانکتا ہے، کنڈلی مارنا، گلیاں جھنکانا، گولی بچائی، لگی بری ہوتی ہے، لگ لگنے نہ دیا، لوں چلنا، لبڑ د، لالوں لال، لگانا بجھانا، لڑائی تلی، لاکھ چوہے کھا کر بلی حج کو چلی، لادنا پھاندنا، لال پری، لیمو کے چور کا ہاتھ کٹتا ہے، لگانے والے، مرغی کو تکلے کا گھاؤ یا داغ بہت ہے، منھ سے بولے نہ سر سے کھیلے، مزے کے مارے، ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں، ہوتے نہ مواجو کفن تھوڑا لگتا، ہاتھ پاؤں ٹوٹتے ہیں،

ہتھیلی کا پھپھولا، ہنسی میں اڑا دینا، ہم سے اڑتے ہو، ہوا میں آ گیا ہے، ہری بھری، ہتھیار ٹھنڈے کرنا، ہلکے لہو سے چل نکلے ہیں، ہمارے منہ میں بھی زبان ہے، ہٹ دھری، ہولے ہولے، ہونٹ ملنا، ہوک اٹھنا، ہلکان ہونا، ہاتھ چڑھنا، ہوائیاں منہ پر اڑتی ہیں، ہوا بنانا، ہلکا پھلکا، ہوائی دیدہ، ہرٹے، ہرتے پھرتے، ہونٹوں میں کہا، ہنس مکھ، ہاتھ میں دل رکھنا، ہوا مٹھی میں بند کی، ہم پر پھسل پڑے، ہمیں پیٹیے، ہاتھ پسارنا وغیرہ وغیرہ۔

دوم: اسناد کی ہو بہو یکسانیت:

سطور بالا میں ان الفاظ پر روشنی ڈالی گئی، جن کی تشریحات وتوضیحات اور اس کی اسناد میں ہو بہو مطابقت پائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایسے الفاظ بھی بکثرت تعداد میں ہیں، جن کے معانی و مطالب میں تو بالکل یکسانیت نہیں ملتی کیوں کہ صاحب فرہنگ آصفیہ نے اس میں ردو بدل کر دیا ہے۔ البتہ سند میں جو اشعار نقل کیے گئے ہیں وہ بعینہ مخزن فوائد [میں بھی] ہیں۔ چنانچہ جس طرح تشریحات وتوضیحات کی ہو بہو نقل سرقہ اور قابل الزام ہے، اسی طرح سند کے اشعار کی ہو بہو نقل بھی قابل گرفت ہے۔ ذیل میں ان الفاظ کی ایک فہرست دی جا رہی ہے، جن کے اسناد مثل مخزن فوائد ہیں تا کہ ان کی روشنی میں کسی نتیجے پر پہنچنے میں آسانی ہو:

پالا، پالا پڑنا، پانچ، پانی بہانا، پاؤں پڑنا، پاؤں کھینچنا، پاؤں نکالنے، پاؤں نکلا، پاؤں نہ دھلوائے، پتھر ڈھونا، پر چک، پرسا، پسینہ چھوٹنا، پل بندھ گیا، پھپھولے پھوڑے، تاروں بھری رات، تور، تیر کر گیا، تیل میں ہاتھ ڈالنا، تیھا کھایا، ٹٹول دیکھا، ٹکٹکی پر کھڑا کیا، جاگتی جوت، جیتی مکھی کھانا، جیوٹ، چپ ناندھنا، چٹکیلی دھوپ، چٹکیوں میں اڑایا، چکتا مارا، چورنگ لگایا، چوکی بھرنا، چھاتی سراہنا، چھری کٹاری بتاتے ہیں، سر پر ہاتھ پھیرا، سرہلانا، سوجتن کیے، شیر کی بولی بولتے ہیں، شیطان کی آنت، صاجی کرتے ہیں، صبر سمیٹنا، ظالم کی رسی دراز ہوتی ہے، قابو سے نکل گیا، قدم کو ہاتھ لگایا، قصائی کے کھونٹے بندھا ہے، کاٹا اور الٹ گئی، کاٹو تو لہو نہیں، کالک منہ کو ملے، کالی زبان ہے، کالے کوس، کام سے کام ہے، کان امیٹھنا، کان دھرنا، کان دھرے، کانا باغی کرنا، کانپ اٹھنا، کانٹا سا نکل گیا، کب تھوکتے ہیں، کب کب آتا ہے، کبھی تو ہمارے بھی کوئی تھے،

کتنا ماند ہے، کٹ رہنا، کچکچانا، کچے گھڑے پانی کے بھرے، کچھ بات ہے، کچھ دلا یئے، کچھ کان میں پھونکا، کچھ نہ اکھاڑا، کچھ نہیں چلتا، کرکری ہڈی، کریل ڈالنا، کڑ کھائی، کس پر پھولے ہو، کس قدر، کس کا سر لائیں، کس گنتی میں ہے، کسالا کھینچا، کسی سے حرف نہیں اٹھ سکتا، کسی سے سائی کسی سے بدھائی، کسی کا ہاتھ چلے کسی کی زبان چلے، کسی کو اپنا کر رکھو یا کسی کے ہو رہو، کشتی، کعبہ ہو تو منہ نہ کردں، کلپایا، کمان نکلی، کمر بندھوائی، کمیلا، کن پھول اور کرن پھول، کنڈی، کنویں بھانگ پڑی ہے، کنے ڈھیلے ہو گئے ہیں، کنیانا، کوتہ گردن، کوٹھے چڑھے، کور، کوڑھ مغز، کوکھ اور مانگ سے ٹھنڈی رہے، کولا دنگیاں، کولی میں بھر لیا، کون دن تھے، کیا اکھاڑ سکتا ہے، کیا تھا کیا ہوا، کیا خدائی ہے، کیا خونکالی ہے، کیا کیا کچھ کہا، کیا یاد کرو گے، کیری آنکھ، کیڑے پڑیں، کیڑے مغز کے اڑ گئے، کیسریا بانے والے، کہاں سے ٹپک پڑے، کہاں کی بلا پیچھے پڑی، کہلاتا ہے، کہنے سے بات پرائی ہوتی ہے، کہنے کو بات رہ گئی، کہنے کی باتیں ہیں، کھاگ سی، کھایا پیا انگ نہیں لگتا، کھج، کھجانا، کھجوری چوٹی، کھچا کھچ، کھڑا دونا، کھڑ گنجی، کھسوٹنا، کھل بیٹھو، کھل پڑے، کھلے بالوں، کھلیان ہو جانا، کھندل مارا، کھنڈ کھوج کھویا، کھوجڑا جائے، کھیرا ککڑی کرنا، کھیل اڑ کر منہ میں نہ آنا، گاڑھے ہیں، گال پھلانا، گالیوں کی بوچھاڑ کرنا، گانٹھ میں زر، گپ شپ، گجھ دار، گت بھرنی، گٹھ جانا، گٹھری کر دیا، گجھے اشارے، گداکا، گدی پر ناگن ہے، گدھے پر کتابیں لادی ہیں، گرجتے ہیں سو برستے نہیں، گرد کو نہیں لگتا، گردن اینٹھی رہتی ہے، گرو نامہ، گرماہٹ، گرہ کا کھویا، گرہ کا بل، گل بوٹا، گلیاں چھانی، گم صم، گند کاٹنا، گندی روح، گوبر گنیش، گود بھری جاتی ہے، گودنا، گور گڑھا، گوری چمڑی، گولی کان پر سے گئی، گولیاں کھیلتے ہیں، گونگے کی مٹھائی، گئے وہ دن، گیا جان سے، گیا وقت، گیدر بھبکیاں، گیڑیاں کھیلنی، گہرا پردہ، گہرا ہاتھ لگا، گھٹا جھومنا، گھڑاف ہو جانا، گھرانا، گھر آئے کی شرم، گھر تجنا، گھر کی پونجی، گھر کے گھر صاف ہو گئے، گھر گھاٹ، گھر گھاٹ معلوم ہے، گھر والی، گھس پیٹھ کے، گھس لگانے کو بھی نہیں، گھمڑیاں، گھنگھر وسالدا ہے، گھوڑے جوڑے کی خیر، لاکھ پر بھاری ہے، لاگو، لانگنا، لٹک چال، لچی، لچھن سے جھڑ جانا، لڑائی میں مٹھائی نہیں بٹتی، لڑنا

بھڑنا، لڑنت، لکھے موسیٰ پڑھے خدا، لگانے والے، لگتا تار، لگن لگی، لگواڑ، لنگوٹیا یار، لوٹنے کی جائے ہے، لونڈوں گھیری یا لونڈوں کھدیڑی، لوہا لاٹھ، لوہا لوٹا، لیے مرتے ہیں، لہولہان، ماتھا کوٹا، ماچا توڑ، مار ذبح کیا، مار مار کے بچھا دیا، مال بچا، مال مست، ماموں، مجرا کیا، مجنوں کا ٹیلا، مچھی بھون، محرمات، مرت بیائی، مردے کا مال ہے، مرغ مصلی، مرگ مارا، مرنا جینا لگ رہا ہے، مزاج والے، مزہ پڑا ہے، مسوسنا، مشکیں کسیں، معمول کے دن، مفلسا بیگ، مکھی چوس، مکھی ناک پر نہیں بیٹھنے دیتے، مکھیاں بھنکتی ہیں، مکھیوں کا چھتا، ملکٹ، ملنسار، ملے پنچ، مولے چنا، منڈ، ماتے پھرتے ہیں، منکا ڈھلکا، منھ پر برستی ہے، منھ پر شفق پھولی ہے، منھ پر کچھ پیٹھ پیچھے کچھ، منھ پر کی ساری باتیں ہیں، منھ پر کہنا خوش آتا ہے، منھ پر ناک نہیں، منھ پڑی، منھ درمنھ، منھ دیکھے کی چاہ، منھ زور، منھ سنبھالو، منھ اٹھ جانا، موت کا طمانچہ، موت کو پکڑا تو زحمت قبول کی، موت کے دن پورے کرتے ہیں، موتی ٹھنڈے ہیں، موتیا بند، موٹھ چلائی یا موٹھ ماری، موذی کا چنگل، مول سے بیاج پیارا ہوتا ہے، موم کی مریم، میری جان گئی، میاں صاحب، میٹھا برس، میٹھی نظریں، میٹھے کھٹے کو جی چاہتا ہے، میٹھے ہیں، میری ہی آگ لائی نام رکھا بھسندر، میرے بڑھاپے پر کرم کیجیے، مہاراجوں کے راجہ، مہم سر کی، مہندی تو پاؤں میں نہیں لگی ہے، ناس ہو گیا، ناک چنے چبوائے، ناک کا بال، ناک گھسنا، نچوڑنا، نذر پکڑی، نرا، نروٹھا، نصیب پھرنا، نصیب کی شامت، نصیبا، نصیبوں کو دعا دو، نظر گزر، نظروں میں بھانپا، نکاہی پڑتا ہے، نگاہ بھر کے نہ دیکھا، ننانوے کا پھیر، ننگی شمشیر ہے، ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے، نیل جلانا، نیل کا ٹیکا، نیلا ڈورا، نیلی پیلی آنکھیں، نہ پنپا، وار خالی دیا، وضع کہے دیتی ہے، وقت کے بادشاہ ہیں، وہ بال کھینچوں گا جس کی جڑ دور ہو، وہاں گردن ماریے جہاں پانی نہ ہو، ہاتھ کٹواؤں، ہٹیلا، ہڑک چڑھنا، ہزاری روزہ، ہزار ہاتھ کا بن کر آدے، ہمیں ہے ہے کرے، ہوا دینا، ہوتے رہو گے، ہولنا وغیرہ۔

سوم: مثل مخزن فوائد بعض الفاظ کا بلا سند اندراج:

نیاز علی بیگ نکہت نے گرچہ اپنی فرہنگ میں شعرا کے کلام سے شواہد و نظائر پیش کرنے کا

بھرپور التزام کیا ہے، لیکن بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جن کی سندیں فراہم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مناسب مآخذ و مراجع کی عدم دستیابی کے باعث ان کی یہ کوشش مکمل طور پر بارآور نہ ہو پائی ہو۔ لیکن یہ فہم سے بالاتر ہے کہ صاحب فرہنگ آصفیہ نے بھی ان کو بلا سند ہی ذکر کیا ہے۔ حالانکہ وہ تھوڑی سی بھی محنت کرتے تو چند الفاظ کے شواہد آسانی سے حاصل کر سکتے تھے۔ بطور نمونہ ان الفاظ کی ایک فہرست ذیل میں دی جا رہی ہے جو دونوں لغات میں بلا سند مذکور ہیں:

تلا گودن کرنا، کاٹھ کا الو ہے، کالے کوے کھائے ہیں، کام چور نوالے حاضر، کام دولہا دلہن سے پڑتا ہے، کلا چلے اور ستر بلا ٹلے، کماویں میاں خانخاناں اڑاویں میاں فہیم، کولہو کے بیل کو گھر میں منزل ہے، کیا درزی کا کوچ کیا درزی کا مقام، کیا قاضی گلہ کرے گا، کھاگ، کھٹا پٹ رہتی ہے، کھرپی، گدھے کا کھایا کھیت نہ پاپ نہ پن، گڑ ہوگا تو مکھیاں بہت آئیں گی، گنگا نہانا، گور گڑھا کرنا، گہرا سہاگ، گھٹنے پیٹ کو نہرتے ہیں، گھر کر ستر بلا سر دھر، گھر کی مرغی دال برابر، گھر گھوڑا نخاس مول، گٹھری جلال بقچہ مردار، لادنا پھاندنا، مرغے کی آواز/بانگ کون سند کرتا ہے، مفلسی میں آٹا گیلا، ملا کی دوڑ مسجد، ملماں، منھ سے مہایا ہے، منھ کا میٹھا پیٹ کا کھوٹا، مورکھ کی ساری رین چتر کی ایک گھڑی، موئی بچھیا بامن کے نام، ہاتھ گھسائی ہے، ہاتھی سے گنے کھانا، ہاتھی کے دانت دکھانے کے اور ہیں اور کھانے کے اور، ہتھیلی میں چور پڑا، ہری چگ، ہڑک چڑھنا۔

چہارم: مثل مخزن فوائد بعض اشعار کا شعرا سے غلط انتساب:

فرہنگیں شعرا کا تذکرہ نہیں ہوا کرتیں کہ اشعار کا غلط انتساب حصول مقصد میں چنداں حائل ہو۔ ذوقؔ کا کلام غالبؔ سے یا دوسرے ممتاز شاعر سے منسوب ہو جائے تو سند کے اعتبار میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ لیکن مناسب یہی ہے کہ اشعار اصل شاعر سے منسوب کیے جائیں۔ اس سے سند کا اعتبار قائم رہتا ہے۔ اس قسم کی غلطیاں مخزن فوائد میں پائی جاتی ہیں اور یہی فرہنگ آصفیہ میں در آئی ہیں۔ مثلاً ''ٹوپی والے'' کی سند میں نکہت نے میرؔ کا یہ شعر نقل کیا ہے۔

دلی کے کج کلاہ لڑکوں نے
کام عشاق کا تمام کیا
کوئی عاشق نظر نہیں آتا
ٹوپی والوں نے قتل عام کیا

حالانکہ ''نکات الشعرا'' طبع اول ص ۲۸ میں بنامِ پیامؔ موجود ہے۔ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ نے بھی اسے میرؔ کا تسلیم کیا ہے۔

''کلپایا'' کی سند میں غافلؔ کا شعر درج کیا گیا ہے۔

جو کوئی کسی یار کو کلپاوے گا
یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پاوے گا
اس دیر مکافات میں سن اے غافل
جو آج کرے گا سو وہ کل پاوے گا

جب کہ یہی شعر ''تذکرہ میر حسن'' ص ۶۷ میں بنام محمد علی خاں مشہور بہ مرزائی مذکور ہے۔ اس کو سید احمد دہلوی نے بھی غافل کا ہی قرار دیا ہے۔

اور ''جی کی جی میں رہی'' کی سند میں انشاؔ کا یہ شعر شاملِ کتاب ہے:

جی کی جی ہی میں رہی بات نہ ہونے پائی
ایک بھی ان سے ملاقات نہ ہونے پائی

یہ انشاؔ کا طبع زاد نہیں بلکہ دردؔ کا ہے اور اس کے دیوان ص ۳۶ میں موجود ہے۔ فرہنگ آصفیہ کے مؤلف نے بھی اسے انشاؔ کا مانا ہے۔

اسی طرح ''ہمیں ہیں جو یہ مگدر بھانتے ہیں'' کی سند سوداؔ کے اس شعر سے پیش کی گئی ہے۔

نہ سنبھلا آسماں سے عشق کا بوجھ
ہمیں ہیں یہ جو مگدر بھانتے ہیں

جب کہ ”دیوانِ قائمؔ“ کے ص ۱۱۹ پر یہ شعر موجود ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں بھی یہ بنام سوداؔ مذکور ہے۔ ان چند مثالوں سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ صاحب فرہنگ آصفیہ نقل نویسی میں اتنے منہمک تھے کہ ان کو یہ بھی نہ اندازہ ہو سکا کہ وہ ان ہی غلطیوں کو دہرا رہے ہیں جو صاحبِ مخزنِ فوائد سے سرزد ہوئی تھیں حالانکہ اگر وہ چاہتے تو ان غلطیوں کا ازالہ کر سکتے تھے۔

مذکورہ بالا سطور میں جن نکات کو بنیاد بنا کر تفصیل سے گفتگو کی گئی، اس کی روشنی میں مجھ جیسا ایک ادنیٰ طالب علم بھی بآسانی یہ نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ فرہنگ آصفیہ کے مؤلف نے مخزن فوائد سے نقل کی حد تک استفادہ کیا ہے۔ چونکہ خود انھوں نے امیر اللغات اور نور اللغات کے مؤلفوں پر الزام لگاتے ہوئے علمی و ادبی سرقہ کے بارے میں اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا ہے۔ اس لیے یہ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ سرقہ کا جو الزام انھوں نے ان لغت نگاروں پر لگایا تھا وہی الزام ان پر بھی صادق آتا ہے۔ ان دونوں لغت نویسوں نے تو بزعم مؤلف فرہنگ آصفیہ صرف ”آنکھ“ اور ”بات“ اور اس کے مشتقات کی ہو بہو نقل بطور نمونہ چھاپی تھی۔ لیکن انھوں نے تو مخزن فوائد کے بیشتر حصے کو اپنی فرہنگ میں بعینہ نقل کیا ہے۔ اس حد تک استفادہ کرنے کے باوجود انھوں نے ایک مرتبہ بھی نکہتؔ اور اس کی فرہنگ ”مخزن فوائد“ کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ ایسا کر کے نہ صرف انھوں نے اپنی ناسپاسی کا ثبوت دیا ہے بلکہ علمی و ادبی دنیا کو بھی برسوں ایک اہم لغت سے محروم رکھا۔ شاید انھیں اس کا احساس تھا کہ اگر ”مخزن فوائد“ کے بارے میں لوگوں کو علم ہو جائے تو ان کا یہ ”عظیم کارنامہ“ جو برسوں کی محنت اور جانفشانی کے بعد منظر عام پر آیا ہے، کہیں اس کی قلعی نہ کھل جائے۔ اسی اندیشے کے پیش نظر انھوں نے ایک نئی ترکیب وضع کی اور بہ بانگ دہل امیر مینائی اور نور الحسن نیر کاکوروی پر الزام لگایا تا کہ اہل علم حضرات اس حقیقت سے واقف نہ ہو سکیں۔ لیکن حقیقت کبھی چھپتی نہیں ایک نہ ایک دن کھل کر سامنے آ جاتی ہے اور بالآخر حقدار کو اس کا حق مل ہی جاتا ہے۔

جہاں تک امیر اللغات اور نور اللغات کا تعلق ہے تو قرائن بتاتے ہیں کہ ان دونوں

مؤلفوں کے پیشِ نظر مخزن فوائد یا فرہنگ آصفیہ میں کوئی لغت ضرور رہی ہے دونوں صورتوں میں مآخذ تو ''مخزن فوائد'' ہی قرار پائے گا کیوں کہ ان میں آپس میں عجیب وغریب یکسانیت پائی جاتی ہے۔

مخزن فوائد کے نقائص:

کوئی بھی تخلیق تسامحات و نقائص سے مبرا نہیں ہوتی۔ مخزن فوائد بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں۔ چنانچہ اس میں بھی چند نقائص پائے جاتے ہیں، جو حسب ذیل ہیں:

''مخزن فوائد'' میں الفاظ کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ اصطلاح، محاورہ اور مثل۔ ان کی تقسیم میں مصنف کے پیش نظر کون سا اصول تھا۔ خود انھوں نے اس سلسلے میں اپنے کسی نقطۂ نظر کی کوئی وضاحت نہیں کی ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے مروجہ اصولوں کی پابندی نہیں کی ہے بلکہ اپنی صوابدید پر بعض کو محاورہ، بعض کو اصطلاح اور بعض کو مثل قرار دیا ہے۔ مثلاً آپ کو شاخ زعفران سمجھتے ہیں، آٹھ پہر سولی ہے، آج کدھر سے چاند نکلا، آرام میں ہیں، آگے خدا کا نام، آنتیں قل ھو اللہ پڑھتی ہیں، باپ مارے کا بیر، بات بات میں چھری کٹاری وغیرہ کو انھوں نے اصطلاح بتایا ہے جب کہ یہ محاورہ ہے[8]۔

حالی کی تصریح کے مطابق یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ مفرد الفاظ کو محاورہ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن مصنف نے بعض مفرد الفاظ کو بھی محاورہ قرار دیا ہے۔ مثلاً اچکا، تار، دلیاں، ڈلک، ڈول، ذوالحال، رئیس، سوکن، سوت، سدھارو، سکڑنا وغیرہ بھی محاورہ قرار پائے ہیں۔

کہیں کہیں بعض مثل جیسے آسمان کا تھوکا منہ پر پڑتا ہے، بات منہ سے نکلی اور پرائی ہوئی، ملا کی دوڑ مسجد وغیرہ کو اصطلاح کے تحت درج کیا ہے اور کہیں بعض محاوروں مثلاً اس کان سنے اس کان اڑا دیے، آج کرے گا کل پاوے گا، آنکھ نہ ناک بنو چاند سی، آنکھوں پہ پلکوں کا بوجھ نہیں ہوتا وغیرہ کو مثل کے تحت لکھا گیا ہے[9]۔

مصنف نے بعض اصطلاحات و محاورات کو کئی جگہوں پر لکھا ہے مثلاً آسمان پر دماغ ہے،

آ لے، آنکھ بچی اور مال دوستوں کا، بات کی بات، بات چیت، پانی مرتا ہے وغیرہ۔ خود مصنف کو بھی اس کا احساس ہے۔ اس لیے بعض جگہ اس کا اظہار بھی کر دیا ہے کہ ''یہ اصطلاح سابق تحریر ہوئی ہے۔'' ان مقامات پر سندیں عموماً مختلف دی گئیں ہیں۔ البتہ بعض جگہ پر پہلی ہی سند کو دہرا دیا گیا ہے۔ نیز کہیں کہیں ایک ہی شعر کو دو طرح سے لکھا ہے۔ مثلاً ماموں کی سند میں انشا کا شعر ایک جگہ یوں لکھا گیا ہے۔

اوئی ممانی جان یہ دھڑکا کیسا دل میں بیٹھ گیا
اتنا جیسا موٹا سارا ماموں بل میں بیٹھ گیا

اور دوسری جگہ اس طرح نقل کیا گیا ہے۔

آہ ممانی جان یہ دھڑکا کیسا دل میں بیٹھ گیا
موٹا سا اک ماموجیسا گھر کے بل میں بیٹھ گیا

بعض الفاظ کی تشریح و توضیح اور معنوی تعین میں بھی مصنف سے غلطی ہوئی ہے جیسے ''میگھ راگ'' کی وضاحت کرتے ہوئے نکہت لکھتے ہیں:

''فرشتہ جو حاکم ہے بادوابر پر اور حکم کرتا ہے وہ ان پر اللہ کی طرف سے۔
نام ہے اس کا رعد اور تازیانہ ہے اس کا برق......''

حالانکہ ''میگھ راگ'' چھ راگوں میں ایک راگ ہے، جس کا نمبر چوتھا ہے۔ جب کوئی کامل الفن یہ راگ گاتا ہے تو اسی وقت بارش ہونے لگتی ہے۔ اسی طرح بعض الفاظ کے معانی میں محدودیت آگئی ہے۔ لیکن اس طرح کی غلطیاں بہت کم ہیں اور نظرانداز [کرنے] کے لائق ہیں۔

بعض اشعار کے انتساب میں بھی مصنف سے غلطی ہوگئی ہے۔ یہ درست ہے کہ مخزن فوائد کوئی شعرا کا تذکرہ نہیں کہ شعر کے غلط انتساب سے کوئی فرق پڑے۔ لیکن مناسب یہی ہے کہ انتساب درست ہوتا کہ اس سے سند کا اعتبار مزید قائم ہو سکے۔ مثلاً ہمیں ہیں جوگدر بھانتے

ہیں۔ کی سند میں بنام سوداؔ یہ شعر نقل کیا گیا ہے:

نہ سنبھلا آسماں سے عشق کا بوجھ
ہمیں ہیں یہ جو مگدر بھانتے ہیں

حالانکہ یہ قائمؔ کا شعر ہے اور اس کے دیوان ص ۱۱۹ میں موجود ہے۔

''آج کرے گا کل پاوے گا'' کی سند میں بنام غافلؔ یہ رباعی درج ہے۔

جو کوئی کسی یار کو کلپاوے گا
یہ یاد رہے وہ بھی نہ کل پاوے گا
اس دیر مکافات میں سن اے غافلؔ
جو آج کرے گا سو وہ کل پاوے گا

جب کہ تذکرہ میر حسن ص ۶۷ میں بنام محمد علی خاں مرزائی مذکور ہے۔

''مخزن فوائد'' میں سب سے پریشان کن ترتیب ہے۔ یہ ضرور ہے کہ الف کے سارے الفاظ الف ہی میں مل جائیں گے۔ لیکن خود ان میں آپس میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ کسی لفظ کو ڈھونڈنا ہو تو ہوسکتا ہے وہ بالکل ابتدا ہی میں مل جائے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ بالکل آخر میں ملے۔ گویا ایک لفظ کو تلاش کرنے میں پورے باب کو دیکھنا پڑے گا۔ خاص طور سے ک اور گ میں سب سے زیادہ دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کہ دونوں آپس میں خلط ملط ہیں۔ اس پریشانی سے بچنے کے لیے موجود ترتیب میں ک اور گ کو الگ کر دیا گیا ہے۔ لیکن ترتیب میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے۔ ترتیب کی اس پریشانی سے بچنے کے لیے سارے الفاظ کی الفبائی فہرست الگ سے کتاب کے آخر میں شامل کردی گئی ہے۔

''مخزن فوائد'' میں کلامِ شعرا سے شواہد و نظائر پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود مصنف بعض اصطلاحات و محاورات کی سندیں فراہم نہیں کر سکے۔ اس کی تدوین کے دوران میں نے مناسب خیال کیا کہ دیگر اردو لغات کی مدد سے اس کی تکمیل کردی جائے۔

چنانچہ ان لغات کی مدد سے جو سندیں دستیاب ہوسکیں، بطور ضمیمہ اسے متن کے بعد شامل کردیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بعض اصطلاح و محاورہ وغیرہ کے معانی بھی نہیں دیے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ اس زمانے میں اس قسم کے محاورے وغیرہ خاصے مقبول اور زبان زد تھے۔ اس لیے مصنف نے اس کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ لیکن اب وہ بات نہیں رہی، اس وقت کے مشہور اب غیر معروف ہوگئے ہیں۔ اس لیے مناسب خیال کیا گیا کہ دیگر اردو لغات کی مدد سے حاشیے میں اس کے معانی و مطالب کی بھی وضاحت کردی جائے تاکہ قارئین کرام کو کوئی تشنگی محسوس نہ ہو۔

بہرکیف ''مخزن فوائد'' اپنی بعض خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود اردو کی ایک اہم اور مستند فرہنگ ہے۔ اس کی تدوین و ترتیب میں اسے مفید سے مفید تر بنانے کا بھرپور خیال رکھا گیا ہے۔ تاہم کچھ غلطیاں بھی اس میں ضرور در آئی ہوں گی۔ قارئین کرام سے درخواست ہے کہ وہ اپنے مفید مشوروں سے نوازیں تاکہ آئندہ اسے مزید معیاری بنایا جاسکے۔

حواشی

(۱) یہ مقالہ دراصل ''مخزنِ فوائد'' کے اس ایڈیشن کا دیباچہ ہے جو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری (پٹنہ) نے ۱۹۹۸ء میں شائع کیا۔ اور ڈاکٹر محمد ذاکر حسین نے اس کی تدوین کی تھی۔ (مرتب)

(۲) سعادت خاں ناصر نے اپنے تذکرہ خوش معرکہ زیبا ۲/۱۵۷ میں نکہت کا نام ''سید نذر علی'' لکھا ہے۔ (ذاکر)

(۳) عمدہ منتخبہ ص ۷۷۹، گلدستہ نازنیناں، ص ۳۷، سخن شعرا ص ۵۳۲، گلستان سخن ۲/۴۴۸، خوش معرکہ زیبا ۲/۱۵۷۔ (ذاکر)

(۴) ان لغات کے یہ سنین ذاکر صاحب نے درج کیے ہیں لیکن کچھ وضاحت طلب ہیں۔ مثلاً فرہنگِ آصفیہ کی تالیف و اشاعت کی ایک تاریخ ہے اور مختصراً یہ کہ یہ پہلے ''ارمغانِ دہلی'' کے نام

سے ۱۸۷۸ء میں چھپی۔ پھر ''ہندوستانی اردو لغات'' کے نام سے قسط وار چھپنا شروع ہوئی اور ۱۸۹۲ء میں اس کی تالیف مکمل ہوئی تو ازسرِ نو چھاپی گئی۔ نور اللغات ۱۹۲۴ء میں مکمل ہوئی تھی۔ مہذب اللغات پہلے قسط وار چھپنی شروع ہوئی اور پہلی جلد ۱۹۵۸ء میں منظرِ عام پر آئی تھی۔ آخری جلد ۱۹۸۹ء میں چھپی (مرتب)

(۵) یہ الزام غلط ہے۔ اس کی وضاحت حامد حسن قادری ''داستان تاریخ اردو'' میں کر چکے ہیں (مرتب)

(۶) فرہنگ آصفیہ۔ دیباچہ (ذاکر)

(۷) داستان تاریخ اردو ص ۲۰۴ (ذاکر)

(۸) اس ضمن میں عرض ہے کہ اُس زمانے میں لفظ ''اصطلاح'' آج کل کی طرح term کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا تھا بلکہ اصطلاح یا مصطلح سے مراد ہوتی تھی کسی لفظ کے اصلی یا وضعی معنی (جسے حقیقی یا معنی موضوع بھی کہتے ہیں) (موضوع یعنی وضع کیا گیا) کے علاوہ لفظ کے وہ نئے معنی جس پر باہم اتفاق ہو۔ جیسا کہ ''مصطلحاتِ اردو'' کے مولف خواجہ محمد اشرف علی نے اپنے دیباچے میں واضح کیا ہے کہ ''اصطلاح کے لغوی معنی باہم صلح کرنا اور اصطلاحی معنی باہم اتفاق کرنا ایک قوم کا واسطے معین کرنے کے معنی لفظ کے سوائے معنی موضوع کے ہیں (مطبع نامی، لکھنؤ، ۱۸۹۰ء) نیز یہ کہ یہ محاورے بھی نہیں ہیں کہاوتیں یا مقولے ہیں۔ (مرتب)

(۹) فاضل محقق کے خیال برعکس آج کرے گا کل پاوے گا، آنکھ نہ ناک بنو چاندسی، آنکھوں پر پلکوں کا بوجھ نہیں ہوتا، محاورے نہیں ہیں بلکہ کہاوتیں یا ضرب الامثال ہیں۔ (مرتب)

☆☆☆☆

محمد عالم مختار حق

نفائس اللغات: چند گزارشات[۱]

مکرمی جناب مدیر "تخلیقی ادب"

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

گزارش ہے کہ آپ کے علمی جریدے "تخلیقی ادب" کا شمارہ سات ایک عزیز کے ہاں نظر نواز ہوا، جس میں سے ترجیحاً میں نے ایک تحقیقی مضمون "نفائس اللغات: اردو کا ایک نادر و نایاب لغت" کا سب سے پہلے مطالعہ کیا۔ اس مضمون کے متعلق میں بعض گزارشات گوش گزار کرنے کی جسارت کر رہا ہوں:

۱۔ سب سے پہلے یہ کہ "نفائس اللغات" کو مولوی احدالدین بلگرامی سے منسوب کیا گیا ہے (ص ۷۲) اور سارے مضمون میں یہی نام استعمال کیا گیا ہے۔ اسے کمپوزنگ کی غلطی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ مضمون کی ابتدا میں جو تعارفی کلمات انگریزی میں لکھے گئے ہیں ان میں بھی "احدالدین" ہی لکھا ہے (AHAD ULDIN) جب کہ درست نام "اوحدالدین" ہے اور یہی نام لوحِ کتاب، مصنف کے پیشِ لفظ اور خاتمہ الطبع میں استعمال کیا گیا ہے۔ نہ معلوم مصنفِ

علام اتنی بڑی غلطی کے مرتکب کس طرح ہو گئے۔ نفائس اللغات کا ایک ایڈیشن مطبع منشی نولکشور لکھنؤ سے جولائی ۱۸۹۷ء میں بھی شائع ہوا، جو راقم الحروف کے کتب خانے کی زینت ہے اور اس کے صفحات کی تعداد بھی ۶۳۶ ہی ہے۔

۲۔ پھر بتایا گیا ہے کہ ‘‘نفائس اللغات کا خلاصہ بنام ‘‘منتخب النفائس’’ مطبع مجیدی کانپور سے ۱۹۱۲ء (۱۳۳۱ھ) میں شائع ہوا (ص ۷۵) جب کہ پیشتر ازیں اس کے چار ایڈیشن بہ تفصیل ذیل شائع ہو چکے تھے:

(۱) مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۱ھ
(۲) مطبع مجتبائی دہلی ۱۳۰۸ھ
(۳) فخر المطابع لکھنؤ ۱۳۲۲ھ (بحوالہ کتابیات لغات اردو از ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔ ۱۹۸۶ء)
(۴) چوتھا ایڈیشن مطبع مفید عام لاہور سے ۱۳۲۴ھ میں شائع ہوا جو راقم کے کتب خانے میں موجود ہے۔

منتخب النفائس کے مرتب کنندہ (ص ۷۵) (لفظ کنندہ زائد ہے۔ مرتب بذات خود اسم فاعل ہے جس میں کنندہ کا مفہوم شامل ہے) کا نام مولوی محبوب علی لاہوری لکھا ہے، درست محبوب علی رام پوری ہے۔ ان کا مختصر تعارف اس طرح ہے: آپ رام پور میں ۱۲۱۲ھ میں مولوی رستم علی کے ہاں پیدا ہوئے۔ سترہ سال کی عمر میں جملہ علوم کی تکمیل اپنے والد سے کی اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ ان کے وعظ میں بڑا اثر تھا۔ نواب احمد علی خاں والی رام پور کے عہد میں مفتی عدالت رہے۔ منتخب النفائس لغت اردو ان سے یادگار ہے۔ ۱۲۶۴ھ میں بہ عمر ۵۲ سال بعارضہ سل مراد آباد میں انتقال کیا اور مسجد قلعہ رستم خاں کے متصل احاطے میں دفن ہوئے (تذکرہ کاملانِ رام پور از حافظ احمد علی خاں شوق۔ ہمدرد پریس دہلی۔ ۱۹۲۹ء)۔

۳۔ اسی سلسلے میں موصوف نے لکھا ہے کہ ‘‘نفائس اللغات کا ایک سرقہ بھی شائع ہوا تھا جس کا نام ‘‘انفس النفائس’’ ہے۔ اس کی تفصیل دستیاب نہیں ہو سکی۔’’ (۷۵) مگر چند سطروں کے

بعد لکھتے ہیں کہ ''منتخب النفائس اور انفس النفائس کا کاغذ بہت معمولی ہے۔'' (ص ۷۵) جب کتاب کی تفصیل ہی معلوم نہیں تو حضرت نے کاغذ کا معمولی ہونا کیسے مستنبط کر لیا۔ اس حادثۂ دوراں کو کیا نام دیا جائے۔

۴۔ کتاب کے سنہ تصنیف کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں کہ: ''نفائس کا سالِ تصنیف صراحتاً نہیں ملتا'' (ص ۷۴)۔ اس کے بعد انھوں نے نفائس اللغات کی ایک عبارت کے حوالے سے مصنف کے محمد علی شاہ والی اودھ کے ہم عصر ہونے کے ناطے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ محمد علی شاہ کی اودھ پر حکمرانی کا زمانہ ۱۸۳۸ء سے ۱۸۴۲ء تک صرف چار برس کا ہے۔ لہٰذا انفائس اللغات بھی یقیناً ان ہی چار برسوں میں مکمل ہوئی۔'' (ص ۷۵) حالانکہ مصنف نے لغت کے ترقیمے میں بالوضاحت تحریر کیا ہے: ''كان الفراغ من اتمامه في السابع من شهر رجب سنة ثلث و خمسين ومائتين، الف من هجرة خير البشر صلى الله عليه وآله وسلم'' یعنی میں اس کتاب کی تکمیل سے ۷/ ماہ رجب ۱۲۵۳ھ (مطابق ۱۸۳۷ عیسوی) کو فارغ ہوا (یعنی محمد علی شاہ کے عہدِ حکمرانی سے ایک سال قبل)۔

۵۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ''نفائس اللغات کا آغاز مختصر فارسی مقدمے سے ہوتا ہے۔'' (ص ۷۷) حالانکہ اس ''مختصر'' کا دائرہ تقطیعِ کلاں کے تین صفحات (حوض ساڑھے آٹھ انچ ضرب ساڑھے چھ انچ) پر محیط ہے جو یقیناً ''مختصر'' کے زمرے میں شمار نہیں ہوتا۔ کچھ یوں لگتا ہے کہ مضمون نگار کے پیشِ نظر نفائس کا جو نسخہ ہے وہ بمصداق ''اول و آخر آں کہنہ کتاب افتادہ است'' ناقص ہے جس سے وہ اس قسم کے نتائج اخذ کرنے پر مجبور ہیں۔ نسخہ مکمل ہوتا تو انھیں مکمل مقدمہ بھی مل جاتا اور ترقیمے کی عبارت بھی کیونکہ ان ہر دو (مقدمہ و ترقیمہ) کا تعلق کتاب کے اول و آخر سے ہے۔

۶۔ ''انھوں نے متنِ کتاب سے آبخورہ کی تشریح نصف سطر سے بھی کم میں نقل کی ہے۔'' (ص ۷۷) جب کہ کتاب میں آبخورہ کی تشریح چار سطروں میں کی گئی ہے اور ہر سطر میں اوسطاً

بیس الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔

۷۔ آپ نے مولانا محمد حسین آزادؔ کی لغت کا نام ''فرہنگ آزادؔ'' لکھا ہے (ص ۷۶)۔ جب کہ درست نام ''لغتِ آزاد'' ہے۔ نیز اس کا سنہ طباعت ۱۹۲۴ء ہے نہ کہ ۱۹۲۲ء (ص ۷۸)۔ اب اس لغت کو شعبہ زبان و ادب اردو اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور نے آزاد صدی کی مناسبت سے اسی سال (۲۰۱۰ء) میں شائع کر دیا ہے جس کی تدوینِ نو کا اعزاز جناب ڈاکٹر معین نظامی کو حاصل ہوا۔ مرادِ ما نصیحت بود و کردیم

فقط والسلام

لاہور، ۲۶، اکتوبر ۲۰۱۰ء　　(مقالہ نگار سے معذرت کے ساتھ)

محمد عالم مختار حق

حواشی:

(۱) ''تخلیقی ادب'' (اسلام آباد) کے ایک شمارے میں شامل ایک مقالے پر محمد عالم مختار حق صاحب نے اس کے مدیر کے نام ایک خط محررہ ۱/اکتوبر ۲۰۱۰ء میں کچھ سوالات اٹھائے تھے۔ جون ۲۰۱۱ء میں راقم کی ملاقات جب محمد عالم مختار حق صاحب سے لاہور میں ان کے شاندار کتب خانے میں ہوئی اور لغات سے متعلق کچھ گفتگو ہوئی تو انھوں نے اس خط کی ایک نقل دست نوشتہ راقم کو ازراہِ تلطف عنایت کی بعدازاں انھوں نے ٹیلی فون پر اس کی اشاعت کی اجازت بھی راقم کے پُر زور اصرار پر دی۔ چونکہ زیر بحث مسئلہ اردو کی ایک لغت سے متعلق ہے اور نیت محض اصلاح کی ہے لہذا محمد عالم مختار حق کی اجازت سے اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے لیکن افسوس کہ اس کتاب کی اشاعت سے قبل ہی محمد عالم مختار حق صاحب خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ دست نوشتہ نقل راقم کے پاس محفوظ ہے (مرتب)

عبدالرشید

چند معروضات

’شعر شور انگیز‘ کے تعلق سے

میں آج کل ’اردو میں فارسی محاورات و ترکیبات کے تراجم‘ کے موضوع پر اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کی تیاری میں مصروف ہوں۔ اس سلسلے میں ’شعر شور انگیز‘ کے مطالعے کا بھی موقع ملا۔ میرا ہرگز یہ مرتبہ نہیں کہ ’شعر شور انگیز‘ پر کوئی رائے دے سکوں۔ فاروقی صاحب کا جو علمی و ادبی مقام ہے اس پر تو میرؔ کا یہ قول صادق آتا ہے کہ:

ہر سخن اس کا اک مقام سے ہے

فاروقی صاحب نے ’شعر شور انگیز‘ میں میرؔ کے کلام میں بعض مشکل الفاظ، تراکیب، مصطلحات اور محاورات وغیرہ کے معانی بڑی تلاش و جستجو کے بعد اور دقت نظر کے ساتھ حل کیے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلے میں فارسی، اردو کی کمیاب لغات کے علاوہ اردو اور فارسی کے شعری سرمائے سے بھی مدد لی ہے۔ اس مطالعے سے معانی اور مفاہیم کے وہ نکات بھی سامنے آئے ہیں جو اردو، فارسی لغات میں اجنبی ہیں اور بعض مقامات پر فاروقی صاحب نے کسی لفظ کی تحقیق و تشریح

میں اردو، فارسی لغات پر نقد و تبصرہ بھی کیا ہے اور الفاظ کے افہام و تفہیم کی طرف اہم اشارے کیے ہیں۔ میرؔ کے کلام سے متعلق ایسے الفاظ کی تعداد خاصی ہے جن کی فہرست بطور ضمیمہ 'شعر شور انگیز' (جلد چہارم) میں دے دی گئی ہے۔ میں یہاں ان میں سے بعض الفاظ و تراکیب کے سلسلے میں چند معروضات پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں جسے مختلف لغات کے طالب علمانہ مطالعے کا نتیجہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ میں نے اس معاملے میں کسی قسم کی رائے زنی سے گریز کرتے ہوئے اپنے آپ کو صرف حقیقتِ حال کے بیان تک محدود رکھا ہے۔

'شعر شور انگیز' جلد اول، ص ۹۲

دیوانِ دوم:

اگرچہ سادہ ہے لیکن ربودنِ دل کو
ہزار پیچ کرے لاکھ فند کرے
سخن یہی ہے جو کہتے ہیں شعر میرؔ ہے سحر
زبانِ خلق کو کس طور کوئی بند کرے

بلکہ اسی غزل کا ایک شعر اور لے لیتے ہیں:

نہ مجھ کو راہ سے لے جائے مکر دنیا کا
ہزار رنگ یہ فرتوت گو چھپھند کرے

'فند' والا شعر دیکھیے۔ 'فند' فارسی ہے، بمعنی 'فریب، دغا، جھوٹ'۔ اردو میں 'دند پھند' اور 'پھند' اسی سے بنے ہیں، لیکن خود لفظ 'فند' میں نے کہیں استعمال ہوتا ہوا نہیں دیکھا۔"

معروضہ: اردو کلاسیکی ادب میں 'فند' بمعنی 'مکر، فریب، دغا' مستعمل رہا ہے۔ یہاں کچھ مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

سب رس (سن تصنیف ۱۶۳۵ء):

''القصہ بارے زلف نے دھرم کری، بہت کرم کری، بندی خانے میں تی، اس بلا آشیانے میں تی، کچھ فند کر، دست بند کر، بھار کاڑی۔''

روشن علی روشنؔ (عاشور نامہ، سنِ تصنیف ۸۹۔۱۶۸۸) [۲]

حسن اور حسین کو تو کچھ فند کر
گمادے جہاں سے مکر چھند کر

حشمت (۱۶۹۴/۹۵۔۱۷۴۹ء) [۳]

کیوں کہ باتیں نہ کرو ہم ستی، تم کرکے فند
پھیرو دو دل کو ہمارے، جو نہیں کرتے پسند

جعفر علی حسرت (۱۷۳۴۔۱۷۸۵ء) [۴]

ٹوپی تری اتری تو یہ سیکھا ہے چھند
دستار کو باندھ کر ہوا چہرہ بند
تس پر یہ سجے ہے باندھنوں کی پگڑی
باندھے گا تو کیوں نہ باندھنوں کرکے فند

(کذا)

'شعر شور انگیز' جلد اول، ص ۹۳

دیوانِ اول:

منھ پر اس کی تیغ ستم کے سیدھا جانا ٹھہرا ہے
جینا پھر کج دار و مریز اس طور میں ہو تک یا مت ہو

''کج دار و مریز'' بمعنی ٹال مٹول، بہانہ، کسی کام کو اس طرح ٹالے رہنا کہ جان مشکل میں پڑ جائے۔ (کج دار: ٹیڑھا رکھ۔ مریز: مت گرا) یہ فقرہ اتنا غریب ہے کہ میں نے اسے صرف اقبالؔ کے یہاں دیکھا ہے۔ لیکن اقبالؔ نے بھی اسے غلط استعمال کیا ہے:

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
مریز کج دار کی نمائش حروف خم دار کی نمائش

یوسف سلیم چشتی مرحوم اقبال کی اس غلطی پر اس قدر گھبرائے کہ انھوں نے اس فقرے کے معنی ہی نہیں لکھے، لفظ بلفظ مصرعے کی نثر کر دی، خیر۔ ایسے نادر فقرے کے چاروں طرف جتنے لفظ ہیں وہ سب پراکرت ہیں۔ صرف تین لفظ فارسی ہیں، لیکن وہ بھی اتنے آسان ہیں کہ ان میں کسی قسم کی غرابت نہیں۔ شعر کی سلاست 'کج دار مریز' کے استعمال سے اور بھی نمایاں ہوگئی ہے۔"

معروضہ: 'کج دار مریز' سے متعلق ایک مثال پیش کی جا رہی ہے:

جعفر علی حسرت (۱۷۳۴۔۱۷۸۵ء)[۵]

ہر چند کہ زہد سے کیا ہم نے گریز
ٹوٹا نہ کبھی زہد سے اپنا پرہیز
اس میکدۂ دہر میں ہم سے حسرت
ساقی نے رکھا ہمیشہ کج دار و مریز

پلیٹس[۶] اور ڈنکن فوربس[۷] میں لفظ 'کج دار مریز' کے معنی دیکھے جا سکتے ہیں اور لغات فیروزی فارسی[۸] میں بھی اس کا اندراج موجود ہے۔

'شعر شور انگیز' (جلد اول)، ص ۲۶۷:

چھاتی سے ایک بار لگاتا جو وہ تو میر
برسوں یہ زخم سینے کا ہم کو نہ سالتا

سالنا: تکلیف دینا، کانٹے کی طرح کھٹکنا

ص ۲۶۹: ۱۰/۳ برسوں اور 'سالتا' میں ضلع کا لطف ہے۔ 'سالنا' کا مصدر میر کا وضع کیا ہوا معلوم ہوتا ہے کیوں کہ 'سال' بمعنی 'کانٹا'، 'کھٹک' تو ملتا ہے، لیکن 'سالنا' نہیں ملتا۔ میر نے 'سالنا' اور جگہ بھی استعمال کیا ہے۔

مثلاً:

وے دن کیسے سالتے ہیں جو آ کر سوتے پاتے کبھو
آنکھوں سے ہم سہلا سہلا تلوے اس کو جگاتے تھے

(دیوانِ پنجم)

"ایک مفہوم (یا ایک پہلو) یہ بھی ہے کہ اگر معشوق ہمارے زخم سینہ کو اپنے سینے سے لگا لیتا (یعنی از راہِ ہمدردی یا شاید اس معنی میں کہ اس کو زخم عشق لگ جاتا) تو ہمیں اپنے زخم کی اتنی کھٹک نہ محسوس ہوتی۔ ایک لطف یہ بھی ہے کہ بجائے اس کے کہ خود معشوق کو سینے سے لگانے کی تمنا کریں، یہ تمنا کی ہے کہ معشوق ہم کو سینے سے لگاتا۔"

معروضہ: 'سالنا' مصدر سے متعلق کچھ مثالیں پیش کی جا رہی ہیں:

قصۂ مہر افروز و دلبر (زمانۂ تصنیف ۱۷۳۲ء تا ۱۷۵۹ء)[۹]

"پریوں نے اس کے تائیں مارا اتنا مارا کہ بے ہوش ہو گیا اور باہر گھسیٹ کے ڈال دیا۔ بادشاہ جو اس کے اوپر عاشق تھا، تس سے چوٹیں اسے نہ سالی۔"

حاشیۂ متن: سالی (سالنا): تکلیف ہونا۔

قائم (۱۷۲۲۔۱۷۹۴ء)[۱۱]

جسے وصف علی کچھ سالتا ہے
اسی کو دوزخ آخر ڈھالتا ہے

مصحفی (۱۷۵۰۔۱۸۲۴ء)

کب تجھ کو مجھ سے لاگ ہے آواز عندلیب
کیوں سالتی ہے دل میں مرے اب کے سال تو

شب ساکنِ چمن تھے ہم بھی وے لے سحر تک
آوازیں بلبلوں کی چھاتی میں سالیاں ہیں

کنج قفس میں باغ سے آئے تھے جو نئے اسیر
صورتیں انھوں کی ساری رات میرے جگر کی میں سالیاں [کذا][۱۲]

جرأت (۱۷۴۸ـ۱۸۰۹ء)[۱۳]

ہر سال سالتی ہے نئے رنگ عندلیب
اپنے جو دل میں دردِ محبت کی چوٹ ہے

’شعرِ شور انگیز‘ (جلد اول)، ص ۴۱۴

رات حیران ہوں کچھ چپ ہی مجھے لگ گئی میر
درد پنہاں تھے بہت پر لبِ اظہار نہ تھا

ص ۴۱۷: ۵/۵۱ ’لب اظہار‘ کی ترکیب کو ایک جگہ اور استعمال کیا ہے۔ یہ ترکیب میر کی اختراع کردہ معلوم ہوتی ہے اور بہت خوب ہے:

دم زدن مصلحتِ وقت نہیں اے ہم دم
جی میں کیا کیا ہے مرے پر لبِ اظہار کہاں

(دیوانِ دوم)

معروضہ: ’لبِ اظہار‘ کی ترکیب سراج اورنگ آبادی (۱۷۱۴ـ۱۷۶۳/۶۴ء) کے کلام میں موجود ہے:

جو دیکھے گل رخوں کوں لاؤبالی
بجا ہے گر لب اظہار باندھے[۱۷]

مزید مثالوں کے لیے دیکھیے حواشی ۱۷الف۔

’شعرِ شور انگیز‘ (جلد اول) ص ۵۸۰:

وہ کم نما و دل ہے شائق کمال اس کا
جو کوئی اس کو چاہے ظاہر ہے حال اس کا

کمال: بہت زیادہ

۱۱۸/۱ ’کم نما‘ کم دکھائی دینے والا، مشکل سے دکھائی دینے والا، میر کی اپنی اختراع معلوم

ہوتا ہے، کیوں کہ لغات میں نہیں ملتا۔ چوں کہ لفظ 'کم' کو نفیِ مطلق کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں، اس لیے 'کم نما' کے معنی 'بالکل نہ دکھائی دینے والا' بھی ہو سکتے ہیں اور چوں کہ 'نما' کے معنی 'دکھانے والا' بھی ہو سکتے ہیں (مثلاً 'جلوہ نما' بمعنی 'جلوہ دکھانے والا') اس لیے کم نما کے معنی 'کم دکھانے والا، یعنی 'چیزوں کو حقیر دکھانے والا' یا 'اپنے کو کم دکھانے والا' بھی ہو سکتے ہیں۔''

معروضہ: 'کم نما' کی ترکیب ولیؔ اور سجاد کے کلام میں بھی دیکھی جا سکتی ہے:

ولیؔ (۔۶۸/۱۶۶۷۔۱۷۰۷ء)[۱۸]

کم نما ہے نوجواں میرا برنگِ ماہِ نو
ماہِ نو ہوتا ہے اکثر اے عزیزاں کم نما

میر سجادؔ (۱۷۰۴۔۱۷۵۹ء)[۱۹]

ہمیشہ کم نما رکھ کر یہ اپناں چاند سا مکھڑا
مہینوں تک ہمیں غرّا ہی بتلاتے ہیں ملنے میں

'شعر شور انگیز' (جلد اول) ص ۵۸۰

کیا تم کو پیار سے وہ اے میرؔ منھ لگاوے
پہلے ہی چومے تم تو کاٹو ہو گال اس کا

چومے: بوسہ

ص ۵۸۱/۸۲: ۳/۱۱۸ 'چومتے ہی گال کاٹا' کہاوت کے طور پر 'فیروز اللغات' (لاہور ۱۹۶۷ء) میں درج ہے، لیکن 'آصفیہ' اور 'پلیٹس' میں اس کا پتا نہیں۔ 'فیروز' نے معنی وہی لکھے ہیں جو قرینے سے ظاہر ہیں ('ابتدا ہی میں نقصان پہنچانا میرؔ نے جو شکل استعمال کی ہے وہ اس زمانے میں مروج رہی ہوگی، کیوں کہ میرؔ نے 'ہجو بلاس رائے' (کلیات، جلد دوم، صفحہ ۴۱۳، رام نرائن لعل) میں بھی یہی الفاظ استعمال کیے ہیں۔ (یہ ہجو آسی میں نہیں ملتی)۔ ع

تم تو کاٹو ہو پہلے چومے گال

لفظ 'چوما' بھی آج کل مستعمل نہیں، اس کی جگہ 'چمہ' مستعمل ہے۔ 'آصفیہ' اور 'پلیٹس' دونوں میں 'چمہ' نہیں ہے، لیکن 'چوم' ہے۔ یگانہ نے غالب کی زمین میں میر کا انداز برتتے ہوئے ایک شعر خوب نکالا ہے۔

پہلے ہی چمے گال کاٹ لیا
ابتدا یہ تو انتہا کیا ہے

چوں کہ یگانہ نے بھی کہاوت کی وہی شکل رکھی ہے جو میر کے یہاں ہے لیکن لغات میں نہیں ملتی، اس لیے ممکن ہے کہ یگانہ نے اس کی یہ شکل میر کے یہاں دیکھی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کہاوت خود میر کی وضع کردہ ہو۔ کیوں کہ اگر یہ باقاعدہ اور معروف کہاوت ہوتی تو 'پلیٹس' یا 'آصفیہ' کسی میں ضرور ہوتی۔ میر کہاوت کو کس خوبی سے استعمال کرتے ہیں، یہ شعر اس کی ایک مثال ہے۔ یگانہ نے بھی اسے اچھی طرح برتا ہے لیکن میر والی بات نہیں۔ میر نے پہلے مصرعے میں 'منھ لگانا' کا محاورہ رکھ کر بوسے کی مناسبت پیدا کر دی ہے۔ محاورے کا محاورہ ہے اور لغوی اعتبار سے بھی درست ہے۔ پھر 'چومتے ہی گال کاٹنا' کے معنی ('ابتدا ہی میں نقصان پہنچانا') مدِ نظر رکھے جائیں تو معنویت اور بڑھ جاتی ہے، کیوں کہ گال کاٹنا ہی نقصان پہنچانا نہیں ہے، بلکہ معشوق کا بوسہ لینا یا اس کو ہاتھ لگانا بھی اس کے کنوار پن کو نقصان پہنچاتا ہے۔ پھر یگانہ کے یہاں محض طنز ہے، جب کہ میر کے یہاں خوش طبعی اور رندی بھی ہے۔ معشوق کو گال کاٹنے پر کسی طرح کی شرمندگی نہیں بلکہ ایک طرح کی ڈھٹائی ہے۔ 'پیار'، 'منھ'، 'چومے' اور 'گال' میں مراعات النظیر بھی ہے۔

ملاحظہ ہوں ۵۲، ۱۱۹"

۴ ۱

معروضہ: اردو لغات میں 'چومتے ہی گال کاٹنا' کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ ممکن ہے ان لغات کے علاوہ بھی کوئی دیگر صورت موجود ہو لیکن درج ذیل لغات میں اس کی یہ آٹھ صورتیں دیکھنے کو ملتی ہیں:

الف: پہلے چمے گال کاٹا

ب: پہلے چوے گال کاٹا
ج: پہلے ہی چوے میں گال کاٹا
د: چومتے ہی گال کاٹا
ہ: منھ چومتے گال کاٹا
و: منھ چومتے گال کاٹنا
ز: منھ چومتے ہی گال کاٹا
ہ: منھ چومتے ہی گال کاٹنا

خزینۃ الامثال (۱۸۵۳ء)[۲۰]: پہلے چوے گال کاٹا۔

فیلن (۱۸۷۹ء)[۲۱]: پہلے چمے گال کاٹا: کسی آدمی کو پہلے پہل جب کوئی کام سونپا جائے اور وہ اسے چوپٹ کر دے۔

مخزن المحاورات (۱۸۸۶ء) [۲۲]: منھ چومتے ہی گال کاٹا (ہ) محاورہ۔ پہلے ہی معاملے میں نقصان پہنچایا۔ شوقؔ

کھل گیا مجھ پہ تیرا سارا حال
پہلے منھ چومتے ہی کاٹا گال

نجم الامثال [۲۳]: پہلے چوے گال کاٹا۔ پہلے ہی معاملے میں دغا دی اور نقصان پہنچایا۔

آصفیہ (۱۸۹۸ء تا ۱۹۰۹ء)[۲۴]: 'منھ چومنا' کے ذیل میں درج ہے:

منہ چومنا (ہ) فعل لازم (۱) بوسہ لینا، چوما لینا، بی لینا، پیار لینا، جیسے منھ چومتے ہی گال کاٹا یعنی پہلے ہی معاملے میں یا اختلاط میں نقصان پہنچایا۔

کھل گیا بچہ تیرا سارا حال
پہلے منھ چومتے ہی کاٹا گال
(شوقؔ)

اسی طرح آصفیہ [۲۵] میں 'گال کاٹنا' کے ذیل میں لکھا ہے:

گال کاٹنا (ہ) فعل متعدی (۱) زخم بر رخسار زدن کا ترجمہ۔ رخسارہ پر دانت مارنا۔

(۲) نقصان پہنچانا۔ ضرر پہنچانا جیسے: 'منھ چومتے ہی گال کاٹا'۔

نور اللغات (۱۹۲۴ء تا ۱۹۳۴ء)[۲۶] میں اس 'مثل' کی تین صورتیں ملتی ہیں:

پہلے چومے گال کاٹا۔ مثل (بازاری) پہلی ہی ملاقات میں رنج دیا۔ ابتدا ہی میں ایذا دی۔

چومتے ہی گال کاٹا۔ مثل ابتدا کرتے ہی نقصان پہنچایا۔

منھ چومتے ہی گال کاٹا۔ مثل۔ ابتدا ہی میں نقصان پہنچایا۔ شوقؔ

کھل گیا مجھ پہ تیرا سارا حال
پہلے منھ چومتے ہی کاٹا گال

فرہنگ اثر: (۱۹۶۱ء)[۲۷] پہلے چومے گال کاٹے (مثل بازاری) پہلی ہی ملاقات میں رنج دیا۔ ابتدا ہی میں ایذا دی۔

اثرؔ: چوہے صاف صاف لکھا ہے۔ کتابت کی غلطی ہے۔ چومے چاہیے۔ صحیح مثل اس طرح ہے: چومتے ہی گال کاٹا۔ اس میں ایسی کوئی رکاکت نہیں کہ اسے بازاری کہا جائے۔ بیشتر ہندی مثلیں ایسی ہیں جو عوامی یا عورتوں کی زبان میں ہیں۔

اردو لغات (۱۸۹۴ء)[۲۸]: منھ چومتے ہی گال کاٹنا۔ پہلے ہی معاملے میں نقصان پہنچانا۔

قرار اللغات (۱۹۱۹ء)[۲۹]: منھ چومتے گال کاٹنا۔ ابتدا میں دھوکا دینا (شوقؔ)

کھل گیا مجھ پہ تیرا سارا حال
پہلے منھ چومتے ہی کاٹا گال

...... چومتے ہی گال کاٹا۔ آتے ہی نقصان کیا۔

...... پہلے ہی چومے میں گال کاٹا۔ ملاقات ہوتے ہی رنج دیا۔

مرأت منیر یعنی منیر اللغات اردو (۱۹۳۰ء)[۳۰]: منھ چومتے ہی گال کاٹا۔ ابتدا ہی میں دھوکا دیا۔ (شوقؔ)

کھل گیا مجھ پہ تیرا سارا حال
پہلے منھ چومتے ہی کاٹا گال

جامع الامثال (۱۹۸۶ء)[۳۱]: پہلے چوے گال کاٹا۔ شروع ہی میں شرارت کی۔ ابتدا میں ایذا دی تو بعد میں بھلائی کی کیا اُمید ہو سکتی ہے (۱۱۰)

……چومتے ہی گال کاٹا۔ ابتدا ہی میں نقصان پہنچایا (ص ۱۸۰)

……منھ چومتے ہی گال کاٹا۔ ابتدا ہی میں نقصان پہنچایا (۳۷۶)

معیار اردو[۳۲]: منھ چومتے ہی گال کاٹا۔ ابتدا ہی میں معاملے میں شرارت کی۔

'شعر شور انگیز' (جلد اول) ص ۶۳۴

تب بھی نہ سر کھینچا تھا ہم نے آخر مر کر خاک ہوئے
اب جو غبارِ ضعیف اٹھا تھا پامالی میں گرد ہوا

سر کھینچنا: سر اٹھانا، رو کرنا۔

ص ۲/۶۳۵: ''تب بھی'' کہہ کر امکانات کی ایک پوری دنیا رکھ دی ہے۔ یعنی جب ہم کو طرح طرح سے دبایا گیا۔ یا ہم پر طرح طرح کے ظلم ہوئے یا جب ہم نے بڑی سختیاں سہیں، اس وقت بھی ہم نے سر نہ اٹھایا۔ سر اٹھانے سے سرکشی کرنا مراد ہو سکتا ہے۔ (''سر کھینچنا'' دراصل ''سرکشیدن'' کا ترجمہ ہے اور شاید صرف میرؔ نے استعمال کیا ہے، اردو میں عام نہ ہو سکا۔)''

معروضہ: محاورہ 'سر کھینچنا' میرؔ سے پہلے اور بعد میں مستعمل رہا ہے:

قاضی محمود بحریؔ (وفات: ۱۷۱۷ء)[۳۳]

توں بولے گا خورشید سر کھینچیا
یتی گرد ہوئی جو فلک نیں دسیا [کذا]

قلی قطب شاہ (۱۵۶۵۔۱۶۱۱ء)[۳۴]

میں استاد تعلیم سے سر نہ کھینچا
جنے کوئی کھینچے گا پکارے گا جیوں خر

آبرو(۱۶۸۳ـ۱۷۳۳ء)۳۵

کرے گی شہر میں فتنہ تجھے خواہی نخواہی یہ
تری آخر کو سر کھینچے گی ظالم کج کلاہی یہ

(میر سجاد(۱۷۰۴ـ۱۷۵۹ء)۳۶

کس طرح سے چرخ یہ پھرتا ہے سر کھینچے ہوئے
کیوں نہ بے مغزوں کو ہو سجاد آتا ہے دماغ

بیدار(۱۷۳۲/۳۳ـ۱۷۹۷ء)۳۷

کیوں کر اب سر کو نہ میں ظل ہما سے کھینچوں
کہ مرے سر پہ ترا سایۂ دیوار ہوا

درد(۱۷۲۱ـ۱۷۸۵ء)۳۸

محبت نے تمھارے دل میں بھی اتنا تو سر کھینچا
قسم کھانے لگے تب ہاتھ میرے سر پہ دھر بیٹھے

جوشش(۱۷۳۸/۳۹ـ۱۷۲۰)۳۹

آتش عشق نے جو سر کھینچا
حسن کے دودمان تک پہنچی

محمد حسین کلیم(ہم عصر میر)۴۰

زبانِ موج نے یوں بحر کہتا تھا حبابوں سے
کہ اپنا سر ہی کھاتا ہے جہاں میں جن نے سر کھینچا

’شعر شور انگیز‘ (جلد دوم) ص۱۰۲

”پیش از دمِ سحر مرا رونا لہو کا دیکھ
پھولے ہے جیسے سانجھ وہی یاں سماں ہے اب

ص۱۰۵ ۱۵۶:۱۰۵/۲ بعض لوگ ”پھولے ہے جیسے سانجھ“ کو میر کے پراکرتی شغف سے تعبیر کریں گے۔ بات صحیح ہے، لیکن یہاں بات صرف اتنی نہیں ہے۔ ”سانجھ“ کے معنی ”شفق شام“

بھی ہوتے ہیں، لیکن ’’شام‘‘ کے معنی ’’شفق شام‘‘ نہیں ہوتے۔ ’’شفق پھولنا‘‘ محاورہ، یعنی شفق کی سرخی کا آسمان پر پھیل جانا۔ ’’شام پھولنا‘‘ بھی محاورہ ہے، لیکن اس کے معنی ہیں ’’شام کے سایوں کا دور تک پھیلنا‘‘ لہٰذا میرؔ نے ’’سانجھ‘‘ بمعنی ’’شفق‘‘ میں ’’شفق پھولنا‘‘ بمعنی ’’شفق کی سرخی کا آسمان پر پھیل جانا‘‘ کا پیوند لگا کر ’’سانجھ پھولنا‘‘ کا استعارہ وضع کیا ہے۔ صبح کے پھولنے کے ہی رونے کے باعث شفق شام کے پھولنے کا منظر پیدا ہو جانا بھی خوب ہے۔‘‘

معروضہ: قصۂ مہر افروز دلبر (زمانۂ تصنیف ۱۷۳۲ تا ۱۷۵۹ء) [۱] میں ’’سانجھ پھولنا‘ کا استعمال دیکھا جا سکتا ہے:

’’اور دھنک وسانجھ پھولی کا بھاؤ ایسا رکھا تھا کہ گویا سانجھ ہی پھولی ہے۔‘‘

حاشیۂ متن: سانجھ پھولنا: شفق پھولنا۔

سودا (۱۷۰۶ـ۱۷۸۱ء) [۲] نے بھی اس محاورے کو خوب باندھا ہے:

مستک پہ رنگ اس کے جس طرح جلوہ گر ہو
گو سانجھ لاکھ پھولے یہ لطف پر کہاں ہو

’شعر شور انگیز، (جلد دوم)، ص ۲۵۹

یہ کیا کہ دشمنوں میں ہمیں سانٹے لگے
کرتے کسو کو ذبح بھی تو امتیاز سے

’’سانٹا‘‘ کا لفظ بہت پرقوت اور محاکاتی ہے، مگر ممکن ہے بعض ’’نازک‘‘ طبائع پر گراں گزرے۔ میں نے اسے میرؔ کے علاوہ صرف یگانہؔ کے یہاں دیکھا ہے:

مرا پاؤں پھسلا تو پروا نہیں
مگر تم مرے ساتھ ناحق سنے

معروضہ: فاروقی صاحب نے ’’سانٹا‘‘ سے متعلق یگانہؔ کا جو شعر بطور مثال پیش کیا ہے اس

میں لفظ ’سمنا‘ فعل لازم کے طور پر باندھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں۔

میر سجاد (۱۷۰۴۔۱۷۸۱ء)[۴۳]

جب، کہ آنکھوں نے بلا عشق کے سر پر ٹھانی
مشتِ گل دل کی گئی مفت میں اول سانی

سودا (۱۷۰۶۔۱۷۸۱ء)[۴۴]

معمور ہے جس روز سے ویرانۂ دنیا
ہر جنس کے انسان کی مائی گئی سانی

مزید مثالوں کے لیے دیکھیے [کذا][۴۵] الف، ب، ج۔

’شعر شور انگیز‘ (جلد دوم) ص ۳۲۹

داغ جلائے فلک نے بدن پر سرو چراغاں ہم کو کیا
کہاں کہاں اب مرہم رکھیں جسم ہوا ہے سراسر داغ

ص ۳۳۰: ۲/۲۱۳ ’’داغ سوختن‘‘ بمعنی ’’داغ پیدا کرنا‘‘ یا ’’داغنا‘‘ فارسی میں بھی ہے، انگریزی میں بھی To burn a scar on۔ میر نے فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔ افسوس کہ یہ خوب صورت محاورہ عام نہ ہوا۔ ’’آصفیہ‘‘ اور ’’پلیٹس‘‘ میں اس کا ذکر نہیں۔‘‘

معروضہ: محاورہ ’’داغ جلانا‘‘ خاورنامہ (زمانۂ تصنیف: ۱۶۴۰ء)[۴۶] میں بھی ملتا ہے:

کہو کون پھل آیا در تازہ باغ
کہ جوں لالہ او دل یہ نیں جالیا داغ

’شعر شور انگیز‘ (جلد سوم)، ص ۲۹۳

کہیے لطافت اس تن نازک کی میر کیا
شاید یہ لطف ہوگا کسو جانِ پاک میں

ص، ۲۶: ۳/۲۸۵۔ جسم اور جان کے مضمون پر اس طرح کے کئی اشعار کے لیے ملاحظہ ہو ۳/۱۸۰ اور ۲/۲۰۳۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس مضمون میں میرؔ نے ہمیشہ نئے نئے رنگ پیدا کیے ہیں۔ یہاں بھی بعض پہلو بہت تازہ ہیں۔ دونوں مصرعے انشائیہ ہیں۔ مصرع ثانی میں دو معنی ہیں: (۱) شاید ہی کسی جان پاک میں وہ لطف ہو۔ (۲) ایسا لطف کسی جان پاک میں شاید ہو تو ہو، کسی بدن میں نہیں ہوسکتا۔

''لطف'' اور ''لطافت'' کی رعایت بھی خوب ہے۔ ''جان پاک'' بمعنی ''روح'' نہ ''بہارِ عجم'' میں ہے، نہ ''فرہنگِ آنندراج'' میں، حالاں کہ سعدیؔ نے ''گلستاں'' میں باندھا ہے:

چو آہنگ رفتن کند جان پاک
چہ بر تخت مردن چہ بر روے خاک

(جب روح جانے کا ارادہ کرے تو اس وقت تخت پر مرنا کیا اور ننگی زمین پر مرنا کیا)۔

ترقی اردو بورڈ کراچی ''اردو لغت'' میں میر حسن کا ایک شعر درج کر کے ''جان پاک'' سے کنایتاً رسول اللہؐ مراد بتائی گئی ہے۔ میر حسن کے شعر میں بہت دور کا قرینہ اس کا ملتا ہے، لیکن میرؔ کے شعر میں اس معنی کا بالکل قرینہ نہیں۔ چوں کہ روح کی صفت ''بے گناہ'' بھی بیان کی ہے (آنند راج) اس لیے ''جان پاک'' کے معنی ''روح'' ہی درست اور مناسب ہیں......''

معروضہ: لغت نامہ[۷] میں 'جان پاک' کے معنی 'روح خالص' دیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں وجدیؔ کی پنچھی باچھا، (زمانۂ تصنیف: ۱۷۱۸ء)[۸] اور یکروؔ (وفات ۱۷۴۹ء)[۹] کے اشعار کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں:

وجدیؔ

اس کو دیکھے کوئی نیں جز جان پاک
عقل اس وادی منے ہے نت ہلاک

(ص ۲۰)

بات کرنے یوں لگی ہے اب کہاں
میرے جی سے پاک دامن پاک جاں

(ص۲۹)

راز کا محرم سو جان پاک ہے
رزق کا محرم سو جانِ پاک ہے

(ص۸۳)

جو منگے دینے بدل حق جانِ پاک
قالبِ آدم کو جو تھا آب و خاک

(ص۱۸۰)

یکرو (وفات: ۱۷۴۹ء)

آ ملو مہرباں ہو یکرو سیں
کچھ نہیں اس میں جانِ پاک پیا

(ص۱۱)

'شعر شور انگیز' (جلد سوم) ص ۴۷۷

ہو شرم آنکھ میں تو بھاری جہاز سی ہے
مت کرکے شوخ چشمی آشوب سا اٹھاؤ

ص ۴۷۹/۸۰: ۳۳۲/۳ شرم کی وجہ سے بھاری (جھکی ہوئی) آنکھ کو جہاز کی طرح بھاری قرار دینا یا بھاری جہاز کی سی قرار دینا تشبیہ کا معجزہ ہے۔ تمام نسخوں میں ''جہاز سے ہے'' درج ہے، لیکن ''جہاز سی ہے'' صحیح معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ اس طرح تشبیہ بھی پوری ہے اور معنی بھی دو ہیں۔ پھر جہاز کی شکل بھی آنکھ کی سی ہوتی ہے، لہٰذا تشبیہ مرکب کا لطف حاصل ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ جہاز اس قدر بھاری ہوتا ہے کہ کسی کے اٹھائے نہیں اٹھتا۔ لیکن یہی جہاز پانی پر

بخوبی تیرتا ہے اور اگر پانی میں آشوب (طوفان، تلاطم) آ جائے تو جہاز لہروں کے ساتھ اوپر اٹھ جاتا ہے اور بعض اوقات لہریں اسے اچھال بھی دیتی ہیں۔ یہ تو ہوئی تشبیہ کی واقعیت۔ اب کمال یہ ہے کہ اگرچہ آشوب پہلے آتا ہے اور جہاز اس کے اثر سے اٹھتا یا اچھلتا ہے، یہاں جہاز کے اٹھنے کو (یعنی آنکھوں کے ترک شرم کرنے اور نگاہ کے اٹھنے کو) آشوب سے تعبیر کیا ہے۔ مناسبت تو موجود ہی ہے کہ معشوق جب آنکھیں اٹھا کر شوخیاں کرے گا تو ہر طرف آشوب برپا ہوگا۔

''آشوب سا'' میں لفظ ''سا'' بھرتی کا ضرور ہے، لیکن ''سی'' اور ''سا'' کی مناسبت نے اسے حشو قبیح کی جگہ حشو متوسط بنا دیا ہے۔ بہر حال، حشو پھر بھی حشو ہے۔ ''آنکھ''، ''چشمی'' اور ''آشوب'' میں ضلع کا ربط ہے۔ (آشوبِ چشم آنکھوں کی بیماری ہوتی ہے)۔ معنوی نکتہ یہ ہے کہ آنکھ اگر شرم ترک کر دے تو یہ ایک طرح کی بیماری ہوئی۔

ایک معنی یہ بھی ہیں کہ جب تک شرم آنکھ کے اندر ہے تو وہ جہاز کی طرح بھاری ہے۔ آنکھ سے شرم نکل گئی تو وہ رسوا اور ہلکی ہو گئی۔ یعنی شرم کا وقار اسی وقت تک ہے جب تک وہ اپنے گھر (آنکھ) میں ہے۔ گھر سے نکلی کہ سبک ہوئی۔ ادھر آنکھ پر یہ معاملہ گزرا کہ وہ شرم کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی، ایک جگہ پر قائم اور ٹھہری ہوئی تھی۔ آنکھ سے شرم نکلی تو آنکھ کا توازن بگڑا اور پریشاں نظری شروع ہوئی۔ یہ پریشاں نظری زمانے کے لیے آشوب تو ہے ہی، خود معشوق کے لیے آشوب ہے (کیوں کہ اس کے وقار کو ٹھیس لگے گی اور اس کی عصمت پر دھبہ آئے گا)۔

''نور اللغات'' میں ''آنکھ میں شرم ہو تو جہاز سے بھاری ہے'' کا اندراج بطور ضرب المثل کر کے معنی لکھے ہیں ''شرم وحیات سے وقار ہوتا ہے'' پھر (سعادت خاں) ناصر کا شعر نقل کیا ہے:

طوفان جوڑنے سے کسی کے نہ ہو سبک
بھاری جہاز سے ہے جو آنکھوں میں شرم ہے

''اردو لغت تاریخی اصول پر'' میں یہی اندراج بطور ''مقولہ'' (ضرب المثل) اور یہی معنی درج ہیں۔ لیکن سند میں میر کا زیرِ بحث شعر نقل کیا ہے۔ فحوائے کلام سے یہ فقرہ ضرب المثل نہیں

معلوم ہوتا۔ نہ ہی کسی قدیم لغت میں اس کا اندراج ملا۔ ایسی صورت میں مجھے اس کو ضرب المثل ماننے میں سخت کلام ہے۔ ممکن ہے میرؔ کا مصرع بہت مشہور ہو گیا ہو۔ پھر سعادت خاں ناصر نے اسے بطور ضرب المثل باندھ دیا ہو۔“

معروضہ: ‘آنکھ میں شرم ہو تو جہاز سے بھاری ہے’ کے سلسلے میں ‘نور اللغات’ اور ‘اردو لغت’ (کراچی) دونوں لغات کی سندیں کافی ہیں۔ اس کے علاوہ ‘نجم الامثال ص۵۰’ میں بھی اس کا اندراج ملتا ہے:

آنکھ میں شرم ہو تو جہاز سے بھاری ہے۔ یعنی شرم والا آدمی بڑا بھاری بھرکم اور ”معزز“ اور ایماندار سمجھا جاتا ہے۔

‘نجم الامثال’، ‘آصفیہ’ اور ‘محاوراتِ ہند’ میں اس کہاوت کی درج ذیل صورتیں بھی ملتی ہیں:

‘نجم الامثال’ ص۵۱: لاج کی آنکھ جہاں سے بھاری۔ خجالت اٹھانا جہاز کے اٹھانے سے بھی مشکل ہے۔

آصفیہ ۲ ص۵۲: لاج کی آنکھ جہاز سے بھاری۔ کہاوت۔ یعنی جہاز اپنی جگہ سے چل سکتا ہے مگر لحاظ کی آنکھ اونچی نہیں ہو سکتی۔ شرم والے کی مشکل ہے۔ شرمالو ہر طرح سے نقصان اٹھاتا ہے۔

محاوراتِ ہند (۱۳۰۴ھ) ص۵۳: لاج کی آنکھ جہاز سے بھاری۔ خجالت نہیں اٹھائی جاتی۔

‘شعرِ شور انگیز’ (جلد سوم) ص ۶۵۷

گل گل شگفتہ مے سے ہوا ہے نگار دیکھ
یک جرعہ ہمدم اور پلا پھر بہار دیکھ

گل گل: بہت زیادہ

ص ۵۸/۶۵۷: ۳۷۱/۱۱ اس شعر کا مضمون ملا طغرا سے ماخوذ ہے:

گل گل رخِ تو از قدحِ مل شگفتہ شد
یک آب خورد گلبن وصد گل شگفتہ شد

(تیرا چہرہ شراب کے ایک جام نے خوب شگفتہ کر دیا۔ گلاب کے پودے نے ذرا سا پانی پیا اور سیکڑوں پھول کھل گئے)۔

سچ یہ ہے کہ ملا طغرا کا مطلع مضمون آفرینی کا عمدہ نمونہ ہے اور میرؔ سے اس کا جواب بن نہ پڑا۔ لیکن میر نے اپنے انداز سے کام لیتے ہوئے صورتِ حال میں تازگی پیدا کر دی ہے۔ صورتحال سے میری مراد ہے وہ موقع جس پر یہ شعر کہا گیا ہے۔ شعر میں کم سے کم تین کردار ہیں۔ ایک تو متکلم، دوسرا وہ شخص جسے ''ہمدم'' کہہ کر مخاطب کیا گیا ہے اور تیسرا معشوق۔ ایسا لگتا ہے کہ متکلم اور اس کا ہمدم، معشوق کو راضی کر کے لائے ہیں اور شراب پلا کر لطفِ محبت اٹھا رہے ہیں۔ لفظ ''نگار'' بھی یہاں دلچسپ ہے، کیوں کہ ''نگار'' ان پھول پتیوں کو بھی کہتے ہیں جو ہاتھ پاؤں پر مہندی سے بنائی جاتی ہیں۔ اس طرح معشوق کی شگفتگی اور ''نگار'' کی شگفتگی میں معنوی ربط پیدا ہو گیا ہے۔ مصرع ثانی میں اشتیاق، معشوق کے حسن پر فخر اور اس کی ستائش اور ہوس، ان سب کا عمدہ امتزاج ہے۔

شراب سے چہرہ شگفتہ ہو جانے کا مضمون میرؔ نے کئی بار باندھا ہے۔ اس مضمون پر ان کا بہترین شعر ۲/۱۷۸ پر دیکھیے۔ پھر دیوانِ چہارم میں ہے:

منھ سے لگی گلابی ہوا کچھ شگفتہ تو
تھوڑی شراب اور بھی پی جو بہار ہو

''گل گل'' کے فقرے کو بھی اس سے مشابہ مضمون کے ساتھ میرؔ نے ایک اور جگہ لکھا ہے:

گل گل شگفتگی ہے ترے چہرے سے عیاں
کچھ آج میری جان قیامت بہار ہے

(شکار نامۂ اول)

معلوم ہوتا ہے ''گل گل'' بمعنی ''بہت زیادہ'' اٹھارھویں صدی میں خاصا عام تھا۔ چنانچہ یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

وہ گل گل شگفتہ ہوا گل کی طرح
یہ گل کی طرح اور وہ بلبل کی طرح

(میر حسن مثنوی)

نہ ہوں گل گل شگفتہ کیوں کہ اے دردؔ مستوں کا
مئے گلگوں کی دولت سربسر گلفام ہے شیشہ

(خواجہ میر درد)

تعجب یہ ہے کہ استعمال کی اس کثرت کے باوجود "گل گل" کا اندراج کسی لغت میں نہیں۔ جناب برکاتی کی فرہنگ میرؔ بھی اس سے خالی ہے۔ اثر صاحب کی نگاہ سے بھی یہ بچ نکلا ہے۔

معروضہ: فارسی کی بیشتر لغات میں 'گل گل' کا اندراج موجود ہے۔ 'چراغ ہدایت' (۱۷۳۴ء)[۵۴] اور 'مصطلحاتِ شعرا' (۱۷۳۸ء)[۵۵] میں 'گل گل شگفتن' بمعنی ہزار رنگ شگفتن ...... وگل گل بمعنی مطلق شگفتہ...... 'درج ہے۔ اس کے علاوہ 'فرہنگِ فارسی'[۵۶] میں بھی 'گل گل' قید مرکب کے طور پر دیا گیا ہے بمعنی 'بسیار بسیار'

فاروقی صاحب نے میرؔ، میر حسنؔ اور دردؔ کے اشعار کی جو مثالیں پیش کی ہیں ان سبھی میں، 'گل گل شگفتہ ہونا' استعمال ہوا ہے نہ کہ 'گل گل' اس لیے میرے خیال میں یہ 'گل گل شگفتن' کی ایک صورت ہو سکتی۔ نظیر[۵۷] کے درجِ ذیل شعر میں بھی یہی صورت ملتی ہے:

سنتے ہی اس پری نے گل گل شگفتہ ہو کر
پوشاک زرفشانی اپنی وہیں رنگائی

اس کے علاوہ یکروؔ[۵۸] نے اپنے ایک شعر میں "گل گل کھلنا" باندھا ہے جو 'گل گل شگفتن' کی ہی اردو شکل ہے:

ترے ابرو کے زخماں سیں دلِ یکروؔ کھلا گل گل
یہاں آ سیر کر اے جاں نہ جا سیرِ گلستاں کوں

'شعرِ شور انگیز' (جلد چہارم) ص ۱۹۷

اس کی دل آزاری بے ہیچ ہی تھی یارو
کچھ تم کو ہماری بھی تقصیر نظر آئی

بے ہیچ: بے ضرورت، بے وجہ

ص ۲۰۶ ۳۷۹:۹/۴ ''بے ہیچ' دل چسپ لفظ ہے۔ اسے میرؔ نے کم سے کم چار بار استعمال کیا ہے۔ ایک بار تو یہیں شعر زیرِ بحث میں اور پھر حسبِ ذیل اشعار میں:

تھی یہ کہاں کی یاری آئینہ رُو کہ تو نے
دیکھا جو میرؔ کو تو بے ہیچ منھ بنایا

(دیوانِ اول)

ہم مستِ عشق واعظ بے ہیچ بھی نہیں ہیں
غافل جو بے خبر ہیں کچھ ان کو بھی خبر ہے

(دیوانِ اول)

تازگی داغ کی ہر شام کو بے ہیچ نہیں
آہ کیا جانے دیا کس کا بجھایا ہم نے

(دیوانِ اول)

ظاہر ہے کہ شعر زیرِ بحث اور شعر نمبر ایک میں ''بے ہیچ'' بمعنی ''بے ضرورت، بے وجہ'' ہے اور شعر نمبر دو میں ''بے ہیچ'' بمعنی ''بے حقیقت'' ہے۔ شعر ۲ میں معنی ہیں ''بے وجہ، خالی از علت۔''

آسی نے ''بے ہیچ'' کے معنی ''بے تہ، فرومایہ'' اسی شعر کے حوالے سے لکھے ہیں۔ جناب برکاتی اس شعر کو نظر انداز کر گئے ہیں۔ انھوں نے شعر زیرِ بحث اور شعر نمبر ایک کے حوالے سے معنی ''بے سبب، بلا وجہ'' درست لکھے ہیں، لیکن ان کا یہ ارشاد غلط ہے کہ آسی کے معنی پر مبنی ''کوئی مثال نظر نہیں آئی۔'' ''اردو لغت، تاریخی اصول پر'' میں دونوں معنی درج ہیں اور میرؔ کا شعر نمبر ایک مثال میں درج ہے۔ ''نور اللغات''، ''آصفیہ''، فیلن سب اس لفظ سے خالی ہیں۔ ''فرہنگ اثر'' میں بھی یہ نظر انداز ہو گیا ہے۔ پلیٹس اور ڈنکن فوربس میں یہ لفظ ''بے ضرورت، بے وجہ'' کے معنی میں

مرقوم ہے۔ ''بہارِ عجم''، ''برہانِ قاطع'' وغیرہ میں یہ لفظ موجود نہیں۔ بدیں وجوہ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا یہ میرؔ کی ایجاد ہے یا دلی کا کوئی گم نام روزمرہ ہے جس سے اربابِ لغات بےخبر رہے۔ اغلب ہے کہ پلیٹس اور ڈنکن فوربس نے میرؔ کا زیرِ بحث شعر دیکھ کر اسے درج کیا اور شعر نمبر دو سے وہ بے خبر رہے، ورنہ دوسرے معنی بھی درج کرتے۔ وارستہ کی ''مصطلحات'' اور خان آرزو کی ''چراغِ ہدایت'' میں بھی ''بے ہیچ'' کا وجود نہیں۔ اسٹائن گاس، جسے الفاظ جمع کرنے کا اتنا شوق ہے کہ بعض اوقات ضعیف اسناد پر وہ فرضی لفظ بھی اپنی لغت میں لے آتا ہے، وہ بھی ''بے ہیچ'' سے بے خبر معلوم ہوتا ہے۔ قدیم اردو (= دکنی) کی لغات جو میرے پاس ہیں ان میں بھی یہ لفظ درج نہیں ہے۔

اب شعر کے معنی پر غور کریں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہاں ''بے ہیچ'' بمعنی ''بے وجہ'' ہے۔ یعنی معشوق نے دل آزاری بے وجہ کی۔ ''بے ہیچ ہی تھی'' میں کنایہ ہے کہ یہ بات سب پر ثابت و ظاہر ہے کہ معشوق نے بے وجہ اور بے سبب متکلم (یا عمومی گروہ عاشقاں) کے دل کو تکلیف پہنچائی۔ دوسرے مصرعے میں لوگوں سے پوچھا ہے کہ وہ سچ سچ بتائیں کہ کیا متکلم (یا گروہ عاشقاں) کی طرف سے انھیں کوئی کمی نظر آئی؟ ''تقصیر'' کو اگر ''قصور''، ''خطا'' کے معنی میں لیں تو شعر میں تکرار فضول واقع ہوتی ہے۔ ''تقصیر'' یہاں ''کمی'' کے معنی میں ہے، کہ اگر معشوق نے بے سبب دل آزاری کی تو کی، لیکن ہم لوگوں نے وفاواری، خوشی خوشی دل آزاری سہنے، وغیرہ میں کوئی کمی نہ کی۔ شعر میں معنی کا لطف زیادہ نہیں، لیکن ایک کیفیت ہے اور لفظ ''بے ہیچ'' بہرحال بہت تازہ لفظ ہے۔ میں نے رشید حسن خاں اور نیر مسعود سے استصواب کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ ''بے ہیچ'' فارسی میں بھی نہیں ہے۔''

معروضہ: فاروقی صاحب نے 'بے ہیچ' کی سند میں کلام میر سے جو مثالیں پیش کی ہیں ان میں 'بے ہیچ' بمعنی 'بے ضرورت'، 'بے وجہ' ہے۔ مصحفی (۱۷۵۰ـ۱۸۲۴ء)[۵۹] نے بھی 'بے ہیچ' بمعنی 'بے وجہ'، 'بے ضرورت'، 'بے سبب' باندھا ہے:

الجھتی ہیں ہم سے یہ بے پیچ مشفق
ذرا اپنی زلفوں کو سمجھایئے گا

فاروقی صاحب کا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ 'میر کی ایجاد' یا 'دلی کا گم نام روزمرہ ہے' اور یہ فارسی میں بھی نہیں ہے۔ حالاں کہ فارسی کی مشہور لغت 'لغت نامہ' میں 'بے پیچ' کا اندراج اس طرح ہے:

بی پیچ: صفتِ مرکب (مرکب از: بی + پیچ) بے چیز۔

بی پیچ مردم، مردم بی چیز، فقیر، نادار

تہی دست برخوبرویان۔ اُپیچ
کہ بی پیچ مردم نیرزد بپیچ

(سعدی)

'فرہنگ اصطلاحات فارسی بہ انگلیسی'[۶۱] کے ذیل میں 'بی پیچ' کے معنی اس طرح درج ہیں:

بی پیچ نیست (بی اساس نیست)

THERE IS SOMETHING IN IT

IT IS NOT ENTIRELY GROUNDLESS

'شعرِ شور انگیز' (جلد چہارم) ص ۳۵۶

جم گیا خوں کفِ قاتل پہ ترا میرؔ زبس
ان نے رو رو دیا کل ہاتھ کو دھوتے دھوتے

ص۶۲/۶۱ ۳:۲۰۸/۳ میرؔ کے شعر میں مضمون کی قوت اور گہرائی اور اس کی ڈرامائی شدت کا اندازہ کرنا ہوتو ۱۱/۷۱ اس شعر کا موازنہ کریں۔ ان اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے سردار جعفری کہتے ہیں: ''شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے میک بیتھ میں جب اپنے مجرم ضمیر کی ستائی ہوئی لیڈی میک بیتھ خواب میں چلتی ہے تو وہ اپنے ہاتھوں کو اس انداز سے ملتی رہتی ہے جیسے انھیں دھونے کی کوشش کر رہی ہو لیکن خونِ بے گناہ کے دھبے کسی طرح نہیں چھوٹتے اور وہ بڑبڑاتی ہے کہ عرب کا عطر بھی اس

کے ہاتھوں سے خون کی بو کو نہیں دور کر سکتا۔ میرؔ کا وہ محبوب بھی جو سفاک بادشاہوں اور خوں ریز فاتحوں کا کنایہ ہے اپنے ہاتھ ملتا رہتا ہے۔'' اس کے بعد شعر زیرِ بحث نقل کر کے جعفری صاحب لکھتے ہیں کہ ''یہ جنون کی کیفیت ہے جسے عام اصطلاح میں خون چھڑنا کہتے ہیں۔'' اس بات سے قطع نظر کہ میرؔ کے معشوق کو اگر ''سفاک بادشاہوں اور خوں ریز فاتحوں کا کنایہ'' قرار دیں تو معنی نہ صرف بے حد محدود ہو جاتے ہیں بلکہ پھر ہاتھ ملنے اور خون کے دھبے چھڑانے کی سعی کا جواز باقی نہیں رہتا، ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر شعر زیرِ بحث کے لہجے سے معشوق کا کوئی سفاک بادشاہ یا خوں ریز فاتح ہونا متبادر ہوتا ہے تو پھر ہمیں زبان کے اشاروں کو از سرِ نو سیکھنا پڑے گا۔ ایک مزید بات یہ ہے کہ ''خون چڑھنا'' کا محاورہ کسی لغت میں نہیں ملا اور نہ اس سے وہ معنی ظاہر ہوتے ہیں جو جعفری صاحب نے بیان کیے ہیں۔ ''سر پر خون چڑھنا''، ''سر پر خون سوار ہونا''، ''خون سر پر چڑھ کر بولتا ہے'' وغیرہ محاورے تو ہیں، لیکن ان کے بھی معنی وہ نہیں جو جعفری صاحب نے ''خون چڑھنا'' کے بیان کیے ہیں۔

بنیادی بات تو یہ ہے کہ ہماری کلاسیکی شاعری کی تعبیر و تشریح میں مضمون آفرینی کے اصول کو نظر انداز کر دیں تو اس کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا۔ مثلاً میرؔ کا زیرِ بحث شعر مضامین کے ایک matrix کا حصہ ہے اور اس کے معنی متعین کرنے میں اس matrix کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ خود میرؔ نے یہ مضمون خان آرزو سے مستعار لیا ہے:

داغ چھوٹا نہیں یہ کس کا لہو ہے قاتل
ہاتھ بھی دکھ گئے دامن ترا دھوتے دھوتے

میرؔ کا شعر خان آرزو سے بہت بلند ہے، کیوں کہ میرؔ کے یہاں معنی اور لہجے کی کئی تہیں ہیں۔ لیکن خان آرزو کے شعر سے واقفیت نہ ہو تو میرؔ کے اس شعر سے بھی پوری طرح واقفیت نہیں ہو سکتی۔ مضمون چوں کہ استعارے پر مبنی ہوتا ہے اور استعارے کا عام اصول یہ ہے کہ وہ اس حقیقت سے بڑا ہوتا ہے جس کو بیان کرنے کے لیے اسے لاتے ہیں (یعنی مستعار لہ کے مقابلے میں مستعار منہٗ قوی تر ہوتا ہے) لہٰذا اس میں کثرت معنی کے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔ بدیں

وجوہ کلاسیکی غزل کے نقاد کے لیے ضروری ہے کہ وہ مضمون کو اس کے matrix میں رکھ کر دیکھنے پر قادر ہو۔ مثلاً زیر بحث شعر کے لیے خان آرزو کا شعر کلیدی اہمیت تو رکھتا ہی ہے، لیکن جو اشعار اور مضامین ۴۰۰/۱ پر گزر چکے ہیں ان کو بھی ذہن میں رکھنا سود مند ہوگا۔ غالب کو یاد رکھیے کہ ان کا مضمون بھی خان آرزو اور میر ہی سے شروع ہوتا ہے:

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

آخری بات یہ کہ متکلم یا مقتول کو اس بات پر کوئی رنج نہیں ہے کہ کسی کا (میر = عاشق یا= کوئی اجنبی، ملاحظہ ہو شبلی کی نظم ''عدل جہانگیری'') خون ہو گیا۔ رنج اس بات کا ہے کہ خون کے دھبے چھڑانے میں معشوق کو اتنی مصیبت ہوئی۔ عشق میں فنائے ذات ہو تو ایسی ہو۔''

معروضہ: یہ درست ہے کہ زیر بحث شعر میں، خون جم جانا، باندھا گیا ہے اور اسے 'خون چڑھنا' سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ لیکن اساتذہ کے کلام میں محاورہ 'خون چڑھنا' کی مثالیں موجود ہیں۔ اردو میں ایسے محاورے کثیر تعداد میں ہیں جو اساتذہ کے کلام میں موجود ہیں لیکن معروف لغات میں درج نہیں ہیں:

سراج اورنگ آبادی، سید سراج الدین سراج (۱۷۱۴ـ۱۷۶۳/۶۴ء)۶۲
ڈورے نہیں ہیں سرخ تری چشم مست میں
شاید چڑھا ہے خون کسی بے گناہ کا

آبرو (۱۶۸۳ـ۱۷۳۳ء)

تجھ اوپر خون بے گناہوں کا
چڑھ رہا ہے شراب کی سی طرح

'شعرِ شور انگیز' (جلد چہارم) ص ۳۹۶

سرسری کچھ سن لیا پھر واہ وا کر اٹھ گئے
شعر یہ کم فہم سمجھے ہیں خیال بنگ ہے

بنگ: بھانگ، بھنگ

ص۴ر۳ر۲ر۴۰۲ ۴۱۶/۴ جو لوگ میرؔ کی شاعری کو "عوامی" سطح (یعنی انتہائی غیر پیچیدہ زبان میں غیر پیچیدہ مضامین) کی شاعری سمجھتے ہیں، اگر میرؔ کے زمانے میں ہوتے تو انھیں شاید میرؔ کی گالیاں سننی پڑتیں۔ (سردار جعفری کہہ ہی چکے ہیں کہ میرؔ گالی بہت دیتے ہیں)۔ اس شعر میں بھی میرؔ نے ان لوگوں کو جو شعر سنتے ہی واہ وا کرنے لگتے ہیں اور اس پر غور کرنے کی زحمت نہیں کرتے، کم فہم (نافہم) کی گالی سے نوازا ہے۔ سرسری طور پر سننا اور رسمی طور پر واہ وا کرنا (اور پھر اٹھ جانا، یعنی یہ بھی کوئی تفریحی چیز، مثلاً مجرا ہے کہ سنا اور چل دیے) شعر فہمی نہیں بلکہ شعر شکنی ہے

صائب دو چیز می شکند قدرِ شعر را
تحسینِ ناشناس و سکوتِ سخن شناس

(اے صائب دو چیزیں شعر کی قیمت گرا دیتی ہیں، ایک تحسین ناشناس اور دوسری سکوتِ سخن شناس)۔

شعر سن کر (یا پڑھ کر) اس پر غور کرنا چاہیے، اور وہ شعر جو غور طلب ہو، اُسے قدر داں کی ضرورت ہے۔ یہ ہماری تخلیقی تہذیب کا عام اصول ہے اور ہمارے تہذیبی زوال کی علامت حسرتؔ مرحوم کا یہ شعر بھی ہے:

شعر دراصل ہیں وہی حسرتؔ
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

ورنہ میرؔ تو اپنے شعر کو زلف سا پیچ دار (ملاحظہ ہو جلد سوم، ص۱۳۰) کہنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ یا پھر وہ "حسن لطافت" کے ساتھ انواع و اقسام کے مضامین کو جمع کرنا اپنا کمال سمجھتے تھے:

سخن دس پانچ یاں ہیں جمع کس حسن لطافت سے
تفاوت ہے مرے مجموعہ و عقد ثریا میں

(دیوان سوم)

شعر گوئی عالمانہ مشغلہ ہے، مجذوب کی بڑ کو منظوم کرنے کا نام نہیں۔ یہ خیال ہمارے یہاں بہت پرانا ہے۔ چناں چہ ’’المعجم‘‘ کے اختتام پر شمس قیس رازی کہتے ہیں کہ ’’خوبی شعر حاصل کرنے کی خاطر شاعر کو ضرور ہے کہ وہ بیش تر علوم وفنون سے واقف ہو۔ اسے اعلیٰ تعلیم اور ہر موضوع کے بارے میں معلومات سے بہرہ مند ہونا چاہیے۔‘‘

میؔر نے ’’خیال بنگ‘‘ لکھ کر نہ صرف یہ کہ بہت عمدہ قافیہ تلاش کرلیا ہے، بلکہ استعارہ بھی نہایت نفیس برتا ہے۔ بھنگ کا استعمال کرنے والا فضول اور لایعنی باتیں بہت سوچتا ہے اسی لیے بھنگ کو ’’فلک سیر‘‘ بھی کہتے ہیں۔ لہٰذا ’’خیال بنگ‘‘ کے معنی ہوئے ’’ایسا خیال جو بنیادی طور پر فضول لیکن دل چسپ اور آسمان میں تھگلی لگانے کی طرح ہو۔‘‘ یعنی میؔر کی نظر میں شعر بہت ہی منظم highly organised اور غیر ضروری الفاظ یا ڈھیلے پن (Slack) سے پاک بیان ہے۔ یہ بھنگیڑیوں کے خیالات کی طرح منتشر اور Chaotic نہیں۔ مختصراً، شعر ایک فن ہے اور اس کے تقاضوں اور لوازم کا احترام ضروری ہے۔

مضمون کی ندرت شاعر کو اسی طرح اپنی طرف کھینچتی ہے جس طرح نشہ باز کو نشہ اپنی طرف بلاتا ہے۔ میؔر نے کم فہموں کو کہا ہے کہ وہ شعر کو ’’خیال بنگ‘‘ سمجھتے ہیں۔ بھنگ کے نشے میں چوں کہ ایک طرح کی مبالغہ آمیز زیادتی ہوتی ہے اس لیے شاعری کے نشے کو بھی بھنگ کا نشہ کہا گیا ہے۔

مصحفی:

بے عقل ترے حق میں کہے کچھ تو مصحفی
تو یہ سمجھ چڑھے ہے اسے بنگِ شاعری

مصحفی کا شعر دیوانِ ششم میں ہے، اس لیے اغلب ہے کہ انھوں نے میؔر کا زیرِ بحث شعر دیکھا ہوگا۔ ویسے بھنگ کے نشے سے مصحفی کو شاید کچھ رغبت تھی۔ اسی دیوان میں ان کا شعر ہے:

منت کشِ مغاں نہ ہو زنہار مصحفی
آنکھوں کو اپنی کر تو بیک قرط بنگ سرخ

عباسی نے زیر بحث شعر اور اس کے اوپر والے شعر کو جو ہمارے انتخاب میں شامل نہیں ہے، قطع بند قرار دیا ہے۔ میرے خیال میں دونوں شعر الگ الگ ہیں۔ آخری بات یہ کہ زیر بحث شعر میں ''کم فہم'' اور '' سمجھے ہیں'' کی رعایت خوب ہے۔''

معروضہ: 'خیال بنگ' کی ترکیب کا خیال غالباً میرؔ نے 'چراغ ہدایت' (۱۷۴۴ء)[۶۴] سے لیا ہے:

''خیال بنگ۔ توہم وخیالی کہ از خوردن بنگ آدمی را پیدا شود......''

سوداؔ (۱۷۰۶۔۱۷۸۱ء)[۶۵] کی مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے:

یہ کہا سن کر جو ترغیب آپ کرتے ہیں مجھے
اس کو باور کیجیے گا یہ خیال بنگ ہے

اصل میں ابھی تک اردو میں مصطلحات کی کوئی ایسی لغت ترتیب نہیں دی جا سکی۔ جس کی بنیاد اردو کے کلاسیکی شعر و ادب پر رکھی گئی ہو۔ اسی لیے فرداً فرداً کسی ایک شاعر یا ادیب کی زبان پر تحقیقی کام کرتے ہوئے یہ گمان پیدا ہو جانا لازمی ہے کہ شاید فلاں محاورہ یا استعارہ یا ترکیب اسی شاعر یا ادیب کا اختراع اور اُسی کی 'اولیات' میں یا اسی سے مخصوص ہے جب کہ امکان یہ بھی ہے کہ اس سے پہلے بھی وہ محاورہ یا استعارہ یا ترکیب استعمال ہو چکی ہو۔ ایسے ہی بعض استعمالات کی طرف میں نے اپنے معروضات میں اشارہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اس کے باوجود میں اپنے معروضات کو حتمی تصور نہیں کرتا۔ تحقیق کی راہیں ہمیشہ کھلی رہتی ہیں اور اس میں حرف آخر کوئی نہیں ہوتا۔

حواشی:

۱۔ 'سب رس' ملا وجہی، مولفہ: جاوید وششٹ، بک سروس، دہلی ۱۹۷۳ء، ص ۹۳۔

۲۔ 'تاریخ ادب اردو' (جلد دوم حصہ اول)، ڈاکٹر جمیل جالبی۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۰ء، ص ۴۹۔

۳۔ دو نایاب زمانہ بیاضیں اور ان کا انتخاب، مرتبہ: عبدالباری آسی، ہندوستانی اکیڈمی، الہ آباد ۱۹۴۲ء، ص ۶۳۔

۴۔ 'کلیاتِ حسرت' مرتبہ: ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سرفراز پریس لکھنؤ ۱۹۶۶ء، ص ۳۶۸۔

۵۔ 'کلیاتِ حسرت' ایضاً، ص ۳۴۸۔

۶۔ پلیٹس، جان، ٹی

۷۔ فوربس، ڈنکن

A DICTIONARY OF URDU,CLASSICAL HINDI AND ENGLIS (1885)OXFORD UNIVERSITY PRESS,OXFORD 1968,P.817

A DICTIONARY,HINDUSTANI AND ENGLISH,ENGLISH AND HINDUSTANI.(1866) URDU ,LUCKNOW-1987,P.561.ACADEMY

۸۔ لغات فیروزی (فارسی ڈکشنری) مولوی محمد فیروز الدین، مفید عام پریس، لاہور، ۱۹۱۸ء، ص ۲۸۳۔ نیز اردو لغت بورڈ نے ''کج'' کے تحت مرکبات میں کج دو رو مزید درج کرکے تاریخِ ہندوستان (۱۸۹۷ء) اور کلیاتِ نظمِ حالی (۱۹۱۴ء) کی اسناد بھی دی ہیں۔ ملاحظہ ہو: جلد ۱۴، ص ۷۱۷۔ (مرتب)

۹۔ قصۂ مہر افروز و دلبر، از عیسوی خاں بہادر، مرتبہ، ڈاکٹر مسعود حسین خاں، شعبۂ اردو، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدر آباد، طبعِ اول ۱۹۶۶ء، ص ۱۳۰۔

۱۰۔ 'دیوانِ قائم' مرتبہ: ڈاکٹر خورشید الاسلام، مکتبہ جامعہ نئی دہلی ۱۹۶۳ء، ص ۱۹۱۔

۱۱۔ 'گلزارِ نظیر' مرتبہ: سلیم جعفر، ہندستانی اکیڈمی الٰہ آباد ۱۹۵۱ء، ص ۱۴۔

۱۲۔ 'کلیاتِ مصحفی' حصہ دوم (دیوانِ سوم، چہارم، پنجم)، مرتب: حفیظ عباسی، مجلس اشاعتِ ادب، دہلی، ۱۹۶۹ء، ص ۱۵۹، ص ۴۸۰، ص ۱۹۷۔ مصحفی کے شعر کے دوسرے مصرعے میں صورتیں کی بجائے ''صوتیں'' (صوت کی جمع) چاہیے، جیسا کہ کلیاتِ مصحفی مرتبہ

نور الحسن نقوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، میں بھی ہے، جلد ۵، ص ۱۸۷۔ (مرتبہ)

۱۳۔ 'کلیاتِ جرأت' مرتب: ڈاکٹر نور الحسن نقوی، علی گڑھ ۱۹۷۱ء، ص ۵۶۷۔

۱۴۔ فیلن، ایس۔ ڈبلیو (۱۸۷۹ء)۔

A NEW HINDUSTANI-ENGLISH
DICTIONARY,URDU ACADEMY,LUCKNOW 1986.

۱۵۔ فوربس، ایضاً، ص ۵۶۱۔

۱۶۔ پلیٹس، ایضاً، ص ۶۲۷۔

۱۷۔ 'کلیاتِ سراج' مرتبہ: عبدالقادر سروری، ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۸۲ء، ص ۵۹۲۔

۱۷۔ الف، میر کے بعد کے شعرا میں جرأت (۱۷۴۸۔۱۸۰۹ء) کے ہاں اس کی تین مثالیں ملاحظہ ہوں:

غنچہ ساں دفترِ حسرت لیے ہم یاں سے چلے
سو زباں منہ میں تھیں لیکن لبِ اظہار نہ تھا

☆☆☆☆

داستانیں تو ہزاروں ہی بھری ہیں دل میں
پر کہوں کیا کہ نہیں ہے لبِ اظہار مجھے
ضبط کرتے کرتے ہم آخر لگے دم توڑنے
پر نہ ٹوٹی مہر خاموشی لبِ اظہار سے

(کلیاتِ جرأت، ایضاً ص ۱۱۵، ص ۵۳۲، ص ۵۹۶)

۱۸۔ 'کلیاتِ ولی' مرتبہ: نور الحسن ہاشمی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ ۱۹۸۹ء، ص ۸۷۔

۱۹۔ 'دیوانِ سجاد' مرتبہ: ڈاکٹر شمیم احمد، بہار اردو اکادمی، پٹنہ، ۱۹۷۵ء، ص ۱۳۲۔

۲۰۔ 'خزینۃ الامثال' شاہ حسین حقیقت۔ عکسی ایڈیشن ۱۹۸۶ء مطبع نول کشور کانپور ۱۸۷۲ء۔ مقتدرہ قومی زبان،

اسلام آباد، ص ۵۴۔

۲۱۔ فیلن، ایس، ڈبلیو۔ ہندوستانی کہاوت کوش، ہندی سمپاوک: کرشن آنند گپت، نیشنل بک ٹرسٹ نئی دہلی، ۱۹۶۸ء، ص ۲۳۴۔

(A DICTIONARY OF HINDUSTANI PROVERBS
SAYINGS,EMBLEMS, APHORISMS)

۲۲۔ 'مخزن المحاورات' مؤلفہ: منشی چرنجی لال، مطبع محبت، ہند، دہلی، ۱۸۸۶ء، ص ۶۹۱۔

۲۳۔ 'نجم الامثال' مولوی نجم الدین۔ برقی پریس لاہور، بارِ چہارم ۱۹۲۵ء، ص ۲۲۹۔

۲۴۔ 'فرہنگِ آصفیہ' مولوی سید احمد دہلوی۔ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی ۱۹۷۴ء، جلد چہارم، ص ۴۴۵۔

۲۵۔ 'فرہنگِ آصفیہ'، جلد چہارم ص ۴

۲۶۔ 'نور اللغات'، مولوی نور الحسن نیر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ۱۹۹۸ء، جلد دوم، ص ۱۶۷، جلد دوم ص ۵۱۸، جلد چہارم ص ۶۷۳۔

۲۷۔ 'فرہنگِ اثر' اثر لکھنوی۔ سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ۱۹۶۱ء۔

۲۸۔ اردو لغات یا A DICTIONARY OF URDU LANGUAGE BY
LALA RAM KISHAN AND M. AMIR CHAND.
منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز، مفید عام پریس، لاہور ۱۸۹۴ء، ص ۳۱۷

۲۹۔ 'قرار اللغات' یعنی اردو محاورات۔ مولفہ سید تصدق حسین قرار شاہ جہان پوری، مطبع گلشن ابراہیم، لکھنؤ ۱۹۱۹ء، ص ۲۳۷۔

۳۰۔ 'مرأت منیر یعنی منیر اللغات' از مولوی محمد منیر لکھنوی، مطبع مجیدی کانپور ۱۹۳۰ء، ص ۹۲۔

۳۱۔ 'جامع الامثال' مرتبہ: وارث سرہندی۔ مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد ۱۹۸۶ء، ص ۱۵۔

۳۲۔ 'معیار اردو' (زبانِ اردو کے محاورات) مولفہ نواب فصاحت جنگ بہادر جلیل، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، ص ۱۶۱۔

۳۳۔ 'کلیاتِ بحری، مرتبہ: ڈاکٹر محمد حفیظ سید۔ مطبع نول کشور لکھنؤ، ۱۹۳۹ء، ص ۳۳۶۔

۳۴۔ 'کلیاتِ قلی قطب شاہ' مرتبہ: ڈاکٹر سیدہ جعفر۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ص ۳۳۔

۳۵۔ 'محاسنِ سخن یعنی بابِ سوم کتاب نکات سخن، سید فضل الحسن حسرت موہانی، رئیس المطابع، کانپور، ۱۹۳۵ء، ص ۸۔

۳۶۔ 'دیوانِ سجاد، ص ۱۰۳۔

۳۷۔ 'دیوانِ بیدار' جلیل احمد قدوائی، ہندوستانی اکیڈمی الہٰ آباد، ۱۹۳۷ء، ص ۱۹۔

۳۸۔ 'دیوانِ درد' مرتبہ رشید حسن خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی، ۱۹۹۷ء، ص ۱۰۷۔

۳۹۔ 'دیوانِ جوشش' مرتبہ: قاضی عبدالودود۔ انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۴۱ء، ص ۲۱۲۔

۴۰۔ 'تذکرہ نکات الشعرا' میر تقی میر، مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۵۷۔

۴۱۔ 'قصہ مہر افروز و دلبر' ص ۲۱۔

۴۲۔ 'کلیاتِ سودا' (جلد دوم) مرتبہ: ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی، مجلس ترقی ادب لاہور، طبع اول ۱۹۷۶ء، ص ۱۶۰

۴۳۔ 'دیوانِ سجاد' ص ۱۴۸۔

۴۴۔ 'دیوانِ غزلیات مرزا محمد رفیع سودا' مرتبہ ہاجرہ ولی الحق، نظامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۵ء، ص ۴۷۵۔

۴۵۔ (الف) عیش (وفات: ۱۸۹۹ء)

باتیں سنا سنا کے ڈرائیں گے اپنے ساتھ
زاہد نہ سانو تو کسی کو عذاب میں

('کلیاتِ عیش، مرتب ڈاکٹر حبیبہ بانو۔ ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۹۲ء، ص ۲۶۳)

۴۵ (ب) ریاض خیر آبادی (۱۸۵۳۔۱۹۳۴)

تیغ ہی کیا ہاتھ میں قاتل کے تھی
اے حنا تو بھی تو سانی جائے گی

(اس شعری حوالے کے لیے میں ڈاکٹر احمد محفوظ کا ممنون ہوں۔)

۴۵(ج)۔ بحر المعانی: سانا: سانتا، بھرنا، لت پت کرنا (کلیات ولی)۔

(بحر المعانی: [دکنی اردو کا لغت] جاوید وششٹ، ہریانہ ۱۹۸۷، ص ۳۸۵)۔

۴۶۔ 'خاور نامہ: کمال خاں رستمی بیجاپوری مرتبہ: شیخ چاند ابن حسین احمد نگری، ترقی اردو بورڈ، کراچی، ۱۹۶۸ء، ص ۴۳۴۔

۴۷۔ 'لغت نامہ' از علی اکبر دہخدا، ایران۔

۴۸۔ 'مثنوی پنچھی باچھا'، از وجدی، مرتبہ سید محمد ایم۔ اے، سالار جنگ دکنی پبلشنگ کمیٹی حیدر آباد طبع اول ۱۹۵۹ء۔

۴۹۔ 'دیوانِ یکرو، مرتب: ڈاکٹر شمیم احمد، ادارۂ اردو، مظفر پور، ۱۹۷۸ء

۵۰۔ 'نجم الامثال'، مولوی محمد نجم الدین، مطبع احمد دہلی، بارِ دوم، ص ۲۴۔

۵۱۔ 'نجم الامثال'، مولوی محمد نجم الدین، برقی پریس، لاہور، بارِ چہارم ۱۹۲۵ء، ص ۳۲۰۔

۵۲۔ 'فرہنگِ آصفیہ' جلد چہارم، ص ۱۵۷۔

۵۳۔ 'محاورات ہند' سبحان بخش، مطبع مجتبائی دہلی، بارِ دوم ۱۹۱۳ء، ص ۱۷۶۔

۵۴۔ 'چراغ ہدایت' تالیف سراج الدین علی خاں بن حسام الدین الگوالیری اکبر آباد: بکوشش محمد دبیر سیاقی۔ ناشر: معرفت، تہران ۱۳۳۸ خورشیدی، ص ۲۶۷۔

۵۵۔ 'مصطلحاتِ شعرا' سیالکوٹی مل وارستہ۔ نول کشور کانپور ۱۸۹۸ء، ص ۳۴۳۔

۵۶۔ 'فرہنگِ فارسی' دکتر محمد معین۔ موسسۂ انتشارات امیر کبیر، تہران ۱۹۹۲ء۔

۵۷۔ 'گلزارِ نظیر' ص ۳۹۰

۵۸۔۵۷۔ 'دیوانِ یکرو' ص ۶۱

۵۹۔ 'کلیات مصحفی' ص ۲۷

۶۰۔ 'لغت نامہ' علی اکبر دہخدا۔

۶۱۔ 'فرہنگِ اصطلاحاتِ فارسی بہ انگلیسی'، از شاپور اردو شیر جی ریپورتر۔ انتشارات دانش گاہ تہران
۱۹۷۲ء ص ۳۹۰

۶۲۔ 'گل عجائب یعنی تذکرۂ شاعراں' تالیف اسد علی خاں تمنا اورنگ آبادی۔ انجمن ترقی اردو
اورنگ آباد، دکن ۱۹۳۶ء، ص ۶۰

۶۳۔ 'تذکرۂ نکات الشعرا۔ میر تقی میر' مرتبہ: ڈاکٹر محمود الٰہی۔ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۸۴ء ص ۳۲۔

۶۴۔ 'چراغ ہدایت' ص ۱۳۳

۶۵۔ 'کلیاتِ سودا' جلد دوم، ص ۱۳۲۔

☆ ☆ ☆ ☆

سید یوسف بخاری دہلوی

مولوی سید احمد دہلوی

منشی سید احمد دہلوی، مرحوم، غدر سے گیارہ برس قبل ۹؍محرم ۱۲۶۲ھ مطابق ۸؍جنوری ۱۸۴۶ء منگل کے دن پیدا ہوئے۔ مقامِ ولادت کوچہ بلاقی بیگم، دہلی تھا۔ جس گھر میں ان کا نال گڑا وہ کرائے کا مکان تھا اس کے مالک حافظ بہاء الدین ملازم دربار شاہی تھے۔ پیدائش کے چھ سات ماہ بعد ان کے والد نے خانقاہ حضرت شاہ صابر چشتی کے باغ، واقع سڑک فیض بازار میں موتی بیگم زوجہ میر ظہور علی سے ایک مکان خریدا۔ اسی مکان میں سید احمد کے برادر خورد سید حسین عرف منا پیدا ہوئے۔ غدر کے زمانۂ گیر و دار میں شہر سے باہر، مقبرۂ ہمایوں کے قریب ''عرب سرائے'' میں پناہ گزیں ہوئے۔ تقریباً ۴۳ برس تک یہیں رہتے رہے۔ ۱۹۰۰ء میں حویلی نواب مظفر خاں واقع ترکمان دروازہ، دہلی میں آ کر مقیم ہوئے۔ یہاں سے ۱۹۰۸ء میں اٹھ کر گلی سوار خاں، واقع کوچہ پنڈت دہلی میں رہائش اختیار کی۔ پھر اپنی عمر کے آخری ایام میں کہ سن ۱۹۱۶ء تھا، گلی شاہ تارا متصل اجمیری دروازہ، دہلی میں جا بسے۔ یہیں ان کا انتقال ہوا۔ تاریخ وفات، اتوار ۱۹؍رجب ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۱؍مئی ۱۹۱۸ء اور مدفن باغیچی پیرزادہ بیگم مولوی عبداللہ بافقیہ شافعی، واقع قطب روڈ دہلی تیل مل کی پشت پر ہے۔ یہ تاریخ راقم الحروف کو اپنے عم بزرگوار شمس العلما سید

احمد مرحوم شاہی امام جامع مسجد، دہلی کی قلمی بیاض سے حاصل ہوئی جسے وہ روزانہ بالالتزام لکھا کرتے تھے۔

منشی سید احمد، نجیب الطرفین سید، حسنی و حسینی تھے۔ ان کا آبائی سلسلۂ نسب کئی پشتوں کے بعد حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ سے جا ملتا ہے لیکن انھوں نے فرہنگِ آصفیہ میں صرف سات پشتوں تک اپنے آبا و اجداد کے نام تحریر کیے ہیں۔ شجرہ ملاحظہ ہو: [یہاں منشی سید احمد دہلوی کے ددھیال کے شجرے اور اس سے متعلق تفصیلات کو حذف کر دیا گیا ہے، مرتب]

منشی سید احمد کے والد ماجد، حافظ قاری مولوی سید عبدالرحمن، مونگیری، ایک سچے اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ ان کو شروع ہی سے تحصیلِ علمِ دین کا شوق تھا۔ چنانچہ وہ اپنے زمانۂ عنفوانِ شباب میں کہ ان دنوں دلی صوفیاء اور علمائے دین کا منبع و مرکز تھی تحصیلِ علمِ دین اور قلب و ضمیر کی جلا کے لیے اپنا وطنِ قدیم چھوڑ کر دلی آئے۔ یہاں آ کر خوبیِ تقدیر سے ان کا عقد عرب سرائے کے ایک روشن ضمیر بزرگ سید محمد بافقیہ (چہارم) کی صاحبزادی سے ہو گیا۔ وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ حضرت اسمٰعیل شہید اور حضرت سید احمد بریلوی کی خدمت میں صرف کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان حضرات کے ہمراہ وہ سوات اور بنیر تک گئے۔ جب ان دونوں مجاہدینِ اسلام نے جامِ شہادت نوش کیا تو یہ ٹونک ہوتے ہوئے دوبارہ دلی آ گئے اور پھر دلی ہی کے ہو رہے۔ بالآخر جب قضائے الٰہی نے پکارا تو یہیں کی خاکِ پاک میں چھپ گئے۔ ابتدا میں جب ان کی رہائش حضرت شاہ صابر چشتی کے باغ والے مکان میں تھی اس وقت وہ دلی کے ایک رئیس فوج دار خاں اور ایک دوسرے بزرگ سید اشرف علی کے بچوں کے اتالیق تھے۔ خانقاہ صابریہ سے متصل ایک کہنہ مسجد ہے، اس میں پیش امام بھی تھے۔

منشی سید احمد کی ننھیال کی تاریخ پوری عرب سرائے دہلی کی تاریخ ہے جس کی بانی حضرت حاجی بیگم محل حضرت ہمایوں بادشاہ تھیں۔ یہ عمارت اہلِ عرب کی رہائش کے باعث تاریخی شہرت رکھتی ہے۔ دراصل یہاں وہ عرب رہتے تھے جنھیں محل حضرت ہمایوں بادشاہ بعد فراغت حج

۹۶۸ھ مطابق ۱۵۶۰ء عرب سے منتخب کر کے سلطانِ وقت کی اجازت سے اپنے ہمراہ دلی لائی تھیں تاکہ وہ حضرت ہمایوں کے مرقد پر قرآن اور فاتحہ خوانی کر کے ان کی روح کو ثواب پہنچائیں۔ ان ہی کے نام پر انھوں نے یہ بستی بسائی تھی۔ اپنے صرفِ خاص سے تعلیمِ دین کے لیے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا جس کے مہتمم اول شیخ حسین اور نورالدین ترخان تھے۔ ۱۸۷۳ء میں اس سرائے کا انتظام ننگِ خاندانِ تیموریہ شہزادہ مرزا الٰہی بخش کو حاصل تھا۔ پھر ۱۸۷۸ء میں اس کے سیکریٹری، فقیر چند ولیش، ہیڈ آسسٹنٹ، ڈکشنری، ایس۔ ڈبلیو۔ فیلن ہوئے۔ بعدازاں ۱۹۱۳ء میں سرکار برطانیہ نے اپنی ضرورت اور مصلحت کے پیشِ نظر اس مقام کا برائے نام معاوضہ دے کر ۱۹۲۲ء میں اسے خالی کرالیا۔ یہاں کے مکینوں کو، جنگ پورہ (بھوگل) منتقل کر دیا اور مکانات توڑ پھوڑ کر زمین برابر کر دی۔ البتہ محکمۂ آثارِ قدیمہ نے اتنی عنایت اور مہربانی کی کہ عرب سرائے کے دروازوں کو برقرار رکھا جو ابھی تک جوں کے توں کھڑے زبانِ حال سے اپنی داستانِ کہن سنا رہے ہیں۔ ۱۹۵۴ء میں جب راقم الحروف دلی گیا تو معلوم ہوا کہ موجودہ سرکار بھارت نے اس عرب سرائے میں دستکاری کی ایک درس گاہ قائم کر دی ہے۔

محل حضرت ہمایوں بادشاہ کے ہمراہ مختلف قبائل کے جو برگزیدہ عرب دلی آئے ان میں سے جو ساداتِ عظام تھے ان کا تعلق قبیلۂ بافقیہ، باحسن، بارضا، باطہ، جمال اللیل بافقیہ اور سقاف کا ساداتِ عرب سے تھا اور جو حضرات شیوخ تھے وہ قبیلۂ باعبود اور باکثیر سے تھے۔ قبیلۂ بقان کا تعلق اصحاب حلقۂ خدام سے تھا۔ ان عرب قبائل کا اصل شجرہ غدر میں جاتا رہا تھا مگر بعد میں مل گیا۔ منشی سید احمد کے حقیقی ماموں زاد بھائی سید عبدالغفور کے پاس بطور تبرک محفوظ تھا۔ ۱۹۴۷ء میں دوبارہ ایسا گم ہوا کہ باوجود کوشش نہ مل سکا۔ وہ شجرہ یہ ہے: [یہاں سے سید احمد دہلوی کی ننھیال کے شجرے اور اس سے متعلق کچھ تفصیلات کو حذف کر دیا گیا ہے، مرتب]

حسب ونسب کے متعلق یہ تمام تفصیل تو منشی سید احمد نے فرہنگِ آصفیہ کے مقدمات اور تقاریظ میں درج کی ہے لیکن جہاں تک ان کی ازدواجی زندگی، اولاد اور خانگی حالات کا تعلق ہے

اس باب میں انھوں نے اختصار سے کام لیا ہے۔ ان واقعات کی عدم موجودگی میں ان کی زندگی کا یہ خاکہ کچھ نامکمل سا نظر آتا ہے۔ بنابریں یہ ضروری ہے کہ ان واقعات کو پیش کیا جائے جو راقم الحروف کو اپنی والدہ ماجدہ، اشرف بیگم کے علاوہ اپنے حقیقی عمِ بزرگوار شمس العلما سید احمد مرحوم، شاہی امام، جامع مسجد، دہلی اور دیگر اہلِ خاندان سے تحقیق ہوئے ہیں یہ بھی تاریخی اور کافی دلچسپ ہیں۔

منشی سید احمد کے خسر اول مرزا صادق بیگ[۲] تھے، مرزا صادق بیگ کی زوجۂ اول سے تین اولادیں، اناث میں، ولایتی بیگم اور مغلانی بیگم اور ذکور میں صرف [۳] مرزا محمد بیگ ہوئے۔ ولایتی بیگم ہاپڑ کے نواب میر جعفر علی خاں سے منسوب ہوئیں۔ نواب صاحب گو اہلِ تشیع تھے لیکن ولایتی بیگم مرتے دم تک اپنے آبائی عقیدے پر قائم رہیں۔ ان کی ایک صاحبزادی، مرتضیٰ بیگم، میر مہدی مجروح کے فرزند، عباس حسین سے بیاہی گئیں۔ دوسری صاحبزادی مغلانی بیگم کا عقد ہمارے منشی سید احمد سے ہوا۔ عقد سے قبل یہ اپنی آبائی حویلی بدل بیگ خاں ہی میں رہتی تھیں۔ اولادِ نرینہ میں مرزا محمد بیگ (راقم الحروف کے حقیقی نانا) اور ان کی صاحبزادی اشرف بیگم [۴] (میری والدہ ماجدہ) ہیں جو میرے والد[۵] سید حامد بخاری، مرحوم نائب امام، جامع مسجد دہلی، سے منسوب ہوئیں، اس وقت ان کا سن ۷۵ برس کا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ مغلانی بیگم کے بطن سے منشی سید احمد کے ہاں چودہ بچے ہوئے۔ ان میں بجز[۶] سید بیگم (زوجہ سید احمد امام مرحوم) اور [۷] محمودی بیگم، تمام بچے بعالم صغر سنی اللہ کو پیارے ہوئے۔ سید بیگم کے بطن سے تین چار بچے ہوئے لیکن مرحومہ کی تنہا زندہ یادگار ہمارے ابنِ عم حافظ مولوی [۸] سید حمید، موجودہ امام، جامع مسجد، دہلی ہیں۔ یہ دو تین سال کے شیر خوار بچے ہی تھے کہ ان کی والدہ نے مرضِ دق میں مبتلا ہو کر داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ آخر میں جب مغلانی بیگم کا دماغ خراب ہو گیا تھا تو منشی سید احمد نے ان کو طلاق دے دی تھی۔

منشی سید احمد کی دوسری شادی ان کے حقیقی ماموں زاد بھائی مولوی سید عبدالعزیز کی سلسلہ جنبانی سے حاتم زمانی بیگم بنت ناصر مرزا مرحوم، ملازم محکمۂ پولیس، ساکن بارہ دری، شیر افگن خاں، دہلی سے ہوئی۔ ان کے بطن سے منشی سید احمد کی آخری زندہ یادگار، سعید احمد عرف دربار

احمد (تاریخی نام سید مظہر علی) ۲۱۔ ذوالحجہ ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے جو بقیدِ حیات ہیں۔ ۱۹۱۵ء میں جب منشی سید احمد حیات تھے تو فرہنگ آصفیہ کی قدر دانی اور سرپرستی کے سلسلے میں موجودہ نظامِ دکن نے باپ کے منصب کے علاوہ دربار احمد کو پچاس روپے ماہوار کلدار کا وظیفہ و منصب عطا کیا تھا۔ اسی طرح ۱۹۱۶ء میں ان کی بسم اللہ کی تقریب پر پانچ سو روپے کلدار عنایت کیے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۷ء میں دربار احمد کراچی آ گئے۔ وظیفۂ دکن مدت ہوئی منقطع ہو گیا۔ آج کل ذریعۂ معاش ملازمت ہے۔ محکمۂ پی، ڈبلیو، ڈی، کراچی میں ملازم ہیں۔ دربار احمد کی شادی عزیزہ بیگم بنت سید محمد حسن سے ہوئی جو درگاہ حضرت سید حسن رسول نما کے سجادہ نشین ہیں۔ کافی عیال دار ہیں۔ سات لڑکیاں اور صرف ایک لڑکا ہے۔ ابھی تک صرف ایک لڑکی کی شادی ہوئی ہے۔ نہایت عسرت لیکن بڑی مستقل مزاجی اور وضع داری سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آج کل شاید راولپنڈی میں ہیں۔ پورے پانچ برس ہونے کو آئے ان کی والدہ بھی کراچی میں ۱۵ر محرم ۱۳۷۴ھ کو بہ عالمِ ضعیفی اللہ کو پیاری ہوئیں۔

منشی سید احمد کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی مشہور ''فرہنگِ آصفیہ'' ہے یہ ۲۶ ضرب ۲۰ بٹا چار سائز پر چار ضخیم جلدوں کے ۲۵۳۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں (۶۰) ہزار سے زائد عربی، ترکی، فارسی، سنسکرت، ہندی، انگریزی اور دیگر تمام زبانوں کے وہ الفاظ درج ہیں جو اردو میں مستعمل ہیں۔ ضرورت کے مطابق ہر لفظ کا مادہ و اشتقاق اور ہر لغت کے متعلق اساتذۂ متقدمین و متاخرین کے کلام نظم و نثر سے مختلف اسناد اس طرح پیش کی ہیں جو تذکیر و تانیث کے امتیاز اور فصیح و غیر فصیح ہونے کے فرق کو واضح کرتی ہیں۔ اہلِ زبان کے محاورات، ضرب الامثال، علمی و فنی پیشہ ورانہ اصطلاحات، رسوم، تیج تہوار، میلے ٹھیلے سب کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ قلعۂ معلیٰ کی بیگماتی زبان، تاریخی واقعات، طبعیات و فلسفہ وغیرہ کے ضروری مسائل، ضلع، جگت، پھبتی، پہیلیاں، کہہ مکرنیاں، دو سخنے، فقیروں اور سودے والوں کی آوازوں اور مختلف بولیوں کے علاوہ ایک طویل و بسیط مقدمے کے ذریعے زبانِ اردو کی تاریخ پیدائش اور ارتقا پر روشنی ڈال کر

بڑی مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ جلد چہارم کے آخر میں ’’نیرنگِ خیال‘‘ آزاد کی طرز میں ’’پیکرِ خیال‘‘ کے عنوان سے فرہنگِ آصفیہ کی کہانی اپنی زبانی اردوئے معلیٰ میں بڑے مؤثر اور درد انگیز پیرائے میں لکھی ہے۔ اس لغت کے ساتھ ساتھ ان کی متعدد دوسری کتابیں بھی ظہور میں آئیں جن کو سید احمد نے اپنی لغت کے ’’بچے کچے‘‘ لکھا ہے۔ ان تمام کتب کی فہرست مقدمے کے آخر میں دی گئی ہے۔ چونکہ ان کتابوں میں سے اب صرف دو چار کتابیں ملتی ہیں اس لیے ان کتابوں کے ناموں کا محفوظ کرنا ضروری ہے مبادا یہ نام بھی ہم فراموش کر بیٹھیں۔

اس لغت کی بنیاد عرب سرائے میں پڑی۔ ہندوستان کے اتر، دکھن، پورب، پچھم کے مختلف شہروں سے اس کا خام مواد فراہم کیا گیا۔ دلی اور لکھنؤ سے اس ذخیرۂ الفاظ کی سند بہم پہنچائی گئی، پھر اس سمندر کو کوزے میں سمانے کے لیے جب ان کا قلم حرکت میں آیا تو کبھی اس نے سرزمینِ دہلی میں تراوش کی، کبھی شملہ کی برفانی چوٹیوں پر حرکت میں آیا۔ بالآخر جب اس کی ترتیب مکمل ہوگئی تو وہ اس گنجِ معانی کو لے کر لاہور پہنچے جہاں مختلف خطاطوں نے اسے رقم کیا اور مطابع نے زیورِ طبع بخشا۔ کاتبوں کی کاپیاں اور پریس کے پروف بازار انارکلی، لاہور کی ایک سرائے کی کوٹھری میں بیٹھ کر دیکھا کرتے تھے۔ یہ سرائے اب دہلی مسلم ہوٹل کہلاتا ہے۔

۸؍جنوری، ۱۹۱۲ء کو ان کے مکان میں آگ لگی جس میں اس لغت کے تمام مطبوعہ نسخے، دیگر کتب مع اثاث البیت جل کر خاک ہو گئے تھے۔ اس پر نظامِ دکن نے اس شرط کے ساتھ ان کی سرپرستی کا فرمان جاری کیا تھا کہ لغت کی ازسرِ نو جتنی جلدیں چھپ کر تیار ہوتی جائیں بھیجتے رہیں اور رقم وصول کرتے رہیں۔ اس طرح یہ لغت ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۸ء کے درمیان آخری مرتبہ لاہور میں چھپ رہی تھی۔ ان دنوں سید احمد بسترِ مرگ پر صاحبِ فراش تھے لیکن اس وقت بھی ان کا دل اپنی لغت میں پڑا ہوا تھا۔ اس عالمِ بیماری میں وہ دوسرے تیسرے دن تار بھیج کر لغت کی جلدیں طلب کرتے رہتے تھے۔ یہ نامہ و پیام ان کے ایک تجربے کار اور معتمد کارکن مولوی منظور احمد صاحب عباسی کے نام جاتے تھے جو ان کی عدم موجودگی میں اپنی نگرانی میں لغت چھپوا رہے تھے۔ صاحب

موصوف اردو فارسی کے ایک خوش گو شاعر اور ادیب ہیں۔ آج کل لاہور میں رہتے ہیں۔ یہ واقعہ ان ہی کی زبانی معلوم ہوا کہ جلد دوم، سوم اور چہارم چھپ چکی تھی اور جلد اول دھڑا دھڑ چھپ رہی تھی کہ دلی سے ایک تار موصول ہوا جس میں منشی سید احمد کے انتقال کی خبر درج تھی۔ منظور صاحب یہ تار پا کر سناٹے میں آ گئے، انھوں نے اپنی پریشانی اور اس منحوس خبر کو اہلِ مطبع سے مخفی رکھا، صرف اتنا کہا کہ لغت روانہ کرنے کا شدید اور فوری تقاضا آیا ہے۔ انھیں خوف تھا کہ کہیں اہلِ مطبع، طباعت کے معاوضے میں مطبوعہ لغت کو دبا کر نہ بیٹھ جائیں۔ دو تین دن شب و روز محنت کر کے لغت کی طباعت مکمل کرائی اور جزو بندی کا انتظار کیے بغیر اسے بوریوں میں بھر کر اپنے ہمراہ دلی لے آئے۔ اس کے بعد اس لغت کو کبھی دوبارہ چھپنا نصیب نہیں ہوا۔[9]

یہ خوشی و مسرت کی بات ہے کہ حکومتِ پاکستان کی خاص توجہ سے ترقی اردو بورڈ، کراچی کے اہتمام اور نگرانی میں آکسفورڈ ڈکشنری کے پیمانے پر ایک ایسی جامع اور عظیم لغت کی بنیاد قائم ہو گئی ہے جو قدیم و جدید لغات سے ہر طرح آراستہ و پیراستہ ہو گی، امید ہے کہ مستقبل قریب میں یہ لغت منظرِ عام پر آ جائے گی۔

مولوی غلام یزدانی، ناظم محکمۂ آثارِ قدیمہ، حیدر آباد دکن، اپنے ایک مقالے ''پچاس برس پہلے کی دلی'' مطبوعہ رسالہ ساقی، دہلی، سال نامہ ۱۹۴۵ء میں منشی سید احمد سے اپنی ایک ملاقات کا حال اس طرح رقم فرماتے ہیں:

> ''مولوی صاحب کا حلیہ اور عادات ڈاکٹر جانسن کی شکل و صورت اور خصائل سے ملتے جلتے تھے، دونوں کی بصارت کم، دونوں کا مٹاپے کی وجہ [سے] بے ہنگم جسم۔ مولوی سید احمد کی پلکیں بالکل جھڑ گئی تھیں اور برنیوں کی وجہ سے پپوٹوں کے کنارے بالکل سرخ رہتے تھے پھر بھی مطالع اور تصحیح کے کام میں مشغول رہتے تھے۔
>
> ایک دفعہ میں کسی لفظ کے معنی کی تلاش میں ان کے گھر پہنچا۔ یہ اس زمانے میں پتلی سی گلی میں رہتے تھے جو شاہ گنج اور شاہ تارا کے درمیان واقع ہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے مکان پر جا کر

کنڈی کھٹکھٹائی۔ مولوی صاحب باہر نکل آئے، ننگ دھڑنگ، صرف ایک میلا جانگیا زیب تن تھا۔ میں نے اپنا مطلب عرض کیا۔ فرمایا: ذرا ٹھہریے، پھر گھر کے اندر گئے اور کرتا پاجامہ پہن کر اور ایک کنجیوں کا گچھا لے کر باہر آ گئے اور مجھے ساتھ لے کر گلی شاہ تارا کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں ایک لیتھو پریس تھا اور مسودات بھی وہیں رہتے تھے۔ مولوی صاحب ایک ڈسک نما میز پر بیٹھ گئے، بستے میں سے مسودہ نکالا، کچھ ورق گردانے، پھر کلاں نما آئینے اور اپنی عینک دونوں کی مدد سے میرے پیش کردہ لفظ کے معانی، محلِ استعمال بیان کرنے شروع کیے۔ میں کھڑا استنار ہا اور جب تک میری تشفی نہ ہوگئی سمجھاتے رہے۔ کچھ راہ گیر بھی جمع ہو گئے کیونکہ مطبع لبِ سڑک واقع تھا۔ اس کا نقشہ اصطبل کا سا تھا۔ مولوی صاحب ایک کاٹ کی کرسی پر بے تکلف بیٹھے ہوئے تھے اور اطمینان اور فراغت کا یہ حال تھا کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے پروفیسروں کو اپنے مطالعے کے کمروں میں اتنا ہی سکون حاصل ہوتا ہوگا۔"

فرہنگِ آصفیہ کی تالیف سے ان کو جو عزت اور شہرت حاصل ہوئی وہ کسی نائب کمانڈر کو بھی حاصل نہ ہوگی۔ مولوی سید احمد شاعر بھی تھے، شملہ پر ان کی نظم اردو کورس میں شامل تھی۔ اس کا ٹیپ کا مصرع یہ تھا:

"پسو ہمیں ستاتے ہیں صاحب پہاڑ پر"

مولوی صاحب صرف ۷۲ سال زندہ رہے۔ تمام زندگی کا مختصر خاکہ یہ ہے:

زمانۂ شیر خوارگی و کم سنی: ۱۰ سال، ۱۰+۱۸۴۶ء=۱۸۵۶ء

زمانۂ تعلیم و تربیت: ۱۲ سال، ۱۲+۱۸۵۶ء=۱۸۶۸ء

آغاز انشا پردازی اور تحقیق و تدوین لغت: ۳۰ سال، ۳۰+۱۸۶۸ء=۱۸۹۸ء

مصطلحات اا، سید اللغات، ارمغان دہلی اور فرہنگِ آصفیہ، ان مختلف ناموں کے ساتھ مختلف حصے مختلف انداز میں رسائل اور چھوٹی تقطیع پر شائع ہوئے: ۱۴ سال، ۱۴+۱۸۹۸ء=۱۹۱۲ء

موجودہ صورت میں فرہنگِ آصفیہ کی از سرِ نو ترتیب و طباعت ۶ سال، ۶+۱۹۱۲ء=۱۹۱۸ء (سال وفات)

زندگی کے اس گوشوارے سے پتا چلتا ہے کہ ۳۰ برس کا طویل زمانہ لغت کی ترتیب و تدوینِ اول میں گزرا اور باقی زندگی اس یادگار کو از سرِ نو قائم رکھنے کی جدوجہد میں تمام ہوئی۔ اس کی مختصر تفصیل یہ ہے:

ان کو اپنی زندگی میں پیہم اور مسلسل صدہا مشکلات اور جانی و مالی مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ تحقیقِ لغات کے سلسلے میں انھوں نے درجنوں دواوین اور بے شمار کتب کا مطالعہ کیا۔ ہندوستان میں ہر سمت اور ہر صوبے میں متعدد مقامات کا سفر، اپنے عہد کے علماً، ادبا، شعرا، مورخ اور داستان گوؤں کی صحبتوں سے استفادہ، ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و فرزانہ سے ملاقاتیں، تاجروں اور مختلف پیشہ وروں سے باتیں۔ غدر سے قبل شہر میں شاہی جشن، دربار، جلوس، شہزادہ جواں بخت کی شادی، مرزا فخرو کا جلوسِ جنازہ، غدر کے بعد عرب سرائے میں شہزادگان کی عید اور بقرعید، شاہانہ رسوم، آداب و قواعد، تحریر و تقریر، مذہبی و ادبی محافل، خود اپنی جانب سے ۱۰ مشاعروں کا انعقاد، شب و روز خط و کتابت، مختلف سرکاری اور غیر سرکاری ملازمتیں، دوستوں کی ناز برداریاں، حریفانِ سخن ۱۲ سے چوٹیں، بدمعاملہ اہلِ مطابع سے مقدمات، شادی و بیاہ، اولاد کی تعلیم و تربیت، خانگی افکار و حوادث اور سب سے بڑھ کر وہ آتش خانہ جس نے اثاث البیت کے علاوہ ان کی عمر بھر کی دماغی محنت و کاوش کا نتیجہ، مطبوعہ فرہنگِ آصفیہ اور مختلف کتب، ادب کے اس انبار کو چشم زدن میں جلا کر راکھ کر دیا۔ کوئی اور ہوتا تو اس دھاکے میں مر جاتا۔

وہ تو یوں کہیے کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی بعض صاحب نظر اور قدردانِ فن زندہ تھے۔ اکابر اور مشاہیر نے میموریئل، محضر نامے اور ملک کے اکثر اخبارات و رسائل نے لیڈنگ آرٹیکل لکھ کر حکومتِ وقت اور دولتِ آصفیہ، حیدرآباد دکن کو متوجہ کیا جو اس لغت کی پہلے ہی سے خریدار اور قدردان تھی۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ اس وقت اس نے ایسے شاہانہ انداز سے سرپرستی کی اور امداد فرمائی کہ یہ بوڑھا نیم جاں، سوختہ دل، آشفتہ حال، منشی پھر مرد توانا بن گیا۔ ہمت و استقلال سے کام لیا۔ پریس کی بعض بچی کھچی کاپیوں، پروفوں اور لغت کے فروخت شدہ حصوں کو

بڑی محنت اور جستجو کے بعد فراہم کیا۔ از سرِ نو ترتیب دی اور پھر تمام و کمال چھاپ ڈالا۔ اس طرح چلتے چلاتے اور مرتے مرتے بھی اپنی ساری عمر کی پونجی اور کمائی اپنی قوم کو ورثے میں دے دی کہ لو بھئی! یہ تمھارا مال ہے، اب تم جانو اور تمھارا کام۔

(دیباچہ ''رسومِ دہلی، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی ۱۹۶۲ء)

حواشی:

(۱) پیدائش یکم شعبان ۱۲۸۲ھ م ۱۸۶۵ع، انتقال ۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء۔ مدفن آبائی قبرستان گوشۂ باغیچہ زیر دروازہ شمال مغربی، جامع مسجد، دہلی۔ (بخاری)

(۲) مرزا صادق بیگ متوفی ۱۰۔ رجب ۱۲۸۹ھ مطابق ۱۸۷۲ء کا سلسلۂ نسب نواب بدل بیگ خاں سے ملتا ہے جن کا اصلی نام ترکی جنگ تھا۔ یہ اوائل زمانہ شاہ عالم ثانی ۱۸۰۶ء میں سمرقند سے آئے تھے۔ امیر الامرأ مرزا نجف خاں کے ماتحت رسال دار ہوئے۔ ان کی تعمیر کردہ ایک حویلی اور اس کا پھاٹک واقع سرکی دالان متصل حوض قاضی، دہلی، آج تک انھیں کے نام پر باجتا ہے۔ بعد میں یہ حویلی حکیم محمد احسن خاں طبیب حضرت بہادر شاہ ثانی کی ملکیت ہوگئی۔ اس حویلی کا موجودہ دروازہ حکیم صاحب ہی کا بنوایا ہوا ہے۔ مرزا غالب نے اس کے لیے تاریخی قطعہ کہا تھا۔ اس کا کتبہ دہلی کے مشہور خطاط میں محمد رضوی عرف میر پنجہ کش دہلوی کے زور خامہ کا نتیجہ ہے قطعہ:

نہادہ بنا احسن اللہ خاں　　سر راہ بد انساں در دل کشا
کہ غالب پے سال تاریخ او　　رقم زدہ، در دل کشا حبذا

۱۶۵۳ء۔ ۱۲۷۰ھ

(واقعات دار الحکومت، دہلی جلد دوم، صفحہ۔ ۹۹) (بخاری)

(۳) متوفی ۲۸ رمحرم ۱۳۴۱ھ م ۲۱ رستمبر ۱۹۲۲ء۔ مدفن قبرستان مہندیاں، شاہ عبدالعزیزؒ، دہلی (بخاری)

(۴) پیدائش ۱۶ رصفر ۱۳۰۳ھ، مطابق ۱۸۸۵ء۔ تاریخ عقد، ۱۵ راپریل، ۱۹۰۰ء (بخاری)

(۵) پیدائش ۲۷ رشعبان ۱۲۸۶ھ انتقال ۱۴ راگست ۱۹۳۶ء مدفن جدید قبرستان کوٹلہ فیروز شاہ دہلی (بخاری)

(۶) تاریخ عقد۔ ۱۳ رفروری ۱۸۸۸ء، انتقال ۵ ردسمبر ۱۸۹۵ء، مرض دق، مدفن عرب سرائے دہلی (بخاری)

(۷) ۱۷/ اکتوبر ۱۸۸۳ء کو ساڑھے پانچ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ منشی سید احمد نے اپنا ''فسانۂ راحت'' دلی کی بیگماتی زبان میں اسی جانہار کی یاد میں لکھا تھا۔ (بخاری)

(۸) پیدائش۔ ۵/ اکتوبر، ۱۸۹۲ء (بخاری)

(۹) لیکن یہ لغت اس کے بعد بھی شائع ہوئی، مثلاً اردو سائنس بورڈ لاہور نے اس کی عکسی طباعت چار جلدوں میں ۱۹۷۷ء میں پیش کی۔ بعد میں ترقی اردو بورڈ، دہلی، نے بھی اسے ۱۹۷۴ء کے عشرے میں شائع کیا اور نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے بھی اسے شائع کر دیا (مرتب)

(۱۰) مسٹر ایس، ڈبلیو فیلن کی ہندوستانی ڈکشنری کی بنیاد ان مشاعروں کی محفلوں کے دس پندرہ برس بعد قائم ہوئی اور ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔ لہٰذا سید احمد کے حریفوں کا یہ الزام غلط اور بے بنیاد ہے کہ فیلن کا سرمایۂ لغت سید احمد کے کام آیا۔ سید احمد ۱۸۷۳ء سے ۱۸۷۹ء تک صرف سات سال فیلن کی ملازمت میں رہے اور ان کو ڈکشنری کے کام میں بھرپور مدد دی، جس کا خود فیلن نے اپنے متعدد خطوط میں اعتراف کیا ہے۔ (بخاری)

(۱۱) اس کا صحیح نام ''مصطلحاتِ اردو'' ہے۔ بلکہ اسے کئی ناموں سے پکارا گیا اور ان میں ''لغاتِ اردو معروف بہ ارمغان اردو'' بھی شامل ہے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مقالہ ''غالب لائبریری کا ذخیرۂ لغات'' مشمولہ غالب، کراچی، شمارہ ۲۱، ۲۰۱۳ء۔ (مرتب)

(۱۲) امیر احمد صاحب امیر مینائی استاد نواب رام پور نے اپنی آخر عمر میں امیر اللغات لکھنی شروع کی، صرف دو باب الف ممدودہ اور مقصورہ کو پورا کر کے با امید امداد دکن گئے وہاں ان کا انتقال ہو گیا۔ (بخاری) تیسری جلد حرف ب سے شروع ہونے والے الفاظ پر مبنی تھی اور اس کا قلمی نسخہ نبیرۂ امیر مینائی اسرائیل احمد مینائی کے پاس محفوظ تھا۔ راقم نے اس کی تدوین و تحشیہ کا کام کیا اور یہ تیسرا حصہ ۲۰۱۰ء میں پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور، سے شائع ہوا۔ لیکن امیر مینائی کو ان کا ''حریف'' قرار دینا درست نہیں (مرتب)

☆☆☆☆

رشید حسن خان

مولوی سید احمد دہلوی

اردو کی مشہور لغت فرہنگِ آصفیہ کے مولف سیّد احمد دہلوی کو میں نے دیکھا نہیں۔ دیکھتا بھی کیسے، وہ پیدا ہوئے تھے ۱۸۴۶ء میں یعنی اب سے ایک سو انتالیس برس پہلے اور ۱۹۱۸ء میں اس دنیا سے چلے گئے؛ لیکن میں ان کو جانتا اچھی طرح ہوں۔ وہ اپنی تحریروں میں اپنے کردار، مزاج اور انداز کی رنگارنگی کے ساتھ اس طرح نمایاں نظر آتے ہیں جیسے سامنے موجود ہوں۔ فرہنگِ آصفیہ کی پہلی جلد کا جو پرانا ایڈیشن ہے ۱۹۰۸ء کا اس میں ان کی تصویر بھی شامل ہے۔ بھاری بھرکم بدن، سر پر ترکی ٹوپی، گلے میں نقش و نگار سے آراستہ مفلر، جس کے دونوں سرے اس طرح ملا کر سامنے رکھے گئے ہیں کہ آرائشی حصہ سامنے آ گیا ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں، چوڑا ماتھا، بھرا ہوا چہرہ، اس پر خوش نما سفید داڑھی، جو حدِ اوسط سے بڑھی ہوئی نہیں۔ داڑھی کے باوجود چہرے پر خشونت کے آثار نہیں۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ وہ بس نام کے مولوی تھے[1]۔ ان کی تصویر اور ان کی سادہ و صاف تحریریں ان کی بے ریا شخصیت کو اس طرح سامنے لے آتی ہیں کہ اجنبیت کا احساس کم ہو جاتا ہے اور شناسائی کا احساس بڑھ جاتا ہے، شرط یہ ہے کہ آدمی زبان اور

ادب کی نسبت سے مولوی صاحب ہی کے قبیلے سے تعلق رکھتا ہو۔

غلام یزدانی مرحوم (دہلوی، ثم حیدر آبادی) سے پڑھے لکھے لوگ ناواقف نہ ہوں گے، انھوں نے مولوی صاحب سے اپنی ایک ملاقات کا جو حال لکھا ہے اس سے مولوی صاحب کے آخری زمانے کی تصویر بھی ہمارے سامنے آجاتی ہے، ملاحظہ ہو:

> ''مولوی صاحب کا حلیہ اور عادات ڈاکٹر جانسن کی شکل وصورت اور خصائل سے ملتے جلتے تھے۔ دونوں کی بصارت کم، دونوں کا مٹاپے کی وجہ سے بے ہنگم جسم۔ مولوی سید احمد کی پلکیں بالکل جھڑ گئی تھیں اور پپوٹوں کے کنارے بالکل سرخ رہتے تھے، پھر بھی مطالعے اور تصحیح کے کام میں مشغول رہتے تھے۔ ایک دفعہ میں کسی لفظ کے معنی کی تلاش میں ان کے گھر پہنچا۔ یہ اس زمانے میں ایک پتلی سی گلی میں رہتے تھے جو شاہ گنج اور شاہ تارا کے درمیان واقع ہے۔ گرمی کا موسم تھا۔ میں نے مکان پر جاکر کنڈی کھٹکھٹائی۔ مولوی صاحب باہر نکل آئے، ننگ دھڑنگ، صرف ایک میلا جانگیا زیب تن تھا۔ میں نے اپنا مطلب عرض کیا۔ فرمایا: ذرا ٹھہریے، پھر گھر کے اندر گئے اور کرتا پاجامہ پہن کر اور ایک کنجیوں کا گچھا لے کر باہر آ گئے اور مجھے ساتھ لے کر گلی شاہ تارا کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں ایک لیتھو پریس تھا اور مسودات بھی وہیں رہتے تھے۔ مولوی صاحب ایک ڈسک نما میز پر بیٹھ گئے، بستے میں سے مسودہ نکالا، کچھ ورق گردانے، پھر کلاں نما آئینے اور اپنی عینک دونوں کی مدد سے میرے پیش کردہ لفظ کے معانی، محلِ استعمال بیان کرنے شروع کیے۔ میں کھڑا سنتا رہا اور جب تک میری تشفی نہ ہوگئی سمجھاتے رہے۔ کچھ راہ گیر بھی جمع ہو گئے...... مولوی صاحب ایک کاٹھ کی کرسی پر بے تکلف بیٹھے ہوئے

> تھے، اطمینان اور فراغت کا یہ حال تھا کہ آکسفورڈ اور کیمبرج کے پروفیسروں کو اپنے مطالعے کے کمروں میں اتنا ہی سکون حاصل ہوتا ہوگا۔"

(مقدمۂ رسومِ دہلی، طبع کراچی)

میں نے ابھی جو مولوی صاحب کی شخصیت کو بے ریا کہا تھا، اس کی تصدیق آپ کو بھی ہوگئی ہوگی۔

زبان کے معاملے میں مولوی صاحب کٹر دلی والے تھے۔ دہلی اور لکھنؤ میں جو ادبی اور لسانی چپقلش رہی ہے، اس میں وہ بھی الجھے ہوئے تھے اور اس حد تک کہ ان کا فتویٰ یہ تھا کہ لکھنؤ والوں کو بھی دلی والوں کی تقلید کرنا چاہیے، کیونکہ دلی سے باہر کا آدمی، وہ لکھنؤ کا کیوں نہ ہو اہلِ زبان ہو ہی نہیں سکتا۔ انھوں نے لکھا ہے:

> "اس بنا پر ہم کہتے ہیں کہ دہلی کے سوا کوئی دوسرا شہر ٹکسالی اور مرکز اردو قرار نہیں دیا پا سکتا۔ اردو لکھ لینا اور ہے اور اس کا صحیح لہجہ ادا کرنا اور۔"

(آصفیہ جلدِ اوّل ص ٦٦)

اب آپ کہیں گے کہ کوئی دوسرا شخص کہے تو کہے، ایک لغت نویس کو یہ بات یا ایسی بات نہیں کہنا چاہیے۔ میں آپ سے متفق ہوں؛ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ اس زمانے میں دبستانی اختلاف نے کچھ ایسی ہی جانب داری کی فضا پیدا کر رکھی تھی۔ مولوی صاحب نے کوئی نئی بات تو لکھی نہیں، مرزا داغ اس سے پہلے کہہ چکے تھے: اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ۔

اور یہ بھی کہ:

مستند اہلِ زباں خاص ہیں دلّی والے
اس میں غیروں کا تصرف نہیں مانا جاتا

"غیروں" کا اشارہ صاف طور پر اہلِ لکھنؤ کی طرف ہے۔

یہ تو خیر ایک طرف دارا اور ایک فدائی کا نعرۂ بے اختیار تھا، لیکن اسی سلسلے میں دو سطروں کے

بعد مولوی صاحب نے ایک اہم بات لکھی ہے:

> "نیز یہ بھی لحاظ رہے کہ زبانِ اردو سے صرف الفاظِ اردو مراد نہیں بلکہ لہجہ بھی، جو اس کی اصالت ہے، اسی میں شمار کیا جاتا ہے۔ پس جس شخص کا لہجہ مع الفاظِ روزمرہ درست ہوگا، وہی استادِ کامل خیال کیا جائے گا، بلکہ اصل باشندے کا اسی پر اطلاق ہوگا۔"

یہ نکتہ آج بھی ہماری توجہ کا طلب گار ہے۔

ایک تو مولوی صاحب دلّی والے تھے، پھر اردو کی اس وقت تک سب سے بڑی لغت مرتب کر رہے تھے؛ ان دو باتوں نے ان کی تحریر میں عجیب صورتِ حال پیدا کر دی ہے۔ لغت نویسی کی حد تک ان کا خیال تھا کہ انھوں نے اتنا بڑا کام شروع کیا ہے، تو اب کسی اور کو اس میدان میں قدم رکھنے کی ضرورت نہیں۔ امیؔر مینائی نے جب امیر اللغات کا جز چھاپا، تو انھوں نے واضح لفظوں میں امیؔر پر چوری کا الزام لگایا اور کچھ ایسی ہی بات مؤلفِ نور اللغات کے متعلق لکھی ہے۔ فرہنگِ آصفیہ کی پہلی جلد کے مقدمے میں بہت ہی سخت اور نامناسب الفاظ میں ان دونوں کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ میں نے "آنکھ" اور "ہاتھ" وغیرہ کی جو لغات لکھی تھی، اُنھی کو ان لوگوں نے اڑا لیا ہے۔ مولوی صاحب سے کون یہ پوچھ سکتا تھا کہ "ہاتھ" اور "آنکھ" کی نئی لغات یہ لوگ کہاں سے لاتے! اصل بات یہ تھی کہ مولوی صاحب امیؔر مینائی اور صاحبِ نور اللغات کو اہلِ زبان[2] ہی نہیں سمجھتے تھے۔ وہی دہلی و لکھنؤ کا پرانا جھگڑا۔

مجھے یہ تو نہیں معلوم کہ مولوی صاحب کی گفتگو کا انداز کیا ہوتا تھا، مگر ان کی تحریر ہم سب کے سامنے ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دلی والے ہونے کا پورا پورا فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ ایچ پیچ کے قائل نہیں تھے اور سب کچھ لکھ دینے کو غیر مناسب نہیں سمجھتے تھے، خاص کر لسانی بحثوں میں۔ ایسے میں اگر کہیں لکھنؤ کا ذکر آ گیا تو پھر مولوی صاحب سنجیدگیِ تحریر کی بھی کچھ ایسی پروا نہیں کرتے تھے اور نہ یہ دیکھتے تھے کہ جہاں وہ یہ باتیں لکھ رہے ہیں، وہ کوئی رسالہ نہیں، لغت کی کتاب ہے۔

فرہنگ آصفیہ کو دیکھ جائیے، مقدمہ کتاب کی بات نہیں، الفاظ کی تشریح کے ذیل میں بھی وہ ایسی گنجائش نکال لیا کرتے تھے۔ میں مولوی صاحب کے مزاج، اندازِ فکر اور ایسے عالم میں طرزِ کلام کی وضاحت کے لیے صرف ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ لفظ ''توتی'' کے ذیل میں مولوی صاحب نے لکھا ہے:

''اس لفظ کی تذکیر و تانیث پر جو لطیفہ حضرت استاد ذوقؔ اور ایک لکھنوی شاعر سے ہوا، اسے ناظرین کی تفننِ طبع کی غرض سے......

لطیفہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ استاد ذوقؔ کے ایک لکھنوی ''دوست'' نے ناسخؔ کی ایک تازہ غزل سنائی۔ اسی زمین میں ان کو ذوقؔ نے اپنی غزل سنائی، جس میں یہ شعر بھی تھا:

ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا
خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا

''دوسرا شعر سنتے ہی چونکے اور فرمایا کہ ہیں! آپ نے طوطی کو مذکر باندھ دیا، حالاں کہ اس میں یاے معروف علامتِ تانیث موجود ہے...... استاد ذوقؔ نے فرمایا کہ حضرت! محاورے پر کسی کے باپ کا اجارہ نہیں ہے۔ آج میرے ساتھ چوک پر چلیے...... جب شام کا وقت ہوا، دونوں صاحب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر، جہاں گدڑی لگتی ہے، پہنچے...... دیکھا ایک شہدے صاحب بھی طوطی کا پنجرہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ استاد ذوقؔ نے اشارہ کیا۔ ذرا ان سے بھی دریافت کر لیجیے۔ آپ نے بلا تکلف پوچھا! بھیا! تمھاری طوطی کیسی بولتی ہے؟...... جواب دیا کہ میاں! بولتی تمھاری ہو گی، یاروں کا طوطی تو خوب بولتا ہے۔''

آپ نے مولوی صاحب کا انداز دیکھ لیا اس ''فرضی لطیفے'' کا بھلا لغت سے کیا تعلق ہو سکتا تھا، مگر دہلی و لکھنؤ کی بحث میں تعلق نکل آیا۔ سچ کہا گیا ہے کہ عاشقی میں سب کچھ جائز ہے۔

آج ہم لوگ فرہنگِ آصفیہ میں بہت سے عیب نکالتے ہیں یہ درست ہے کہ اس میں بہت سے بحث طلب مقامات ہیں، خامیاں اور غلطیاں بھی ہیں؛ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ آج بھی یہ لغت بعض اعتبارات سے بے مثال ہے۔ اس کی بڑائی اس وقت واضح ہوگی جب اسے کسی نئی لغت کے ساتھ رکھ کر دیکھیے۔ مثلاً اردو لغت بورڈ کراچی کی ضخیم لغت کی متعدد جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں، ان جلدوں کے مندرجات کا مقابلہ فرہنگِ آصفیہ کے اندرجات سے کیا جائے تو جگہ جگہ اندھیرے اجالے کا فرق نظر آئے گا[۳]۔ الفاظ اور محاورات کے ذیل میں مولوی صاحب نے بہت سی ایسی تفصیلات لکھ دی ہیں جن کی آج بہت اہمیت ہے، خاص کر رسم و رواج اور اصطلاحات کے سلسلے میں۔ ایک فرق یہ بھی ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی آنکھوں سے بہت سی رسموں کو دیکھا تھا اور بہت سی چیزوں کو برتا تھا، جن سے آج لغت نگار واقف نہیں۔ وہ نرا نقل نویس ہے بلکہ ادھورا نقل نویس۔

مولوی صاحب فنافی اللغت تھے۔ کیسی کیسی مصیبتیں اس سلسلے میں انھوں نے اٹھائیں، کتنے دروازوں پر مالی امداد کے لیے دستک دی۔ ایک بار ۱۹۱۲ء میں گھر میں آگ لگ گئی تو سارا اثاثہ جل گیا، کتابیں بھی جل گئیں؛ لیکن مولوی صاحب نے نہ ہمت ہاری نہ دل چھوٹا کیا۔ کسی ادارے کی مدد سے انھوں نے اس کام کو شروع نہیں کیا تھا، ذاتی دلچسپی نے ان کو لغت نویسی کی طرف مائل کیا تھا۔ اس ذاتی دلچسپی میں بہت بڑا حصہ اس احساس کا تھا کہ دہلی کی زبان محفوظ ہو جائے اور دہلی کی معاشرتی زندگی کے بہت سے مظاہر کی تفصیلات کاغذ پر درج ہو کر یادگار بن جائیں تاکہ بدلتے ہوئے زمانے کی دست برد سے محفوظ ہو جائیں۔ انھوں نے معمولی ملازمتیں کیں، دلی میں بھی رہے، دلی سے باہر بھی رہے؛ مگر لغت کے کام سے ایک دن کیا، ایک لحظہ بھی غافل نہیں رہے۔ ایسے دل لگا کر محض اپنے شوق کی تسکین کی خاطر کام کرنے والے اب کہاں ہیں۔

مولوی صاحب دہلی کے آخری بڑے آدمی تھے جنھوں نے بڑے سے بڑے کاموں کو

انفرادی طور پر انجام دینے کی مشرقی روایت کو برقرار رکھا اور اتنی بڑی لغت مرتب کر گئے۔ یہ صحیح ہے کہ ایسے کام اب ایک آدمی انجام نہیں دے سکتا، مگر ہمارے یہاں اب تک اجتماعی طور پر اور منصوبہ بندی کے تحت ادبی کام کرنے کی روایت پروان نہیں چڑھ سکی ہے اور لغت یا تاریخِ ادب کے سلسلے میں جو پنچایتی کام اب تک ہوئے ہیں، ان کا احوال اس قدر تباہ ہے کہ ان کاموں کے کرنے والوں کو اگر پرانے سوویت روس کے روایتی لیبر کیمپ میں بھیج دیا جاتا تو کچھ بے جا نہ ہوتا۔ اس صورتِ حال کے تحت اب سے سو، سوا سو برس پہلے جو اتنا بڑا کام ایک فردِ واحد نے انجام دیا ہے اور جس میں خامیوں کے مقابلے میں خوبیوں کی تعداد کچھ کم نہیں، اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ اگر کسی کو اس میں کچھ شک ہو تو اس لغت کے مقابلے کی اس زمانے کی کوئی ایک مثال لے آئے۔ اب تو مالی وسائل کی کمی نہیں، سائنسی نقطۂ نظر بھی عام ہو چکا ہے اور علمِ زبان نے بھی بہت ترقی کر لی ہے۔

مولوی صاحب لسانیات سے اور جدید علمِ لغت سے واقف نہیں تھے (اور اس زمانے میں کوئی بھی واقف نہیں تھا)۔ دولت مند بھی نہیں تھے، انھوں نے غلطیاں بھی بہت کی ہیں، وہ دہلی لکھنؤ کے دبستانی جھگڑے میں بھی بری طرح الجھے ہوئے تھے؛ اس کے باوجود ان کے دو وصف ایسے بھی تھے ان کے یہاں، جن کا اب قحط ہے ایک تو یہ کہ انھوں نے پوری زندگی اس کے لیے وقف کر دی تھی اور پوری صلاحیت اور توفیق کے ساتھ بس اسی کے ہو کر رہ گئے تھے اور عمرِ عزیز کا دو تہائی حصہ اسی ایک کام کی نذر کر دیا۔ آج ہے کوئی ایسا فدائی، ایسا مخلص اور ایسا ڈوب کر کام کرنے والا؟ (یہاں مجھے تین سوالیہ نشان بنانا چاہیے تھے) اس ایک وصف کے سامنے بہت سی خامیاں بے رنگ ہو کر رہ جایا کرتی ہیں۔ دوسرے یہ کہ صحیح معنی میں زبان سے واقف تھے۔ اردو میں کتنی ہی بڑی لغت مرتب ہو جائے جو جدید معیارِ لغت نویسی کے لحاظ سے بھی اعلیٰ درجے کی ہو، تب بھی فرہنگِ آصفیہ کی اہمیت کم نہیں ہوگی۔ کلاسیکی ادب پر کام کرنے والے، خاص کر دہلی کی زبان پر کام کرنے والے اس سے استفادے پر ہمیشہ اپنے آپ کو مجبور پائیں گے، اس بنا پر کہ جو مختلف

معاشرتی اور تہذیبی تفصیلات اس میں محفوظ ہیں اور زبانِ دہلی کے لحاظ سے روزمرّے اور محاورے کے جو بہت سے نکات اس میں مندرج ہیں، وہ نئی لغت میں ان کو نہیں ملیں گے۔ ہم لوگ جو زبان اور لغت سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتے ہیں اور ان موضوعات میں سر کھپاتے رہتے ہیں، ہمیشہ مولوی صاحب کو یاد رکھیں گے اور ان کے خلوص کو ڈوب کر کام کرنے کے انداز کو مثال میں پیش کرتے رہیں گے۔

(منقول از ''تفہیم'' مکتبۂ جامعہ، دہلی، ۱۹۹۳ء)

حواشی:

(۱) داڑھی اور مولویوں کے خلاف رشید صاحب کا یہ تعصب افسوس ناک ہے۔ داڑھی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور داڑھی کے ساتھ خشونت ضروری نہیں ہاں البتہ داڑھی منڈوں کی رعونت ہم نے ضرور دیکھی ہے۔ اللہ ہم سب کی مغفرت فرمائے۔ آمین (مرتب)

(۲) لطیفہ یہ ہے کہ مرزا داغؔ، مولوی صاحب کو اہلِ زبان نہیں مانتے تھے (اس سے فرہنگِ آصفیہ کے متعلق بھی رائے کا بہ خوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے) مولوی عبدالرزاق کانپوری (مصنفِ البرامکہ) کی کتاب یادِ ایّام میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ مولوی صاحب نے داغؔ سے اپنی ملاقات کا حال لکھا ہے، گفتگو کے دوران انھوں نے فرہنگِ آصفیہ کے متعلق داغؔ کی رائے پوچھی تھی۔ (رشید حسن خاں)

(۳) رشید صاحب چونکہ اردو لغت بورڈ کی لغت کے نامعلوم وجوہ کی بنا پر مخالف تھے، لہٰذا انھیں ''اندھیرے اجالے'' کا فرق اس لحاظ سے لگا ہوگا کہ بورڈ کی لغت میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ حالانکہ آصفیہ میں بھی کئی مقامات پر کچھ ''اندھیرا'' ہے۔ بورڈ کی لغت میں کئی مقامات پر ''اجالا ہے''۔ (مرتب)

☆☆☆☆

محمد اکرام چغتائی

فیلن اور اس کے علمی کارنامے: ایک تعارف

تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی دو قوموں میں فاتح اور مفتوح یا کسی اور حیثیت سے روابط قائم ہوئے اور کچھ عرصے تک انھیں ایک دوسرے کے قریب رہنے کا موقع ملا، تو ان کی زندگی کے تمام شعبے ان تعلقات سے متاثر ہوئے۔ عام لین دین اور روزمرہ کاروبار کے تقاضے خاص طور پر ان قوموں کی زبانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں اور کبھی کبھار اس اختلاط سے بعض نئی زبانیں تشکیل پا جاتی ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آمد سے قبل اس سلسلے کی سب سے پہلی مثال آریوں کی پیش کی جا سکتی ہے جنھیں ابتدا میں اپنی نسلی برتری اور زبان پر بڑا فخر تھا، لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ سب دیواریں منہدم ہوتی گئیں اور مقامی لوگوں سے صدیوں کے تعلقات کے بعد سنسکرت کی جگہ کئی بھاشائیں اور بھرنشیں مقبول عام ہو گئیں۔ سکندر اعظم کے حملے کے بعد یونانیوں کی جو سلطنتیں یہاں قائم ہوئیں ان کی بدولت کسی نئی زبان نے تو جنم نہیں لیا، البتہ موجودہ دور کی کئی زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں یونانی زبان کے اثرات کا بخوبی سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ صدیوں بعد جب اسلام اس سرزمین میں داخل ہوا اور محمد بن قاسم کی فتوحات کے بعد سندھ کا علاقہ ڈھائی تین

سوسال تک عربوں کی عمل داری میں رہا تو یہاں کی زبان پر (جسے عرب سیاحوں اور جغرافیہ دانوں نے ''ہندی'' کا نام دیا ہے) عربی کا گہرا اثر پڑا۔ موجودہ سندھ کی بولیوں میں عربی الفاظ کی کثرت کا ایک سبب یہ بھی ہے۔ پھر اس برصغیر میں مسلمانوں کی کئی سلطنتیں قائم ہوئیں اور مقامی زبانیں ان حکمرانوں کی زبانوں مثلاً فارسی، ترکی اور کسی حد تک منگولی کے اثرات قبول کرتی رہیں۔ بالآخر جب اٹھارھویں صدی عیسوی کے شروع میں مغلیہ سلطنت انحطاط پذیر ہوئی تو مختلف مغربی اقوام تاجروں کے بھیس میں ساحلی علاقوں میں اتریں اور برصغیر پر حکمران ہونے کے خواب دیکھنے لگیں۔ ان قوموں میں انگریزوں کے علاوہ دیگر یورپی اقوام مثلاً پرتگیزی، فرانسیسی اور ولندیزی بھی برابر کے شریک تھے لیکن فتح و کامرانی نے صرف انگریزوں کے قدم چومے۔ انگریز جب حکمران کی حیثیت سے ہندوستان کی مسند پر براجمان ہوئے تو انھیں اس بات کا بہت جلد احساس ہو گیا کہ اپنے اقتدار کو محکم تر کرنے کے لیے یہاں کے باشندوں کی زبانوں اور ان کے رہن سہن کا تفصیلی علم بے حد ضروری ہے۔ چنانچہ انگریزی حکومت نے اپنی سیاسی و انتظامی مصلحتوں اور عیسائی مبلغوں نے اپنے مذہب کے پرچار کے لیے برصغیر پاک و ہند کی عام فہم اور مقبول ترین زبان یعنی اردو (جسے وہ عموماً ''ہندوستانی'' کے نام سے موسوم کرتے تھے) کا انتخاب کیا۔ اگر ہم دنیا کی مختلف زبانوں پر نظر ڈالیں، تو ایک انوکھی حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے کہ ان زبانوں کی صرف ونحو یا لغات مرتب کرنے کا بیشتر کام کسی دوسری قوم کے ہاتھوں شروع ہو کر پایۂ تکمیل کو پہنچا، کیونکہ کسی زبان کی مبادیات یا اساسی ڈھانچے کو جاننے کی ضرورت اس زبان کے بولنے والوں کو نہیں بلکہ غیر اہل زبان کو پیش آتی ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے اپنے متذکرہ مقاصد کے حصول کے لیے اردو کو اپنا ذریعۂ اظہار بنایا اور یوں اردو قواعد نویسی اور لغت نگاری کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس دور کے کئی ماہرین السنہ (جن میں زیادہ تر تعداد سرکاری ملازمین کی تھی) نے ان خطوط پر کام کر کے تھوڑے ہی عرصے میں متعدد اہم کتابیں شائع کیں۔ اس موضوع پر انگریزوں سے قبل جو کام ہوا تھا، وہ نہ ہونے کے برابر تھا اور فنی اعتبار سے بھی قابلِ استناد نہ تھا۔ لیکن انگریزوں کی کتابوں کی

اشاعت سے یہ کمی کافی حد تک دور ہوگئی اور اردو لسانیات کے سائنسی مطالعے کا آغاز ہوا۔ اردو زبان کے ان مطالعات میں جن ارباب علم و تحقیق نے حصہ لیا، ان میں زیرِ نظر انگریزی/اردو (یا انگریزی/ہندوستانی) لغت کے مرتب ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو۔ فیلن بھی شامل تھے۔

دو زبانی لغات کے سلسلے میں انگریزی سے اردو لغات کی تدوین کا کام پہلے شروع ہوا اور اس کے بعد اردو۔ انگریزی لغتوں کی اشاعت ہوئی، کیونکہ کسی غیر اہل زبان کو پہلے دوسری زبان کے ان الفاظ کو جاننا پڑتا ہے، جو اس کی اپنی زبان کے مترادف ہوتے ہیں۔ اگر اس نوعیت کی تمام لغات کو دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ فیلن پہلا شخص نہیں، جس نے ایسی دو زبانی لغت کو مرتب کیا، بلکہ ایسی لغتیں اٹھارویں صدی کے آخر میں شائع ہونا شروع ہوگئی تھیں اور فیلن سے قبل چھپ چکی تھیں۔ ان میں سے چند معروف لغات کے مرتبین کے نام یہ ہیں: جے۔ فرگوسن (لندن ۱۷۷۳ء مس قواعد اردو)، جے۔ بی۔ گلکرسٹ (کلکتہ ۱۷۸۶ء۔ ۱۷۹۰ء، طبع دوم مع ترمیم و اضافہ از Thomas Roebuck، ایڈنبرا ۱۸۱۰ء و لندن ۱۸۲۵ء)، ہنری ہیرس (جلد دوم، مدراس ۱۷۹۰ء، پہلی جلد طبع نہیں ہوئی)، ریورنڈ ایم۔ ٹی۔ ایڈم (کلکتہ ۱۸۷۹ء) ایک مجہول الاسم مؤلف (مدراس، ۱۸۵۱ء) اور مولوی عبدالودود (کلکتہ، ۱۸۷۹)۔ ان لغات میں بھی فیلن ہی کی طرح انگریزی الفاظ کے مفاہیم رومن رسم خط میں دیے گئے ہیں۔ علاوہ ازیں انیسویں صدی ہی میں جن اصحاب نے اردو/انگریزی لغات مرتب کیں، ان میں سے بعض نے اپنی لغتوں کے آخر میں ایسی طویل فرہنگوں کو شامل کیا اور یہ ان قارئین کی سہولت کے لیے تھیں جو انگریزی الفاظ کے اردو مطلب جاننا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں جان شیکسپیئر (لندن، طبع چہارم ۱۸۴۹ء، حصہ دوم، صفحات ۳۱۸) اور ڈنکن فاربس (لندن ۱۸۴۸ء، صفحہ ۲۰۵۲۔ ۲۲۰۹) [کذا] کے نام مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

فیلن نے اپنی زندگی میں کئی علمی کارنامے سرانجام دیے اور وہ انیسویں صدی کے لسانی ماہرین میں شمار ہوتا تھا، لیکن گزشتہ صدی کی اتنی معروف شخصیت ہونے کے باوجود ہمیں اس کے

مفصل حالاتِ زندگی کا سراغ بہت کم ملتا ہے۔ اب تک اردو میں اس کی سوانح حیات اور اس کی لسانی خدمات پر کچھ نہیں لکھا گیا۔ اس کے بارے میں ہماری معلومات صرف گریرسن کی ان ہی چند سطروں تک محدود ہیں، جو اس نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف Linguistic Survey of India کی جلد نہم میں لکھی ہیں اور جن کا اردو ترجمہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی کتاب ''قواعد اردو'' کے دیباچے میں درج ہے۔ حیرت ہے کہ اس سلسلے میں انگریزی کے مستند مصادر مثلاً Annual Register اور Dictionary of National Biography بھی فیلن کے ذکر سے خالی ہیں۔ فیلن نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ بنگال کے محکمۂ تعلیم میں بحیثیت ملازم گزارا، لیکن اس دور کی تعلیمی رپورٹیں بھی کچھ زیادہ رہنمائی نہیں کرتیں۔ مزید برآں اس کی اپنی تحریروں سے بھی اس کے حالات کا پتا نہیں چلتا۔ معلومہ مآخذ میں صرف C.E Buckland نے اپنی کتاب Dictionary of Indian Biography (لندن ۱۹۰۶ء، طبع عکسی لاہور ۱۹۷۵ء، ص ۱۴۲) میں فیلن کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ فیلن کے ہم عصر مصنفین مثلاً گارسیں دتاسی (Carcin de Tassy) کی تحریروں سے بعض اشارے مل جاتے ہیں۔ انہی دو مآخذ سے فیلن کی جو ادھوری سی تصویر سامنے آتی ہے، وہ سطور ذیل میں پیش کی جاتی ہے:

فیلن ۱۸۱۷ء میں کلکتہ میں پیدا ہوا۔ ابھی اس کی عمر ۲۰ سال ہی تھی کہ اس نے تعلیم کو خیرباد کہہ کر ۱۸۳۷ء میں بنگال کے محکمۂ تعلیم میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہاں وہ محکمانہ فرائض بڑی خوش اسلوبی سے انجام دیتا رہا اور اپنی صلاحیتوں کے باعث ترقی کرتے کرتے انسپکٹر آف اسکولز کے عہدے پر پہنچ گیا۔ اس کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی چلا گیا اور وہاں کی Halle یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ۱۸۷۵ء میں جب اس کی عمر ۵۸ سال تھی، وہ محکمہ تعلیم سے سبکدوش ہوا اور کلکتہ کو چھوڑ کر دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ پانچ سال بعد یعنی ۱۸۸۰ء میں وہ ہندوستان کو چھوڑ کر انگلستان چلا گیا اور وہیں اس نے ۳؍ اکتوبر ۱۸۸۰ء کو وفات پائی۔

ڈاکٹر فیلن نے اپنے لیے اردو لغت نویسی کے موضوع کو منتخب کیا اور وہ تمام عمر بڑی تندہی

اور لگن سے اس موضوع پر ٹھوس کام کرتا رہا۔ اس کی مرتبہ بیشتر کتابیں اس کی زندگی کے آخری سالوں میں طبع ہوئیں۔ چند کتابوں کے مسودات وہ تیار کر چکا تھا، لیکن زندگی نے اسے اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ انھیں مکمل کر سکتا، چنانچہ وہ مسودات اس کے انتقال کے بعد زیورِ طبع سے آراستہ ہوئے۔ ان ہی ادھورے کاموں میں اس کی زیرِ نظر انگریزی/اردو لغت بھی شامل تھی جو اس کے مرنے کے تین سال بعد چھپی۔ اپنے ان کاموں کے علاوہ اس نے کئی کتابوں کو موزوں اشخاص سے مرتب کرایا اور کئی علمی کاموں کی خود سرپرستی کی۔ اس کی ان علمی خدمات کا اجمالی تذکرہ (انگریزی اردو لغت کے علاوہ) مندرجہ ذیل سطور میں پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ طبقات شعرائے ہند۔ مطبوعہ دہلی، ۱۸۴۸ء

شعرائے اردو کے اس تذکرے کے سرورق کی عبارت یہ ہے:

''شعرائے اردو کا (کذا) مسٹر ایف فیلن صاحب بہادر اور مولوی کریم الدین نے کارسندٹسی (کذا) کی تاریخ سے ۱۸۴۸ء میں ترجمہ کیا اور نو سو چونسٹھ شاعروں اردو گو کے اشعار اور حال بھی دواوین مختلف میں سے منتخب کر کے اس میں مندرج کر دیا گیا۔''

(خطبات گارساں دتاسی، مطبوعہ اورنگ آباد، دکن، ۱۹۳۵ء، ص ۲۵۶)

جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ معروف فرانسیسی محقق گارسیں دتاسی کی ''تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی'' (Histoire de la Litterature Hindoui et Hindoustani, کی طبع اول کی پہلی جلد (پیرس، ۱۸۳۹ء، موضوع "Biographic et Bibliographie" صفحات ۶۳۰) کا اردو ترجمہ مع اضافات ہے۔ ترجمے کا زیادہ تر کام فیلن نے کیا، جس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ وہ فرانسیسی زبان سے بخوبی واقف تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ سرورق کی مذکورہ عبارت کے علاوہ اس تذکرے میں اور کسی جگہ فیلن کا ذکر نہیں اضافوں کے سلسلے میں مولوی کریم الدین کی خاصی مدد کی۔ اپنی کتاب کے اس اضافہ شدہ ترجمے کے متعلق گارسیں دتاسی رقم طراز ہے:

''یہ درحقیقت میری تاریخ کی پہلی جلد سے حذف و اضافے کے ساتھ

تالیف کی گئی ہے جس سے وہ ایک نئی کتاب ہوگئی ہے اور استفادے کے لیے کارآمد ہے۔ اضافہ تقریباً تمام کا تمام یا تو خاندان تیموری کے شاہزادوں کا ہے جو اپنا وقت بہلانے کے لیے اردو شاعری کیا کرتے تھے یا دہلی کالج کے پروفیسروں کے حالات سے متعلق ہے۔ پروفیسروں کا حال دلچسپ ہے۔ ایک تو اس لیے کہ اہل علم و فضل کا ذکر ہے، دوسرے اس وجہ سے کہ تفصیل سے کیا گیا ہے۔"

(خطبات گارساں دتاسی، مذکورۂ بالا، ص ۹۶)

"طبقات شعرائے ہند" کی دیگر تفصیلات کے لیے دیکھیے:

ڈاکٹر محمود الٰہی کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ "بازیافت" مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۶۵ء، صفحہ ۳۶۔۶۲؛ و مولوی کریم الدین کے ناول "خط تقدیر" کا دیباچہ از ڈاکٹر محمود الٰہی، مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۶۵ء؛ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار: طبقات شعرائے ہند اور مولوی کریم الدین (صحیفہ، شمارہ ۴۰، بابت جولائی ۱۹۶۷ء، ص ۹۔۳۰)

۲۔ فیلن کی ایک اور کتاب کا عنوان یہ ہے:

An English-Hindustani Law and Commercial Dictionary of words and phrases used in civil, criminal, revenue, and mercantile affairs, designed especially to assist Translators of Law papers.

Calcutta, 1858.

اس لغت میں قانونی اور تجارتی اصطلاحات کو جمع کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق گارسیں دتاسی اپنی رائے کا اظہار یوں کرتا ہے:

"یہ بہت مفید کتاب ہے جس کی ابتدا میں ایک مقدمہ ہے جس میں تاریخی

ولسانی لحاظ سے انگریزی کا ہندوستانی سے مقابلہ کیا گیا ہے۔"

اس لغت کا دوسرا ایڈیشن رومن رسم خط میں فیلن کے میر منشی اور حکومت بنگال کے نائب مترجم لالہ فقیر چند کی ترتیب و نظر ثانی کے ساتھ شائع ہوا (بنارس، میڈیکل ہال پریس، ۱۸۸۸ء، صفحات ۸۵)۔

۳۔ فیلن نے قانونی اور تجارتی اصطلاحات پر اردو سے انگریزی کی بھی ایک لغت مرتب کی تھی اور اس میں بہت سے اضافے بھی کیے۔ اس کتاب کا عنوان یہ ہے:

> A Hindustani-English Law and Commercial Dictionary comprising many Law phrases and Notes in addition to the Law phrases given in the general Dictionary.
>
> Benares, 1879

۴۔ فیلن نے جدید ہندوستانی / انگریزی لغت بھی مرتب کیا اور اس میں اردو ادب اور لوک ریت سے امثال وغیرہ بھی درج کیں۔ یہ لغت مکمل صورت میں مرتب کی وفات سے ایک سال پہلے یعنی ۱۸۷۹ء میں بنارس سے شائع ہوئی، لیکن قبل ازیں فیلن اس لغت کو مختلف کراسوں کی شکل میں چھپواتا رہا، چنانچہ گارسیں دتاسی اپنے ۱۸۷۲ء کے خطبے میں لکھتا ہے:

> "ڈاکٹر ایس۔ ڈبلیو۔ فیلن (S.W Fallon) کی ہندوستانی انگریزی لغت کا نمونہ بھی میرے سامنے ہے۔ یہ لغت اردو کی دوسری لغتوں کے بہ نسبت، جو اب تک شائع ہوئی ہیں، زیادہ مکمل ہے۔ اس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ حرم سرا کی عورتوں کی زبان کے خاص الفاظ اس میں شامل کیے گئے ہیں جو اور دوسری لغتوں میں نہیں ملتے۔"

(مقالات گارساں دتاسی، جلد اول، طبع ثانی، کراچی ۱۹۶۴ء، ص ۲۱۶)

فیلن کو اس لغت کی تدوین کے سلسلے میں اپنے دور کے بیشتر اصحاب علم وفضل کا تعاون حاصل رہا۔ انگریزوں میں Rew. Kellog, Rev. Bate John Beames اور دربھنگا اسکول کے ہیڈ ماسٹر S.H.Wattling نے اس کی مدد کی اور مقامی لوگوں میں لالہ فقیر چند (متذکرۂ بالا نمبر۲ کی طبع دوم کے دیباچے میں وہ خود لکھتا ہے کہ اس نے بارہ سال تک فیلن کے ساتھ کام کیا)، منشی چرنجی لال، منشی سید احمد، منشی جگن ناتھ، منشی ٹھاکر داس دہلوی، منشی لیاقت حسین دیناپوری، پنڈت شیونرائن، منشی نہال چند، منشی بشمبر ناتھ، منشی رام پرشاد دہلوی، محمد محمود میرٹھی، رام ناتھ تیواری فرخ آبادی، منشی کشوری لال دہلوی، منشی احسان علی رہتکی اور رائے سوہن لال کے نام شامل ہیں۔

فیلن کا ایک معروف ہم عصر پلیٹس اس لغت کے بارے میں یوں اظہار خیال کرتا ہے:

> "The Hindustani Dictionary of Fallon aims at a special subject, distinct from that pursued in the pages of this work : it aims rather, at the collection of a particular class of words and phrases.Hundreds of words that occur in Hindi and Urdu literature Dr.Fallon thought proper to give no place to in his Dictionary,becaust,from his point of view،they were pedantic.
>
> This must, necessarily, considerably diminsh the usefulness of his book so far as students are concerued.The work is،notwithstanding, one of considerable merit, and will no doubtbe

valued by scholars on account of the numerous proverbes and quotations from the poets which it contains."

(John T. platts: A Dictionary of Urdu, Classical Hindi,and English. reprint Oxford 1968,preface,p iii)

۵۔ اس دور میں بالعموم اردو/انگریزی لغات میں بنیادی الفاظ کے ضرب الامثال اور محاورات بھی درج کر دیے جاتے تھے، لیکن فیلن نے ان کو یکجا کر کے پہلی بار الگ کتابی صورت میں مرتب کیا۔ اس نے اپنی لغت کو صرف اردو محاورات ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں دیگر زبانوں مثلاً مارواڑی، پنجابی، بھوجپوری وغیرہ کے محاوروں کو بھی شامل کیا۔ بدقسمتی سے فیلن اپنے اس کام کو مطبوعہ صورت میں نہ دیکھ سکا۔ اس کی موت کے بعد ''حکایات پنجاب'' (۳ جلد) کے جانے پہچانے مؤلف آر۔ سی۔ ٹمپل (R.C.Temple) نے نظر ثانی کے بعد اسے شائع کرایا اور اس کام میں فیلن کے دیرینہ رفیق کار لالہ فقیر چند نے اس کی مدد کی۔ اس لغت کا عنوان یہ ہے:

A Dictionary of Hindustani Proverbs, including many Marwari, Panjabi, Maggah, Bhojpuri and Tirhuti proverbs, Sayings, Emblems, Aphorisms, Maxims and Similes. By the late S.W. Fallon.....Edited and revised by Captain (Col. Sir) R.C. Temple....assisted by Lala Faqir Chand Vaish, of Delhi.

Benares/London 1886

گارسیں دتاسی، جس کے فیلن سے دوستانہ روابط تھے، اپنے خطبہ بابت ۷/فروری ۱۸۶۱ء میں مذکورہ لغت کے متعلق یہ اطلاع دیتا ہے:

''مسٹر فیلن جنھوں نے قانون و تجارت کی ہندوستانی لغت تیار کی ہے

> اب علاقہ مارواڑ کے ہندی گیت بھی جمع کر رہے ہیں جو عنقریب شائع ہوں گے۔ وہ ساتھ ہی ہندی اور اردو کے محاورے بھی یکجا کر رہے ہیں۔ جب یہ کتابی شکل میں شائع ہوں گے تو روبک (Roebuck) کی محاوروں کی کتاب سے کہیں زیادہ بڑی کتاب پر مشتمل ہوں گے۔''

(خطبات گارساں دتاسی، محولہ بالا، ص ۲۷۱۔۲۷۹)

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فیلن نے متذکرۂ بالا لغت پر ۱۸۶۰ء کے لگ بھگ متعلقہ معلومات کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا اور وہ اس موضوع پر تقریباً بیس سال کام کرتا رہا۔

۶۔ جب فیلن کا تقرر صوبۂ بہار کے انسپکٹر تعلیمات کی حیثیت سے ہوا، تو اس نے مدرسوں میں اردو کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے اردو ریڈروں کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا تھا۔ یہ ریڈریں منشی سورج مل کے تعاون سے تیار کی گئیں اور ان کی ترتیب میں مشرقی ممالک کے مروجہ طریقۂ تعلیم کو پیش نظر رکھا گیا ہے، تا کہ طالب علموں کے لیے ان کو سمجھنا دشوار نہ ہو۔

۷۔ پٹنہ اور الہٰ آباد کے محکمۂ تعلیم کی ایما پر فیلن نے ایک کتاب ''اردو آموز'' بھی مرتب کی تھی اور یہ مدرسوں میں نصابی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی تھی۔

۸۔ فیلن کی نگرانی میں پٹنہ کے منشی سورج مل نے ایک اردو لغت مرتب کی، جس میں اردو الفاظ کے مطالب اردو ہی میں دے گئے تھے۔ اس لغت کے متعلق ۱۸۶۲ء میں گارسیں دتاسی لکھتا ہے:

> ''یہ لغت فارسی رسم خط میں ہے اور اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اس کی تقطیع ہشت ورقی فارموں کی ہے اور ہر صفحے پر دو کالم ہیں۔ الفاظ کی ترتیب فارسی حروف تہجی کے لحاظ سے ہے۔ ہر لفظ کے ساتھ اس کا مآخذ بتایا گیا ہے کہ وہ عربی کا ہے، فارسی کا یا سنسکرت کا ہے۔ اس لغت کے الفاظ کے ساتھ مشہور مصنفوں اور شاعروں کے کلام سے مثالیں بھی دی گئی ہیں، تا کہ ان کے معنوں کا تعین ہو سکے۔ اس لغت کا اشتہار اس وقت میرے پیش نظر ہے جس کے ساتھ چار صفحات بہ طور نمونہ منسلک ہیں۔

> ان صفحات کے دیکھنے سے میں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ کام بہت قابل اطمینان طریق پر ہوا ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ لغت جلد تیار ہو کر چھپ جائے۔"

(مقالات گارساں دتاسی، مذکورہ، جلد اول، ص ۹۱)

۹۔ اردو میں مختلف سائنسی موضوعات پر کتابیں لکھنے کا آغاز سولھویں صدی کے اواخر میں ہو گیا تھا، لیکن ایسی کتابیں انیسویں صدی کے ربع اول سے باقاعدہ طور پر شائع ہونا شروع ہوئیں۔ فخر الدین خاں شمس الامرائے ثانی (۱۱۹۵ھ۔۱۲۷۹ھ/۱۷۸۰ء۔۱۸۶۲ء) کی سرپرستی میں مغربی علوم وفنون، خصوصاً سائنس اور ریاضیات وغیرہ کی متعدد کتابوں کو اردو میں منتقل کیا گیا۔ اس کے علاوہ اودھ کے بادشاہوں نے بھی ایسی کتابوں کی حوصلہ افزائی کی۔ مزید برآں یہاں کے لوگوں کو مغربی ممالک کی جدید سائنسی تحقیقات سے روشناس کرانے کے لیے چند ادارے بھی معرض وجود میں آئے۔ ان میں دہلی کالج کی ورنیکولر ٹرانسلیشن سوسائٹی (Vernacular Translation Society) کا نام سرفہرست ہے۔ اداروں کے علاوہ بہت سے اصحاب انفرادی طور پر سائنسی موضوعات پر کتابوں کی تصنیف میں مصروف تھے۔ اس ضمن میں دہلی کالج کے ماسٹر رام چندر کی خدمات قابل قدر ہیں۔ اس کے علاوہ اور لوگ بھی اردو میں سائنسی کتب کی کمی کو دور کرنے کے لیے مخلصانہ کوششیں کر رہے تھے۔ ان ہی اشخاص میں رائے سوہن لال کا نام بھی شامل ہے، جو ۱۸۷۱ء میں نارمل اسکول (پٹنہ) کا ناظم تھا۔ اس نے اردو میں بہت سی سائنسی کتابیں تصنیف کیں اور یہ سارا کام فیلن کی سرپرستی میں ہوا۔ گارسیں دتاسی رقم طراز ہے:

> "...... اردو اور ہندی میں سائنس پر ۱۸۷۱ء میں متعدد کتابیں شائع ہوئیں اور بعض عنقریب شائع ہونے والی ہیں۔ ان میں سے بعض پٹنہ میں زیر طباعت ہیں یا مطبع جانے کے لیے تیار ہیں۔ رائے سوہن لعل ناظم نارمل اسکول پٹنہ نے مذکورہ صدر مسٹر فیلن کے زیر نگرانی یہ کتابیں تیار کی ہیں۔ مسٹر فیلن نے از راہ کرم ان کتابوں کے نمونے جو مجھے بھیجے ہیں،

> انھیں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سائنٹیفک اصطلاحوں کو بجائے سنسکرت یا عربی کے خوش قسمتی سے ہندوستانی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ بعض مصنف یہ کرتے ہیں کہ علمی اصطلاحوں کو علیٰ حالہ رہنے دیتے ہیں اور انھیں انگریزی رسم خط میں متن میں تحریر کردیتے ہیں۔ لیکن پٹنہ میں جو کتابیں شائع ہورہی ہیں ان میں یہ طریقہ نہیں اختیار کیا گیا۔"

(مقالات گارساں دتاسی، مذکورہ، جلد اول، ص ۹۱، ۹۲)

۱۰۔ اردو صحافت کا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ہوا ہے۔ اردو زبان میں شائع ہونے والا پہلا اخبار "جامِ جہاں نما" ہے، جس کا ۱۸۲۲ء میں کلکتہ میں اجرا ہوا۔ جب ۱۸۳۰ء میں اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا، تو اردو کے اخباروں اور رسالوں میں روز افزوں اضافہ ہونے لگا[۱۳] اگر ۱۸۲۲ء اور ۱۸۵۷ء کی درمیانی مدت میں شائع ہونے والے اردو اخبارات و جرائد کا ایک سرسری جائزہ لیں تو ان میں بعض ایسے رسالے بھی نظر آتے ہیں، جن کے مدیران انگریز تھے یا وہ ان کی زیرِ نگرانی طبع ہوتے تھے۔ ان ہی انگریز مدیروں یا سرپرستوں میں فیلن کا نام بھی شامل ہے، جس نے تین اخبارات کے اجرا اور ان کو مقبول عام بنانے میں اہم خدمات سرانجام دیں۔ ان تین اخباروں کی بعض تفصیلات درج ذیل ہیں:

الف۔ اخبار الحقائق:

یہ آگرہ کالج کا اخبار تھا اور ۱۸۴۶ء میں "صدر الاخبار" کے نام سے جاری ہوا۔ اس میں زیادہ تر سائنسی موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے اور ان کا مقصد آگرہ کالج کے طالب علموں کوئی سائنسی تحقیقات سے متعارف کرنا تھا۔ اس اخبار کا مدیر فنک نامی کوئی شخص تھا، جسے بعد میں اخبار میں قابلِ اعتراض مواد شائع کرنے کی پاداش میں الگ کردیا گیا اور اس کی جگہ ڈاکٹر فیلن کا تقرر ہوا اور اس کے اخبار کے متعلق جو گوشوارے دیے ہیں[۱۴] اس سے ایک تو اس کی سالانہ آمدنی کا اندازہ ہوتا ہے، دوسرے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ فیلن نے ۱۸۴۹ء سے لے کر اس کی

ادارتی ذمے داریوں میں اس کا ہاتھ بٹایا۔ کچھ عرصے بعد فیلن سے بھی ایک غلطی سرزد ہوگئی یعنی کسی شمارے میں گائے کے ذبیحہ پر چند ایسی باتیں لکھ دی گئیں، جس سے کئی متنازع فیہ مسائل اٹھ کھڑے ہوئے۔ میرٹھ کے اخبار ''جامِ جمشید'' نے ان نزاعی امور پر سخت تنقید کی۔ بالآخر یہ طے پایا کہ آئندہ ایسے اختلافی مباحث کو شائع نہ کیا جائے۔ یہ اخبار تین روزہ تھا۔

ب۔ خیر خواہ خلق:۵

جب فیلن اجمیر کے مدرسۂ اعلیٰ کا نگران اور وہاں کے مدارس کا ناظر مقرر ہوا، تو اس نے ایک لیتھو پریس اور اس کے ساتھ مذکورۂ صدر ہفتہ وار اردو اخبار جاری کیا۔ اس کا سنہ اجرا اواخر ستمبر ۱۸۵۸ء ہے، لیکن امداد صابری نے سنہ ۱۸۶۰ء لکھا۶۔ گارسیں دتاسی اسی اخبار کے بارے میں یہ اطلاع دیتا ہے:

''اس علاقے میں اردو زبان کا یہ پہلا اخبار ہے۔ اس کی ادارت دو ہندو حضرات سوہن لال اور اجودھیا پرشاد کر رہے ہیں۔ یہ دونوں اجمیر کالج کے طلبائے قدیم ہیں۔ جہاں انھوں نے انگریزی پر پورا عبور حاصل کیا۔ ان کی اردو تحریر میں سادگی اور لُطفِ بیان کے ساتھ ساتھ ہندوستانیت اور انگریزی اثر دونوں موجود ہیں۔ اس اخبار کا نام ''خیر خواہ خلق'' ہے۔ یہ ہفتہ وار شائع ہوتا ہے اور چھوٹی تقطیع کے آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ روز مرہ کی عام خبروں کے علاوہ اس میں مختلف عنوانات پر بھی مضامین ہوتے ہیں۔ مثلاً اس میں ایک مضمون ہندوستانیوں کو اسلحہ سے محروم کرنے دوسرا ذات پات کے تمام توہمانہ خیالات اور جبریہ تبدیل مذہب کے متعلق شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن حکومت نے اس اخبار کے مدیروں کی آزادانہ روش کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔ چونکہ بغاوت کے بعد اسے ہندوستان میں آزادی باقی نہیں رہی، لہٰذا حکومت نے اس اخبار کی اشاعت کو ممنوع قرار دیا''۸۔

''خیر خواہ خلق'' کے خریداروں کی کل تعداد ۳۸۱ تھی۔ ہر پرچے کی آمدنی ۱۶۲ روپے ۱۲ آنے اور خرچ ۹۸ روپے تھا۹۔

ج۔ تاریخ بغاوت ہند:

جب فیلن آگرہ میں محکمۂ تعلیم سے منسلک تھا، اس نے وہاں کے طبی کالج کے نائب سرجن اور علم التشریح کے مدرس مکند لال سے، جو دہلی کالج کا فارغ التحصیل تھا، ایک ماہانہ رسالہ ''تاریخ بغاوتِ ہند'' مرتب کرایا تھا۔ یہ رسالہ جولائی ۱۸۵۹ء میں جاری ہوا اور تیرہ شماروں کی اشاعت کے بعد ۱۸۶۰ء کے اواخر میں بند ہو گیا۔ اس کا سالانہ چندہ چھ روپے تھا اور ایک پرچے کی قیمت آٹھ آنے تھی۔ یہ آگرہ کے مطبع مفید خلائق محلہ پیپل منڈوی میں منشی شیونرائن کے اہتمام سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں صرف ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے متعلق مضامین چھپتے تھے اور اس میں سلسلے وار ہندوستان کے مختلف ضلعوں اور شہروں کے جنگ آزادی کے واقعات و حالات درج کیے جاتے تھے۔ اس رسالے کے اٹھارہ پرچے امداد صابری کے والد مولوی شرف الحق کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھے۔ اول الذکر نے ان ہی کے پیش نظر اس رسالے کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں[۱۰]۔

سطور بالا میں فیلن کے مختصر سوانح حیات اور اس کے علمی کارناموں کا بالاختصار ذکر کیا گیا ہے اور یہ تمام تفصیلات اس کی اپنی تحریروں، معاصرین کی تصانیف اور دیگر مستند مآخذ سے اخذ کی گئی ہیں۔ ان منتشر معلومات کی جمع آوری کے بعد ارباب تحقیق و تدقیق فیلن کی لسانی، صحافتی اور نصابی خدمات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں اور اس کے علمی مقام کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس دور کے دیگر قابلِ استناد مصادر مثلاً رسائل، اخبارات، تعلیمی رپورٹوں، مختلف علمی اداروں کی ماہانہ یا سالانہ رودادوں وغیرہ کو کھنگالا جائے تو یقیناً اس کی زندگی کے بعض نامعلوم گوشوں پر روشنی پڑے گی اور اس کے ٹھوس علمی کام کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جا سکے گا۔ لیکن اول تو یہ مسائل ایک الگ مبسوط مقالے کے متقاضی ہیں اور دوسرے ان میں سے بیشتر چیزیں ہمارے یہاں کے کتب خانوں میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ بہر کیف ان مواقع کے باوجود فروغ اردو سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو چاہیے کہ وہ اپنی زبان کے ایسے ہی خواہوں کی یاد کو تازہ رکھیں اور ان کی

ادھوری تصویروں کو مکمل کرنے کی مقدور بھر کوشش کرتے رہیں۔

(مشمولہ انگریزی اردو ڈکشنری، مرتبہ ایس ڈبلیو فیلن،
اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء)

☆☆☆☆

حواشی:

(تمام حواشی محمد اکرام چغتائی کے قلم سے ہیں)

(۱) صرف ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مرحوم نے اپنی کتاب ''گارساں دتاسی اور اس کے ہم عصر بہی خواہان اردو (حیدر آباد دکن، طبع اول ۱۹۳۱ء، طبع ثانی ۱۹۴۱ء، ص ۱۱۴۔۱۱۵) میں فیلن کے وقائع زندگی بالاختصار درج کیے ہیں اور وہ بھی زیادہ تر گارسیں دتاسی کی تحریروں سے اخذ شدہ ہیں۔

(۲) تفصیل کے لیے رک: اردو میں سائنسی ادب از خواجہ حمید الدین شاہد، کراچی ۱۹۶۹ء

(۳) ہندوستانی اخبار نویسی، کمپنی کے عہد میں از محمد عتیق صدیقی، علی گڑھ ۱۹۵۷ء، ص ۲۶۲۔۲۶۴

(۴) صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات (۱۸۴۸ء۔۱۸۵۳ء) از محمد عتیق صدیقی علی گڑھ ۱۹۶۲ء،

ص ۳۹۔۴۷ نیز دیکھیے: صحافت پاکستان و ہند میں از ڈاکٹر عبد السلام خورشید، لاہور ۱۹۶۳ء ص ۱۲۴

(۵) محمد عتیق صدیقی نے اس کا نام ''خیر خواہ خلایق'' لکھا ہے، بحوالہ صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، مذکورہ، ص ۲۴۰

(۶) تاریخ صحافت اردو از امداد صابری، جلد دوم، حصہ اول، نئی دہلی، ۱۳۷۲ھ، ص ۱۴۸

(۷) محمد عتیق صدیقی نے ہندو مدیروں کی تعداد تین لکھی ہے۔ دیکھیے صوبۂ شمالی و مغربی کے

اخبارات و مطبوعات۔ مذکورہ۔ ص ۲۴۰

(۸) خطبات گارساں دتاسی، مذکورہ، ص ۲۷۴۔ ۱۲۷۵، دسواں خطبہ بابت ۷ رفروری ۱۸۶۱ء

(۹) صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات، مذکورہ، ص ۲۴۰

(۱۰) تاریخ صحافت اردو، مذکورہ، ص ۱۲۹۔ ۱۲۹

☆☆☆☆

سید جاوید اقبال

دفتر امیر اللغات

اس مقالے کا مقصد ''دفتر امیر اللغات'' سے متعلق معلومات فراہم کرنا ہے، تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ لغت کی ابتدا کب سے ہوئی؟ اس کا ابتدائی لائحہ عمل کیا تھا؟ دفتر کب اور کہاں قائم ہوا؟ اور کس طرح ختم ہوا؟ دفتر معتمدین، ملازمین اور علمی معاونین کون کون تھے؟ لغت کا طریقۂ تالیف کیا تھا؟ لغت کے کتنے حصے مرتب ہوئے؟ کتنے شائع ہوئے؟ اور کتنے نامکمل رہ گئے؟ کس سبب سے مکمل حصے شائع نہ ہو سکے؟ یہ لغت کس طرح فروخت ہوتی تھی؟ دفتر کی کاروباری شرائط کیا تھیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

امیر اللغات اور اس کے دفتر سے متعلق بہت کچھ معلومات اس سے قبل ہمارے کئی فضلا بالخصوص ڈاکٹر کریم الدین احمد[۱] اور ڈاکٹر ابو محمد سحر[۲] اپنے اپنے مقالاتِ تحقیق میں پیش کر چکے ہیں، لیکن ان میں زمانی تسلسل نہیں ملتا اور ہمارے خیال میں بہت سی معلومات رہ بھی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ان دونوں معزز محققین نے کم و بیش ایک ہی وقت میں اپنے مقالاتِ تحقیق مکمل کیے۔ ایک کام ہندوستان میں ہوا، دوسرا پاکستان میں۔ دونوں مقالات کے شائع ہونے

میں ۱۸ سال بھی حائل ہیں۔ اس ۱۸ سال کے عرصے میں غالباً ان مقالات تک دونوں ممالک کے اہلِ علم کی رسائی بھی نہ ہو سکی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امیر اور ان کے کام سے متعلق لوگوں کو مکمل معلومات حاصل نہیں ہو سکیں اور کچھ غلط فہمیاں بھی پیدا ہو گئیں جو اکثر و بیشتر زبانی سننے میں آتی ہیں، جن کو دور کرنے کی ضرورت ہے۔

اس مقالے میں کچھ غیر مطبوعہ مکاتیب کے اقتباسات بھی پیش کیے گئے ہیں۔ یہ دفتر امیر اللغات سے ارسال کیے گئے تھے، جو معتمدینِ دفتر نے تحریر کیے تھے۔ راقم الحروف نے اپنے ایک گزشتہ مضمون ''افاداتِ امیر'' (مطبوعہ رسالہ ''تحقیق'' شمارہ سوم، شعبۂ اردو جامعہ سندھ) میں امیر کے غیر مطبوعہ ذخیرۂ مکاتیب کی تفصیل پیش کی تھی یہ خطوط بھی اسی ذخیرے سے حاصل کیے گئے ہیں۔

(۱)

''۱۷/ اکتوبر ۱۸۸۴ء کو سر الفرڈ لائل صاحب بہادر لفٹیننٹ گورنر ممالک متحدہ آئے۔'' [۳] ''انھوں نے فرماں روائے ریاست رام پور (نواب کلب علی خاں) سے اردو کے ایک جامع لغت کی فرمائش کی، دربار میں بیسیوں زبان داں حاضر تھے لیکن آسماں بارِ امانت نتوانست کشید، یہ دشوار خدمت امیر مینائی کے سپرد کی گئی۔'' [۴] ''امیر نے لفظ آنکھ کے تقریباً ساڑھے چار سو محاورات وغیرہ مرتب کر کے لغت کا نمونہ پیش کیا اور وہ جنرل اعظم الدین خاں مغفور (اس وقت سفیر ریاست تھے) کی معرفت سر الفرڈ لائل کی خدمت میں بھیجا گیا۔'' [۵] ''جو دوسری جون ۱۸۸۶ء کو پیش کیا گیا۔'' [۶] یہ نمونہ دو حصوں پر مشتمل تھا پہلے میں کئی سو الفاظ و محاورات اور دوسرے حصے میں اشتہار تھا جس میں امیر اللغات کا لائحہ عمل پیش کیا گیا تھا۔ امیر اشتہار میں لکھتے ہیں:

> ''میں نے قصد کیا کہ معزز زبان دانوں کی ایک کمیٹی جمع کر کے ایک ایسا عمدہ لغت تیار کیا جائے جو کھری کھوٹی بول چال کے واسطے کسوٹی ہو۔ اس کمیٹی میں مختلف زبانوں کے عمدہ جاننے والے شریک ہوں گے۔ سنسکرت کے الفاظ جو اردو میں اپنی اصلی حالت میں ہیں یا ان میں کچھ

> الٹ پھیر ہوا ہے۔ اس کی تحقیقات کو قابل پنڈت بنارس یا جہاں کہیں ملیں گے کمیٹی میں شریک کیے جائیں گے انگریزی کے لائق زبان داں ہندوستانی بطور ملازم اور یورپین بطور معاون ممبر ہوں گے۔ یہ لغت بہت بڑا ہوگا، اس سبب سے آٹھ حصوں میں شائع کیا جائے گا۔ ہر حصے کی مقدار پندرہ سے بیس جزو تک ۲۲ تقطیع پر ہوگی اور اس کی قیمت سات روپے فی حصہ ہوگی۔'' [۷]

امیر نے اشتہار میں کمیٹیوں کے بارے میں تحریر کیا کہ تین کمیٹیاں قائم کی جائیں گی۔ (۱) انتظامی کمیٹی، جس کا مقصد تدوینِ لغت کے انتظامی امور کو سرانجام دینا ہوگا۔ (۲) عملی کمیٹی، ان افراد پر مشتمل ہوگی جو مؤلف کی ماتحتی میں لغت کا کام کریں گے۔ (۳) مشیر کمیٹی، یہ اہل الرائے پر مشتمل ہوگی، ان ارکان کو عملی کمیٹی کا معتمد لغت کے حصے، رائے کے سلسلے میں بھیجے گا اور ان کی اصلاح و ترمیم پر لغت مرتب کی جائے گی اس کے علاوہ انھوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ لغت کے دفتر کے سلسلے میں پریذیڈنٹ، وائس پریذیڈنٹ اور وائس پیٹرن مقرر کیا جائے گا۔

امیر نے اشتہار کے ذریعے کمیٹیوں کی ممبری کے لیے اصحاب کے نام مع لقب و سکونت طلب کیے، اس کے علاوہ رائے طلب کی کہ لغات کی ترتیب و انتخاب میں کن اصولوں پر عمل کیا جائے۔ فارسی، عربی اور سنسکرت کے الفاظ لغت میں کہاں تک لیے جائیں۔ طباعت میں کن اصولوں کو اپنایا جائے، الفاظ کے اندراج اور مخففات کے لیے کیا اصول بنایا جائے، دوسری زبانوں کے الفاظ لینے کے لیے انھوں نے خود یہ اصول تجویز کیا کہ:

> ''ان کے اسی قدر الفاظ داخلِ لغت کیے جائیں جو لغت کو اردو کی حد سے باہر نہ کردیں۔'' [۸]

اس کے علاوہ لغت کو پڑھنے، مصدر سے مشتقات بنانے کے قواعد، لغت کے مقدمے میں مفصل تحریر کردیے جائیں اور یہ اعلان بھی کیا کہ طباعت سے قبل پروف اہل الرائے حضرات کے پاس بھیجے جائیں گے اور ایک ماہ تک ان کے مشوروں کا انتظار کیا جائے گا۔

امیر نے انگریزوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے انگریزی میں ، Prospectus of the Urdu Dictionary کے عنوان سے ایک عبارت بھی شامل کی جس میں لغت کا لائحہ عمل پیش کیا گیا ہے۔

''سرالفرڈ لائل نے اس نمونے کو بہت پسند فرمایا۔'' [۹] اور تالیف کے سلسلے میں مفید مشورے دیے اور یہ ہدایت بھی دی کہ:

> ''گورنمنٹ بہت سی جلدیں اس لغت کی خرید کرے۔ ہم مختلف ریاست ہائے ہندوستان اور بنگال، پنجاب، بمبئی اور مدراس کی گورنمنٹوں سے بھی درخواستِ اعانت کریں گے اور ہزایکسیلنسی وائسرائے سے التجا کر کے ان کو سرپرست اور مربی اس کا بنائیں گے۔ جس قدر روپیہ منشی صاحب اس کی تالیف کے لیے خیال کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ مہیا ہو جائے گا۔'' [۱۰]

امیر نے نمونے شائع کرانے سے پہلے اسے خاص خاص اہلِ علم کو ارسال کیا اور نمونے سے متعلق رائے مانگی۔ مولوی مہدی حسن خاں شاداب رسول پوری کو ۱۹ ربیع الآخر ۱۳۰۴ھ کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

> ''سوا آپ کے اور چند احباب کے کسی کو بھیجا ہی نہیں۔ سرالفرڈ لائل صاحب بہادر لیفٹنٹ گورنر ممالک مغربی وشمالی جن کی فرمائش سے یہ نمونہ درست کیا ہے وہ ابھی اس کی اشاعت کی اجازت نہیں دیتے...... آپ پورے نمونے کو مطالعہ فرمائیں اور جس جگہ جو خدشہ ہو وہ لکھ دیں۔'' [۱۱]

اس کے بعد یہ نمونہ ''۱۸۸۶ء میں ۱۰×۱۴'' کے سائز پر تاج المطابع رام پور میں طبع ہو کر ''نمونہ امیر اللغات'' کے نام سے شائع ہوا'' [۱۲]

امیر نے لغت کے لائحہ عمل کے دوسرے مرحلے میں مختلف شہروں کے دورے کیے تاکہ لغت کے کام کو بھرپور طریقے سے شروع کیا جا سکے مقدمہ امیر اللغات میں تحریر کرتے ہیں:

> "دیکھوں اردو لغت کی طرف ملک کے خیالات کیسے ہیں، لکھنؤ، فیض آباد اور بنارس ہوتا ہوا پٹنے تک گیا۔" [۱۳]

امیر نے اس دورے میں نوابین، ادبا، شعرا اور عربی فارسی کے علما سے بالمشافہ ملاقات کی اور ان سے لغت کے بارے میں خیالات دریافت کیے۔

جب کہ امیر سے پہلے ان کے بڑے صاحب زادے محمد احمد صریر نے سر الفرڈ لائل کی رائے کے مطابق مختلف شہروں کے دورے کیے تھے۔ اس سے متعلق مولوی مہدی حسن خاں شاداب کو ۳؍ جنوری ۱۸۸۷ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

> "محمد احمد نے صحت پا کر پنجاب کا سفر کیا ہے ایک مہینے میں واپس آنے کا ارادہ ہے۔ اس سفر کا نتیجہ اگر اس لغت کے حق میں اچھا ہوا تو دوسرا سفر اور کسی لین پر کریں گے۔ میری رائے نہ تھی کہ ابھی سفر کیا جائے، مگر جناب لیفٹیننٹ گورنر بہادر ممالک مغربی و شمالی کی رائے یہی ہوئی کہ جب تک کوئی لائق آدمی ملک میں پھر کر اشاعت نہ کرے گا تب تک ملک متوجہ نہ ہوگا۔" [۱۴]

شاداب رسول پوری کو محمد احمد کے سفر کی روداد لکھتے ہیں، خط مورخہ ۱۹ ربیع الآخر ۱۳۰۴ھ:

> "محمد احمد نے ان کی (گورنر بہادر سر الفرڈ لائل) رائے کے موافق سفر عمدہ مقامات ہندوستان کا ارادہ کیا ہے۔ چنانچہ علی گڑھ میں آنریبل سید احمد خان سے مل کر دہلی، سہارنپور، انبالہ، پٹیالہ، امرتسر، لاہور وغیرہ کی سیر کی اور ان مقامات کے لائق یورپین اور ہندوستانیوں سے مل کر رائے لی اور جن کو لائق سمجھے ان سے ممبر کی درخواست کی اور جن کو اہل اور متوجہ نہ پایا ان سے ہاتھ اٹھایا۔" [۱۵]

امیر نے امیر اللغات کا نمونہ لکھنے، شائع کرانے مختلف شہروں کا دورہ کرنے کے بعد اگلے

مرحلے میں رائے لینے کا مکتوباتی سلسلہ بھی شروع کیا، ۹ دسمبر ۱۸۸۸ء کے ایک خط میں میں صفیر بلگرامی کو تحریر کرتے ہیں:

> ''امیر اللغات کے اصول سے متعلق ایک کاپی بھیج کر آپ کے دل و دماغ سے جواب یا صواب کی آرزو ہے'' ١٦ ۔

جب کہ حبیب الرحمان خاں شروانی کا اسی بابت شکریہ ادا کرتے ہیں۔ مکتوب مورخہ ۹ ردسمبر ۱۸۸۸ء:

> ''مکرمت نامہ آیا سب سے مقدم آپ کی تحریر، جواب مشمولات میں آئی جن کو دیکھ کر ہیچمدان نہایت مسرور ہوا۔'' ١٧

نمونۂ امیر اللغات کا شائع کرانا، اشتہار میں لغت کے اغراض و مقاصد اور اصولِ تالیف کو بیان کرنا امیر کی دیانت داری اور سلیقہ مندی کا ثبوت ہے۔ اور پھر اشتہار میں مشورہ دینے کی درخواست کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ یہ کام اہلِ علم کے مشورے سے انجام دینا چاہتے تھے۔ ان اہل علم میں اردو کے علاوہ انگریزی اور سنسکرت کے ماہرین کی موجودگی کو وہ ضروری سمجھتے تھے تاکہ اس وقت تک موجود لغات میں ''امیر اللغات'' منفرد ہو جائے۔

امیر کی لغت نگاری کے بارے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کی رائے بہت وزن رکھتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> ''امیر، اردو کے پہلے لغت نگار تھے جنھوں نے لغت کی تدوین میں عام طور پر ملک کی رائے حاصل کرنے کے لیے کئی سو الفاظ و محاورات کا ایک نمونہ شائع کیا۔'' ١٨

ان تمام امور کے پس منظر میں گزشتہ ادوار میں مرتب کیے گئے ان لغات کے تجربے تھے جو آج تک منظرِ عام پر نہ آ سکے۔ گزشتہ دور کے لغات سے مراد سرمۂ بصیرت، بہارِ ہند اور محاورات مصادر اردو ہیں۔

امیر ابتدائی طور پر لغت مرتب کرنے کا ڈھنگ جان گئے تھے۔ اس لیے ایک مربوط اور

جدید انداز سے لغت تالیف کرنے کی بنیاد ڈالی۔ اب لغت کے اگلے مرحلے دفتر کے قیام سے متعلق مواد پیش کیا جائے گا۔

(۲)

۱۸۸۷ء میں محمد احمد اور ۱۸۸۸ء میں امیر نے ممکن حد تک مختلف شہروں کے دورے کیے اور پھر بقول ڈاکٹر ابو محمد سحر: ''۱۸۸۹ء میں انھوں (امیر) نے لغت کی تالیف کے لیے ایک دفتر قائم کیا'' ۱۹ لیکن مطبوعہ مکاتیب کی داخلی شہادت سے پتا چلتا ہے کہ دفتر ۱۸۸۸ء کی آخری سہ ماہی میں قائم ہو چکا تھا۔ ۹ دسمبر ۱۸۸ء کو حبیب الرحمان خاں شیروانی کو لکھتے ہیں:

> ''اہل الرائے کی رائے کمیٹی میں پیش ہو کر رد و قبول کا فیصلہ ہوگا ابھی دفتر امیر اللغات میں سیکریٹری ان کو جمع کرتا جائے گا۔'' ۲۰

اس کے علاوہ امیر نے مقدمہ امیر اللغات میں تحریر کیا ہے کہ:

> ''سفر سے پلٹنے پر عرش آشیاں نواب محمد مشتاق علی خاں بہادر طالب ثراہ نے باجلاس کونسل ایسی دستگیری فرمائی کہ میں نے رام پور میں امیر اللغات کا دفتر کھول دیا۔'' ۲۱

لغت کے سلسلے میں امیر نے سفر ۱۸۸۸ء ہی میں کیے اس سلسلے میں ممتاز علی آہ رقم طراز ہیں:

> ''۱۸۸۸ء میں ملک کے خیالات دریافت کرنے کو حضرت نے لکھنؤ، بنارس ہوتے ہوئے پٹنے تک سفر کیا۔'' ۲۲

اس کے بعد ''۲۵ فروری ۱۸۸۹ء کو نواب مشتاق علی خاں انتقال کر گئے'' ۲۳ اور امیر شدید مالی پریشانی سے دوچار ہوئے۔ ۳۱ مارچ ۱۸۸۹ء کو کوثر خیر آبادی کو خط تحریر کرتے ہیں اس سے بھرپور تاثر ملتا ہے کہ دفتر قائم ہوئے خاصا وقت گزر چکا ہے۔

> ''دو سو روپے ماہوار دفتر لغت پر صرف ہو رہا ہے۔'' ۲۴

ان حوالوں کے علاوہ ممتاز علی آہ نے امیر اللغات کے دفتر اور امیر کا جو حال متصل بیان کیا ہے اس میں عسر بول کے مرض کی شدت کی طرف اشارہ کیا ہے، مکاتیب کے مطالعے سے پتا چلتا

ہے کہ یہ وہی دور ہے جب دفتر قائم ہوا تھا:

> "اس زمانے میں جامع مسجد کے سامنے چھوٹے نواب والے سرکاری مکانات میں قیام تھا۔ ان میں دیوان خانے اور محل سرائے کے علاوہ اوپر بہت بڑے بڑے کمرے تھے جن میں دفتر امیر اللغات تھا۔ کمروں کے بعد لمبا چوڑا صحن تھا اور نیچے بازار کی دکانیں تھیں۔ عسر بول کے باعث بار بار چوکی پر جانے کی حاجت ہوتی تھی اس ضرورت سے دفتر کے قریب ایک کمرے میں کوٹھے کے صحن میں محل سرا اور دفتر کے بیچ والے کمرے کے پاس (جہاں دن کو آرام فرماتے تھے) اور ایک جگہ محل سرا میں چوکی لگی رہتی تھی اور جاڑوں بھر چوکی سے قریب ایک کونڈے میں کوئلے دہکتے رہتے تھے۔" [۲۵]

اور اس دفتر کے رابطے کا پتا یہ ہے جو "پیامِ یار" ۱۸۹۱ء کے اشتہار میں شائع ہوا۔

> "ممتاز علی آہ، سیکریٹری دفتر امیر اللغات، ریاست رام پور روہیل کھنڈ" [۲۶]

اور امیر نے بھی زاہد حسین زاہد کو ۲۷ مئی ۱۸۹۳ء کے خط میں کم و بیش یہی پتا دیا ہے:

> "منشی امیر احمد، ریاست رام پور، دفتر امیر اللغات" [۲۷]

ڈاکٹر کریم الدین احمد کے مقالے میں دفتر سے متعلق غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

> "پھوس کے چھپر میں دوبارہ دفتر قائم ہو گیا لیکن بساط الٹ گئی۔ جنرل اعظم الدین خاں قتل کر دیے گئے۔" [۲۸]

جبکہ اس بیان سے فوراً پہلے ممتاز علی آہ کا بیان انھوں نے اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے کہ

"عرش آشیاں نواب مشتاق علی خاں نے دو قسطوں میں سولہ ہزار روپیہ قرض دیا۔" [۲۹]

اور ممتاز علی آہ کا بیان پاورقی حاشیے میں دیا ہے" کہ ریاست سے قرض دیے جائیں اور چھپنے کے

بعد کتاب کی قیمت سے رفتہ رفتہ یہ قرض منشی صاحب ادا کریں اس طرح دفتر قائم ہو کر امیر اللغات کی تالیف شروع ہوئی۔" [۳۰] ڈاکٹر صاحب کے بیان کی بنیاد آہ کی تحریر ہے۔ جس میں نہایت واضح الفاظ میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ قرضہ ملنے کے بعد لغت کا کام شروع ہوا اور آہ نے زور دے کر کہا کہ "اس طرح دفتر قائم ہو کر امیر اللغات کی تالیف شروع ہوئی" یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ اس سے پہلے دفتر نہیں تھا۔ ایک قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ "جنرل اعظم الدین خاں کو ۳/ اپریل ۱۸۹۱ء کو قتل کیا گیا" [۳۱] قرض ۱۸۸۸ء کے (اندازاً) وسط میں ملا اور کچھ عرصے میں دفتر قائم ہو گیا۔ اس دوران ایک بڑا عرصہ گزرا جس میں لغت کی پہلی جلد بھی منظرِ عام پر آئی۔ لیکن تحریر سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ پہلا دفتر ختم ہو چکا تھا۔ پھر قرضہ ملتے ہی دوبارہ دفتر قائم ہوا اور جنرل اعظم خاں کا انتقال ہو گیا جو کہ درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۸۸ء کے آخر میں پہلی مرتبہ دفتر چھوٹے نواب صاحب کے سرکاری مکانات میں قائم ہوا، جہاں کم و بیش جون ۱۸۹۶ء تک کام کرتا رہا۔ ۲۵/ جون ۱۸۹۶ء کے امیر کے تحریر کردہ مکتوب بنام زاہد حسین زاہد سے معلوم ہوتا ہے کہ دفتر ختم ہو گیا ہے:

> "میں اس زمانے میں ایک جدید تکلیف پیش آ جانے سے سخت پریشان ہوں عالی شان مکانات سرکاری جو ایک عمر سے میری سکونت گاہ تھے دفعتاً بہ ضرورت سرکاری مجھے خالی کر دینا پڑے جس سے میرا سارا قافلہ پریشان ہو گیا، اولاد و احفاد کہیں ہیں، کہیں اسباب، کہیں کتابیں......" [۳۲]

۱۹/ دسمبر ۱۸۹۷ء کے مکتوب بنام زاہد حسین زاہد سے نئے دفتر کے قائم ہونے کا علم ہوتا ہے:

> "بڑی کوششوں سے خدا خدا کر کے یہ صورت پیدا ہوئی ہے کہ دفتر قائم ہوا اور آگے کام چلے" [۳۳]۔

تو گویا کم و بیش پندرہ ماہ دفتر اپنی اصل کھونے کے بعد دوبارہ ستمبر ۱۸۹۷ء میں قائم ہوا۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے بھی اس کی تصدیق کی ہے (مطالعہ، امیر، ص ۴۴۸) ممتاز علی آہ اس کی تفصیل یہ

بیان کرتے ہیں:

> ''اس وقت پرانی کھنڈ سار میں قیام تھا کیوں کہ سرکاری مکانات جو پہلے رہنے کو ملے تھے وہ قلعے میں آ گئے تھے اور سرکار سے پرانی کھنڈ سار رہنے کو عطا ہوئی تھی۔ یہی جگہ احاطۂ مینائیاں ہوئی، کچھ مختصر معمولی مکانات تھے اور بیچ میں ایک چھوٹا دو پلیا سائبان جس میں دفتر امیر اللغات تھا۔'' ۳۴

یہ دوسرا دفتر امیر کے حیدر آباد روانہ ہوتے (۱۹۰۰ء) تک کام کرتا رہا۔ اس کے بعد کب تک قائم رہا اور دفتر کا کیا حال ہوا؟ اس بارے میں مختلف باتیں سننے میں آئی ہیں اور ایک دو جگہ پڑھنے میں بھی آئی ہیں، مثلاً ڈاکٹر کریم الدین اپنے مقالے میں تحریر کرتے ہیں:

> ''امیر نے لغت کے لیے سولہ ہزار روپے قرض لیا تھا، وہ طلب کیا گیا۔ امیر کے بڑے لڑکے محمد احمد صریر ان دنوں ریاست میں تحصیل دار تھے اور سو روپے تنخواہ پاتے تھے۔ ان کی تنخواہ سے اسّی روپے وضع کر لیے جاتے تھے اور انھیں کل بیس روپے ملتے تھے جس پر ۷۰ افراد کے خاندان کا گزارہ تھا۔ مصیبتوں کا یہ زمانہ کوئی آٹھ برس رہا۔ اس عرصے میں امیر کی قیمتی لائبریری اور وہ تمام ذخیرہ جو انھوں نے ایک عمر صرف کر کے جمع کیا تھا تباہ ہو گیا...... جس کے جو ہاتھ آیا اس نے بیچ دیا۔ اس طرح ان کا زندگی بھر کا اثاثہ تباہ ہو گیا۔'' ۳۵

ڈاکٹر صاحب نے یہ اقتباس کسی حوالے کے بغیر تحریر کیا ہے۔ امیر کے ذخیرے کا اس طرح فروخت ہونا سچائی پر مبنی معلوم نہیں ہوتا، اس لیے کہ رام پور کے نواب اگر ناراض ہو گئے تھے تو امیر کے چاہنے والے ان کے دوست، شاگرد جو نواب یا نواب زادوں سے کم نہ تھے، کیا وہ بھی ناراض ہو گئے تھے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ امیر کی بدقسمتی پر شک نہیں کیا جا سکتا۔ مشکل وقت میں اکثر لوگوں نے امیر اور ان کے لواحقین کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ جناب اسمٰعیل احمد مینائی (بن محمد احمد مینائی

بن امیر مینائی) کہتے ہیں:

> ”کتابوں کی فروخت ہونے کی بھنک پھوپھیوں اور چچا کی زبانی میرے کانوں میں پڑی تھی۔ یہ ٹھیک بات ہے۔ لیکن اس کا ایک پس منظر ہے، جو کم لوگوں کو معلوم ہے۔ ۱۹۰۰ء میں جب دادا (امیر) حیدر آباد دکن چلے گئے تو نواب حامد علی خاں، والد (محمد احمد صریر) سے اس بات پر ناراض ہو گئے کہ تم نے ان کو روکا کیوں نہیں پھر والد صاحب کی نوکری ختم ہو گئی، جائداد ضبط ہو گئی اور کم و بیش تین سال یہ حال ہوا کہ گھر میں دو دن میں مشکل سے ایک وقت چولھا جلتا تھا۔ وہ دن بڑی اذیت کے تھے اور کیوں کہ میرے والد سب سے بڑے تھے اس لیے ان پر بڑی ذمے داری تھی۔ وہ سب کا بہت خیال رکھتے تھے۔“ ۳۶

یہ سوال ابھی تک قائم ہے کہ دفتر امیر اللغات کا کیا بنا؟ اس بارے میں ممتاز علی آہ لکھتے ہیں:

> ”وہ زمانہ زیادہ مالی پریشانی کا میں نے دیکھا۔ مکان میں آگ لگ جانے سے اسباب کے ساتھ غیر مطبوعہ کلام اور کتابیں جل کر خاک سیاہ ہو گئی تھیں۔ افسوس اور قلق سے حضرت کا دل مٹی ہو رہا تھا۔“ ۳۷

آگ لگنے کے عینی شاہد حامد حسن قادری لکھتے ہیں:

> ”۱۸۹۹ء میں آگ لگنا خود مجھے یاد ہے۔ میں رام پور میں حضرت امیر مینائی کے محلے میں ان کے مکانات سے قریب ہی رہتا تھا۔ میرا لڑکپن کا زمانہ تھا آگ ایسے غضب کی تھی کہ اگرچہ مکان آتش زدہ سے میرا مکان فاصلے پر تھا پھر بھی وہاں سے جلے ہوئے کاغذ اڑ کر میرے گھر آتے تھے۔ اس حادثے سے ہم سب پر عجیب ہیبت چھائی ہوئی تھی۔ امیر صاحب اور جلیل صاحب کو دیکھنا اچھی طرح یاد ہے۔“ ۳۸

جناب اسمٰعیل مینائی کہتے ہیں کہ "یہ آگ کھپریل سے لگی تھی جس سے دفتر کی چھت بنی تھی، اس حادثے نے امیر کو سخت پریشان کیا کیوں کہ اس میں ان کے کتاب خانے کا بیشتر حصہ جل گیا تھا" [۳۹] بقیہ کتب اور دفتر کے متعلق، کہتے ہیں:

> "ہمارے گھر کی یہ صورت تھی کہ گھر بہت بڑا تھا، بڑے بڑے کمرے، ان کے آگے دالان پھر کمرے جو بہت دور تک پھیلے ہوئے تھے اس کے قریب اصطبل، گودام اور اسٹور بنے ہوئے تھے جن پر کھپریل کی چھت تھی۔ والد صاحب (صریر) بتاتے تھے کہ یہ کمرے یہ کہہ کر بنائے گئے تھے کہ عارضی ہیں۔ اس میں دفتر امیر اللغات کی الماریاں تھیں جو کہ مقفل تھیں۔ ۱۹۳۵ء کے شروع میں، میں نے اور میرے چچا مسعود مینائی نے انھیں کھولا ان میں بڑی نایاب کتابیں اور کچھ الماریوں میں لغت کے رجسٹر تھے جن میں لفظ و محاورات کی فہرست بنی تھی، صرف امیر کے وہ دیوان جن پر خود امیر کے ہاتھ کی ترمیم تھی میرے نزدیک زیادہ اہم تھے وہ میں گھر لے آیا۔ باقی سب بند کر دیا۔ غالباً ۱۹۳۶ء میں، میں پھر رام پور آیا تو دیکھا کہ دفتر کے دروازے کھلے پڑے ہیں، الماریاں بھی کھلی ہیں اور سب الٹ پلٹ ہو گیا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ شبیر حسین زیدی (چیف منسٹر رام پور) کے آدمی آئے تھے وہ لوگ کچھ چیزیں تلاش کر رہے تھے۔ پھر غالباً ۱۹۳۷ء میں میری شادی تھی اور سارے گھر والے حیدر آباد دکن منتقل ہو رہے تھے۔ گھر کا سارا سامان ہم نے فروخت کیا، نایاب اور قیمتی کتابیں حیدر آباد دکن بھجوائیں۔ اور بقیہ کتابیں جن میں ناول وغیرہ زیادہ تھے وہ سب ایک پبلک لائبریری کو جو غالباً نئی کھلی تھی دے دیے گئے۔ اب گھر اور دفتر کی وہ الماریاں جن میں لغت کے مسودے تھے وہ رہ گئے ـ یہ ـ

> کچھ قریبی عزیز اور بھائی الیاس احمد مینائی کی نگرانی میں دے کر سب لوگ چلے گئے[۴۰]۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ معلوم نہیں اس لیے کہ میں نوکری کی وجہ سے بہت مصروف ہو گیا تھا۔" [۴۱]

ہمارا خیال ہے کہ "دفتر امیر اللغات" زمانے کے نامساعد حالات کی نذر ہو گیا اور لغت کا بقیہ لوازمہ بھی زمانے کے ہاتھوں گم ہو گیا۔ بہت ممکن ہے کسی کتب خانے میں منتشر حالت میں محفوظ ہو۔

(۳)

دفتر قائم کرنے کے بعد امیر نے اسے جدید خطوط پر چلانے کے لیے ذہین عملہ رکھا جس میں زیادہ تر ان کے شاگرد اور رشتے دار تھے، جنھوں نے اچھے اور برے وقت میں امیر کا بھرپور ساتھ دیا۔ دفتر میں عملہ کتنے ارکان پر مشتمل تھا؟ یہ تو تحقیق نہیں ہو سکا البتہ متفرق کتب میں کہیں کہیں کسی رکن کا نام ملتا ہے اور یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ وہ معتمد تھا یا محرر۔

ذیل میں معتمدین اور محررین کے نام اور ماخذات کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

معتمدین

(۱) وسیم خیرآبادی [۴۲]
(۲) منشی لیاقت علی [۴۳]
(۳) ممتاز علی آہ [۴۴]
(۴) جلیل مانک پوری [۴۵]
(۵) منشی لطیف احمد مینائی [۴۶]
(۶) منشی مسعود احمد مینائی [۴۷]
(۷) محمد احمد صریر مینائی [۴۸]
(۸) سید محمد شاہ [۴۹]

یہ کوئی حتمی فہرست نہیں ہے، کیونکہ "دفتر امیر اللغات" گیارہ برس (درمیان میں پندرہ ماہ کے وقفے سے) قائم رہا۔

(۴)

محررین:

(۱) عبدالوہاب خاں دل گیر [۵۰]
(۲) محمد صفدر علی خاں خیال [۵۱]

(۳) واحد علی بسمل [۵۲]
(۴) حسین الدین احمد اثر [۵۳]
(۵) امتیاز احمد خاں [۵۴]
(۶) ثابت علی [۵۵]
(۷) محمد قیام الدین [۵۶]
(۸) خان علی خان [۵۷]
(۹) مہدی علی خان [۵۸]
(۱۰) خورشید احمد مینائی [۵۹]
(۱۱) پنڈت صاحب (نام نامعلوم) [۶۰]
(۱۲) نبی احمد خان [۶۱]
(۱۳) محمد رضا خاں افسر [۶۲]
(۱۴) افضل شاہ افضل [۶۳]
(۱۵) عبدالرزاق جمیل [۶۴]
(۱۶) اصغر علی خاں اصغر [۶۵]

(۵)

امیر نے ''امیر اللغات'' کے لیے ایک مشاورتی کمیٹی تشکیل دی جس کے صدر وہ خود تھے۔ اس کمیٹی کا کام یہ تھا کہ جو لغت تالیف ہو اس کو سن لے اور بحث طلب مسئلے کو حل کرے دو ماہ تک اس کمیٹی نے شب و روز کام کیا اس سے لغت کی تالیف میں سستی آئی، آخر کار یہ فیصلہ ہوا کہ امیر اپنے ہی اجتہاد سے کام لیں۔ پھر بھی اس کمیٹی نے لفظ کی چھان پھٹک، اصولِ تالیف اور دیگر تدوین کے مراحل میں ابتدائی کام مکمل کیا جس کی بدولت تالیفِ لغت کا راستہ متعین ہوا۔ ذیل کے سطور میں ان علمی معاونین کے نام اور مآخذات پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱) مولوی حفیظ اللہ [۶۶]
(۲) مولوی فصیح الزماں خاں فصیح [۶۷]
(۳) منشی عبدالرحمٰن بسمل [۶۸]
(۴) حکیم نعیم الزماں خاں نعیم [۶۹]
(۵) حافظ محمود علی فدا [۷۰]
(۶) منشی محمد احمد صریر [۷۱]

(۶)

مندرجہ بالا اصحاب کے علاوہ کئی اہل زبان ایسے تھے جو کمیٹی میں تو شامل نہیں تھے مگر امیر کی علمی معاونت کرتے تھے۔ مکاتیب میں تین نمایاں نام نظر آتے ہیں۔

(۱) زاہد حسین زاہد [۷۲] (۲) حکیم برہم [۷۳] (۳) حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۷۴]۔ ان

معاونین کے کام کی نوعیت کیا تھی؟ اس بارے میں مطبوعہ مکاتیب سے چند اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔ امیر ۳؍جنوری ۱۸۹۵ء کے خط میں زاہد حسین زاہد کو تحریر کرتے ہیں۔

> ''تم سے اگر ممکن ہو تو زبان کی اصلیت کی ابتدا کہاں سے یہ زبان پیدا ہوئی اور کن کن تغیرات کے بعد اس حد کو پہنچی...... چاہتا ہوں کہ امیر اللغات میں یہ بحث..... نہایت شرح و بسط کے ساتھ لکھی جائے۔''
>
> ۵؎

اسی نوعیت کا ایک اور خط ۷؍جون ۱۸۹۲ء کو تحریر کرتے ہیں:

> ''اردو کی تحقیق میں جو کچھ تم نے لکھا اس پر اچھی طرح نظر کروں تو اس کے بعد جواب لکھوں۔'' ۶؎

ایک اور معاون، حکیم برہم کو ۱۹؍اگست ۱۸۹۳ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

> ''آپ نے جو امیر اللغات کو شروع سے آخر تک دیکھا اور اس کی فروگذاشتوں سے مجھ کو مطلع کیا میں اس کا شکر گزار ہوں۔'' ۷؎

حبیب الرحمان خان شروانی کو مورخہ ۱۹؍اپریل ۱۸۸۹ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

> ''آپ گھڑی دو گھڑی روز ادھر بھی توجہ رکھیں تو آپ کی جواں فکر ضرور عمدہ باتیں پیدا کرے گی اصول جو خیال میں آیا کریں ان کو ضبط کرتے جایئے اور مجھے لکھتے جایئے۔'' ۸؎

کارکنانِ دفتر، معاونین لغت اور بیرونی علمی معاونین میں ایک قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ ان میں بیشتر امیر کے شاگرد ہیں یا پھر عزیز و اقارب تھے، لوگوں کو اس قسم کی باتیں کرتے سنا گیا کہ کیا رام پور میں یا ملک میں اور اہلِ قلم موجود نہیں تھے؟ یا امیر نے ان سے تعاون مانگا اور انھوں نے مدد نہ کی۔ ممکن ہے اس قسم کی باتیں امیر کے سننے میں بھی آئی ہوں، وہ زاہد حسین کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں۔

> ”میں نے بہت دنوں ملک کی رائے پر کام کرنا چاہا مگر باہم راویوں کا اختلاف اس قدر ہوا کہ عاجز آ گیا۔ چند نازک خیال اور عالی دماغ احباب نے یہی رائے دی کہ ان جھگڑوں میں لغت تالیف سے رہ جائے گی۔ صرف اپنی رائے کو دخل چاہیے۔ ملک سے بہت دنوں صلاح و مشورہ کیا گیا۔ ناچار میں اب اپنی رائے سے کام لیتا ہوں اور جو عزیز یا دوست مدد کرتا ہے اور اپنی کوئی صائب رائے ظاہر کرتا ہے اس کا شکر گزار ہوتا ہوں۔“ [۷۹]

یوں محسوس ہوتا ہے کہ امیر نے شہروں کے جو دورے کیے اور محمد احمد نے بھی اس سلسلے میں جو بھاگ دوڑ کی تھی اس سے امیر کو اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ملک ان کا کتنا ساتھ دے سکتا ہے اس لیے انھوں نے ایسے لوگ کمیٹی میں شامل کیے جو ان کے قریب تر یا تربیت یافتہ تھے بقول ڈاکٹر ابو محمد سحر:

> ”اس کمیٹی کے اکثر ممبر امیر کے عزیز و شاگرد تھے رام پور میں اس وقت اور لوگ بھی تھے جو کمیٹی کے ممبر بننے کے اہل تھے لیکن مؤلف کے ہم خیال اور زیر اثر اصحاب ذی لیاقت کے منتخب کرنے میں جو عملی سہولتیں تھیں ان سے قطع نظر نہیں کی جا سکتی۔“ [۸۰]

یقیناً اس سے امیر کو فائدہ ہوا کیونکہ دفتر اول دن سے مالی مشکلات سے دوچار رہا (جس پر آگے چل کر ہم تفصیل سے بات کریں گے) ایسے میں اگر امیر سے محبت کرنے والے لوگ نہ ہوتے محض تنخواہ دار ملازم یا معاونین میں محض نام و نمود کی خواہش رکھنے والے لوگ ہوتے تو یہ دفتر مزید بحران کا شکار ہوتا اور جتنا کام ہوا اس کی بھی امید نہ ہوتی۔ امیر کے اس فیصلے سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ بہت سارے لوگوں کو امیر سے علمی اور روحانی فیض حاصل کرنے کا موقع بھی ملا، اور امیر کے تلامذہ، ممتاز علی آہ، جلیل مانک پوری، وسیم خیر آبادی، ریاض خیر آبادی اور محمد احمد صریر وغیرہ نے امیر کی صحبت ہی کی بدولت دنیائے ادب میں نہ صرف بڑا نام کمایا بلکہ اپنے استاد کے مسلک ادب کو آگے بڑھانے کی کوشش بھی کی۔

(۷)

امیر نے لغت کی بنیاد بڑے اہتمام اور سوچ وبچار کے بعد ڈالی تھی۔ اصولِ تالیف پر ان کی نگاہ ہمیشہ گہری رہی۔ جن عناصر کو لغت کا حصہ بننا تھا ان کے حصول کے لیے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی اور جن چیزوں سے لغت کو بچانا تھا وہ ابتدا ہی میں رد کر دی گئیں، مثلاً انگریزی الفاظ کے مسئلے کو کمیٹی کی مدد سے بڑی عمدگی سے حل کیا گیا۔ ۲۶ر ستمبر ۱۸۹۱ء کے خط میں اپنے ایک ذہین شاگرد زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں:

> ''کمیٹی میں باتفاق یہ رائے قرار پائی کہ امیر اللغات میں وہی الفاظ انگریزی کے داخل کیے جائیں جن کی جگہ اردو میں کوئی فصیح، مختصر اور ٹھیک ان ہی معنوں میں لفظ موجود نہیں۔'' ۸۱؎

اس طرح وہ زبان کے متعلق تحقیق کر کے سب سے منفرد مواد لغت کے شروع میں دینا چاہتے تھے۔ ۳۰ر جنوری ۱۸۹۱ء کے خط میں زاہد حسین کو رقم طراز ہیں:

> ''زبان کی اصلیت کہ ابتدا کہاں سے ہوئی اور کن کن تغیرات کے بعد اس حد کو پہنچی...... آزاد و صفیر وغیرہ نے لکھا ہے۔ امیر اللغات میں اس کی نقل کر دینے کو جی نہیں چاہتا'' ۸۲؎۔

مندرجہ بالا حوالے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ زبان کے متعلق امیر کا مطالعہ اچھا تھا لیکن جو کچھ لکھا گیا تھا وہ اس سے مطمئن نہیں تھے۔ حالانکہ آزاد نے ''آبِ حیات'' میں اور صفیر نے ''جلوۂ خضر'' میں اس وقت کے معیار سے قابل لحاظ معلومات بہم پہنچائی تھیں لیکن امیر تو ''امیر اللغات'' میں وہی لکھنا چاہتے تھے ''جو کسی صورت نامعتبر نہیں ہوتا'' ۸۳؎۔

دفتر قائم کرنے کے بعد لائحہ عمل کے مطابق کام شروع کیا گیا۔ ''عملی کمیٹی'' کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا بقول اسمٰعیل مینائی:

> ''دفتر میں ہوتا یہ تھا کہ جو طریقہ آج کل کارڈ میکنگ کا ہے وہ (امیر) اس

> کام کو ایک بڑے کاغذ پر کراتے تھے۔ یعنی ایک بڑے کاغذ پر کتابوں سے لفظ نکال کر منتقل کرتے جاتے تھے۔ پھر انھیں دوسرے اہل کار الفبائی طریقے پر لکھتے تھے۔ معتمدین ان کی سند خود اور امیر سے پوچھ کر لکھتے جاتے تھے''۸۴۔

''اس طرح جس قدر لغت تالیف ہوتی تھی وہ شب کو ارکان 'مشیر کمیٹی' سن لیا کرتے تھے'' لیکن یہ طریقہ زیادہ دن نہیں چل سکا مشیروں کے بحث مباحثے کا یہ نتیجہ ہوا کہ لغت کا کام رکنے لگا۔ ایسے میں ''چند نازک خیال اور عالی دماغ احباب نے یہی رائے دی کہ ان جھگڑوں میں لغت تالیف سے رہ جائے گی، صرف اپنی رائے کو دخل دینا چاہیے''۸٦۔ یوں امیر نے اپنے ہی اجتہاد سے کام لیا اور لغت کے کام کو آگے بڑھایا۔

اس فیصلے کے بعد کام نسبتاً آسان ہو گیا۔ اہلکار الفاظ کی فہرست بناتے، معتمدین ترتیب دینے کے بعد سند لکھتے، اور امیر اس کی نظرِ ثانی کرتے تھے۔ جلد مکمل ہونے کے بعد مطبع کی جاتی تھی۔ وہاں کاتب اسے لکھتا تھا۔ اس کی کاپیاں واپس دفتر آتی تھیں اور اصل سے مقابلہ کرنے کے بعد واپس مطبع جاتی تھیں، جہاں چھپائی کا کام ہوتا تھا۔ صاحب مطبع پروف نہیں بھیجا کرتے تھے۔ اس ساری صورتحال کو امیر نے اپنے ایک خط میں تفصیل سے پیش کیا ہے۔ مکتوب بنام حکیم برہم مورخہ ۵؍جون ۱۸۹۲ء میں لکھتے ہیں:

> ''پروف تو دیکھنے کو نہیں ملتا......صرف کاپیاں آتی ہیں، وہ دفتر میں مقابلہ ہو کر واپس جاتی ہیں۔ کاپیوں کو پتھر پر ڈال کر، پروف اتار کر اگر صاحب مطبع بھیجیں تو جب تک پروف واپس نہ جائیں تب تک چھاپنے سے معذوری ہو اور ان کے پتھر گھرے رہیں۔ یہ ہرج کوئی کیوں گوارا کرے گا۔ ہاں کسی مطبع کا بہت بڑا کارخانہ ہو، پتھر بکثرت ہوں تو شاید ایسا ہو سکے''۸۷۔

شاید اسی قباحت کی وجہ سے امیر نے سر الفرڈ لائل کے مشورے پر عمل نہ کیا ہو۔ اس لیے کہ

سر الفرڈ لائل نے نمونہ دیکھنے کے بعد یہ مشورہ دیا تھا کہ:

''ایک دو ورقہ پروف کے طور پر تیار ہو جائے اور قریب قریب دو سو جلدیں اس کی تمام ہندوستان میں گردش کرائی جائیں ایک عمدہ چھاپہ خانہ اس کے واسطے ہو''۸۸۔

لیکن مقدمہ ''امیر اللغات میں امیر لکھتے ہیں کہ:

> ''پروف مشتہر کرنے کی صورت جو سر الفرڈ لائل کی ہدایتوں میں تھی کسی طرح بن نہ پڑی، اس لیے کہ سر الفرڈ لائل کا ارادہ یہ تھا کہ وہ اس کام کو سرکاری کاموں کا ضمیمہ بنائیں مگر اس خیال سے کہ لغت ملک کے لیے ہے میں نے نج کی تحریروں اور اخباروں کے ذریعے سے تالیف کے اہم مسائل کو ملک کے سامنے پیش کیا جس سے ایسے اچھے نتیجے نکلے جو کبھی کسی مصنف یا مؤلف کی خودرائی سے نہیں نکل سکتے''۸۹۔

امیر نے سر الفرڈ لائل کے مشورے پر عمل نہ کرتے ہوئے جو راستہ اپنایا وہ مجبوری تھی امیر جن حالات سے دوچار رہے ان حالات میں مشورے پر عمل کرنا ناممکن تھا، کیوں کہ اس میں ایک باقاعدہ مطبع کا ہونا بے حد ضروری تھا اس کے علاوہ ضروری نہیں تھا کہ لوگ بھی اس سلسلے میں تعاون کرتے، امیر نے جو دورے ملک بھر میں کیے تھے اس سے امیر کو بہ خوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ کس قدر لوگ تعاون کر سکتے ہیں۔ مگر دوسرے یہ کہ ریاست کے یکے بعد دیگر انقلابات بھی اس کام پر اثر انداز ہو رہے تھے۔ اگر واقعی سر الفرڈ لائل کے مشورے پر مکمل عمل ہو جاتا تو امیر اللغات کا مرتبہ مزید بلند ہوتا۔

(۸)

دفتر امیر اللغات نے کم و بیش گیارہ سال کام کیا۔ اس عرصے میں لغت کا کتنا کام ہوا، ذیل میں اسی سلسلے کی معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔

امیر نے نمونۂ امیر اللغات میں اس لغت کو آٹھ جلدوں میں پیش کرنے کا اعلان کیا تھا۔

"فروری ۱۹۸۱ء کے پیامِ یار کے شمارے میں اسی ارادے کا اعادہ کیا گیا" ۹۰ لیکن مسائل اور حالات نے امیر کو سکون نہیں دیا۔ لہٰذا صرف دو حصے طبع ہوئے اور بقیہ منظر عام پر نہیں آ سکے۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں کہ "۱۸۹۵ء میں لغت کا تیسرا حصہ جس میں ب کے لغات تھے تقریباً تیار تھے، لیکن اس کے لیے سرمایہ نہیں تھا" ۹۱ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۹۳ء کے آخر میں یہ حصہ تیار ہو چکا تھا۔ اس لیے کہ جس وقت دوسرا حصہ منظر عام پر آیا تو امیر، زاہد حسین زاہد کو ۱۹ ر مئی ۱۸۹۳ء کے خط میں یہ اطلاع دیتے ہیں کہ "اب حروف (ب) میں حصہ ثالث کی تیاری ہو رہی ہے" ۹۲ ۳۰ ر جون ۸۹۳ء کو زاہد حسین زاہد کو پھر یہ اطلاع دیتے ہیں، کہ "امیر اللغات کا تیسرا حصہ مرتب اور مکمل کیا جاتا ہے" ۹۳۔

اس سے معلوم ہوا کہ ۱۸۹۳ء کے آخر میں لغت مکمل ہو چکی تھی۔ کیوں کہ اس کے بعد ۱۵ ر اپریل ۱۸۹۴ء کے خط میں سید محمد نوح کو تحریر کرتے ہیں۔ "دفتر امیر اللغات بے سرمائیگی سے ابتر ہو گیا، تیسرا حصہ مدت سے تیار ہے، طبع کا سامان بہم نہ پہنچنے سے بستے میں بندھا رکھا ہے۔" ۹۴ ۱۳ ر جون ۱۸۹۴ء کے خط میں زاہد حسین کو بھی لکھتے ہیں۔ "امیر اللغات کی تیسری جلد بعض موانع قویہ سے اب تک نہیں چھپا" ۹۵۔

۱۸۹۴ء کے دونوں خطوط میں یہی تاثر ملتا ہے کہ لغت مکمل ہوئے عرصہ ہو گیا جب کہ نصف سال ۱۸۹۳ء کے خط سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ حصہ آخری مراحل میں ہے ۹۶ اس کے بعد کوئی شک نہیں رہ جاتا کہ ۱۸۹۳ء کے آخر میں حصہ مکمل نہ ہوا۔

۱۸۹۳ء میں تیسرے حصے کے بعد چوتھے اور پانچویں حصے کا کام بھی شروع ہو گیا تھا۔ عرفان عباسی "دبستانِ امیر مینائی" میں ممتاز علی آہ کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "آہ صاحب نے ب کا حصہ پوری طرح تیار کر لیا تھا اور پ و ت کے حصے زیرِ تکمیل تھے۔" ۹۷ آہ کی سوانح میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ انھوں نے ۱۸۹۴ء میں دفتر کو خیر باد کہہ دیا تھا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ۱۸۹۳ء سے بقیہ حصوں پر بھی کام جاری تھا۔ ۳۰ ر ستمبر ۱۸۱۷ء کے زاہد

حسین زاہد کو لکھے گئے خط سے یہ پتا چلتا ہے کہ ان حصوں پر کام جاری تھا اور جولائی ۱۸۹۸ء کے مکتوب تک اس حصے پر کام جاری تھا[۹۸]۔

۱۸۹۶ء کے بعد دفتر ابتری کا شکار ہوا، جس کا اندازہ مکاتیب کے مندرجہ بالا اقتباسات سے ہوتا ہے اس کے علاوہ اس دوران کم و بیش پندرہ ماہ دفتر کا وجود ہی نہیں رہا۔ اس لیے کام میں رکاوٹ ہوئی۔ ۱۸۹۹ء میں جب آہ، رام پور آئے تو لکھتے ہیں کہ ”حضرت تالیف امیر اللغات میں مصروف تھے، تائے فوقانی کے لغات لکھے جاتے تھے“[۹۹]۔ غالباً آہ جو کام چھوڑ کر گئے تھے وہ مکمل ہو چکا تھا۔ یعنی ب، پ، ت کے حصے مکمل ہو چکے تھے۔ صرف طبع ہونا باقی تھے۔

امیر نے ۱۹۰۰ء کے وسط میں حیدر آباد جانے کی تیاری شروع کی اور ماہ ستمبر میں رام پور کو خیر باد کہا، امیر کے نظم و ضبط اور اندازِ تالیف کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے الف سے تائے فوقانی تک لغت کو بالکل مکمل کر لیا ہوگا۔ لیکن مرتب شدہ حصوں میں سے صرف دو حصے شائع ہوئے۔

امیر اللغات کا پہلا حصہ، (الف ممدودہ) ”مارچ ۱۸۹۱ء“[۱۰۰] میں مطبع مفید عام آگرہ“ سے شائع ہوا[۱۰۱]۔ یہ ساڑھے نو ضرب تیرہ کی تقطیع پر لیتھو پر طبع ہوا“[۱۰۲]۔ ”یہ حصہ ۲۰ جزو پر مشتمل ہے“[۱۰۳] جس کے ”۳۱۷ صفحات میں...... تین ہزار لغت“[۱۰۴] ہیں۔

امیر اللغات کا دوسرا حصہ (الف مقصورہ) کا ”نصف اول ۱۵ر ستمبر ۱۸۹۲ء کو چھپنے کے لیے روانہ ہوا“[۱۰۵]۔ ”مئی ۱۸۹۳ء“[۱۰۶]۔ ”اس مطبع سے شائع ہوا۔“[۱۰۷] ”یہ حصہ بھی ساڑھے نو ضرب ۱۳ کی تقطیع پر لیتھو پر طبع ہوا“[۱۰۸]۔ اور ”مثل اول کے ۲۰ جزو میں نکلا[۱۰۹]۔ جو کہ ۳۲۵ صفحے اور ساڑھے تین ہزار لغت پر مشتمل ہے“[۱۱۰]۔

امیر اللغات کے صرف یہی دو حصے طبع ہو کر منظرِ عام پر آئے جن کو اہل علم نے بے حد پسند کیا۔ مشہور ”انگریزی اخبار پانیر میں ۲۶ر مارچ ۱۸۹۱ء کو ڈاکٹر فلپ نے اس پر ایڈیٹوریل تحریر کیا۔“[۱۱۱] اس کے علاوہ ملک کے مشہور رسائل و جرائد مثلاً: اودھ پنچ ۲۳ر اپریل ۱۸۹۱ء اخبار مفید

عام، یکم مئی ۱۸۹۱ء رسالہ قمر مارچ ۱۸۹۲ء نے منصفانہ تبصرے شائع کیے۔ اس کے علاوہ سر سید احمد خاں، منشی محمد نورالحسن، اکبر الہ آبادی، منشی یاسین شفق اور شمس العلما عبدالحق نے امیر کے اس کام کو بے حد سراہا۔ بعد ازاں ۱۸۹۸ء کے لگ بھگ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا اور دونوں حصوں کو یکجا کر دیا گیا۔ ۲۵/اکتوبر ۱۸۹۸ء کے خط میں جلیل، مرزا پرورش کو تحریر کرتے ہیں:

> ''امیر اللغات کی دونوں جلدیں باہم مربوط ہیں''[۱۱۲]۔

اب سوال یہ باقی ہے کہ تائے فوقانی کے بعد کے حصوں کی کیا صورت حال رہی؟ اس بارے میں اسمٰعیل احمد مینائی کہتے ہیں:

> ''امیر نے ایک لحاظ سے کام مکمل کر لیا تھا''[۱۱۳]۔

اور ڈاکٹر کریم الدین احمد کہتے ہیں:

> ''کہا جاتا ہے کہ انھوں نے لغت مکمل کر لیا تھا صرف طبع ہونا باقی تھا''[۱۱۴]

ڈاکٹر صاحب کے بیان میں وزن معلوم نہیں ہوتا کیوں کہ اگر لغت کی یہ صورت ہوتی کہ مکمل ہونے کے بعد صرف طبع ہونا باقی ہوتا تو یہ بات ایسی نہیں تھی کہ پردہ خفاً میں رہتی اس لیے کہ جلیل آخری سانس تک امیر کے ساتھ تھے، انھوں نے امیر کی جو سوانح لکھی اس میں ایسی کوئی اطلاع نہیں ملتی، اس کے علاوہ امیر کے نہایت چہیتے شاگرد ممتاز علی آہ نے جو سوانح لکھی اس میں بھی کوئی تذکرہ اس بات کا نہیں ملتا اور ان دونوں سے پہلے احسن اللہ ثاقب نے ۱۹۱۰ء میں امیر کے مکاتیب مرتب کر کے شائع کیے اور پھر ۱۹۲۴ء میں دوسرا ایڈیشن شائع کیا، ان کے کسی جملے سے یہ بات اخذ نہیں کی جاسکتی ان سب پر مستزاد یہ کہ امیر احمد علوی اور عبدالحکیم حکمت نے امیر کی جو سوانح عمریاں لکھیں ان میں بھی کہیں کوئی ایسی اطلاع نہیں ملتی۔ ہاں البتہ اسمٰعیل مینائی صاحب کی بات میں کچھ وزن ہے۔ اپنے اس بیان کی تشریح انھوں نے یوں کی ہے کہ: ''امیر نے ی تک کے الفاظ کاغذ پر منتقل کر دیے تھے۔ معنی اور سندیں نہیں لکھی گئی تھیں''[۱۱۵] اس وضاحت سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تائے فوقانی کے بعد کے حصوں کو ترتیب دینے اور نظر ثانی کا کام باقی تھا، جو امیر

غالباً دکن سے واپسی پر کرنا چاہتے تھے۔ یوں امیر اللغات کے صرف دو حصے شائع ہوئے، کچھ حصے غیر مطبوعہ اور باقی غیر مرتب رہ گئے۔

لغت کے بقیہ حصے شائع نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ ''دفتر امیر اللغات'' ہمیشہ مشکلات کا شکار رہا۔ پریشانیاں ''نمونہ امیر اللغات'' کے شائع ہوتے ہی شروع ہوگئی تھیں کیونکہ نواب کلبِ علی خاں کے انتقال کر جانے اور سر الفرڈ لائل کے ہندوستان سے چلے جانے سے اس کام کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہیں رہا تھا۔

نواب کلب علی خاں کے بعد نواب مشتاق علی خاں مسند آرا ہوئے۔ انھوں نے امیر کو ۱۸۸۸ء کے وسط میں دو قسطوں میں سولہ ہزار روپیہ قرض دیا۔ جس سے دفتر قائم ہوا۔ ابھی دفتر قائم ہو کر لغت کا کام شروع ہوا ہی تھا کہ ''۲۵ رفروری ۱۸۸۹ء بروز شنبہ کو نواب مشتاق علی خاں انتقال کر گئے'' ۱۶؎ بقول ڈاکٹر کریم الدین احمد:

> ''عرش آشیاں کے انتقال کے بعد حامد علی خاں مسند آرا ہوئے۔ لغت کا کام بند ہو گیا۔ نئے حاکم نے لغت سے اپنی دل چسپی کا اظہار نہ کیا'' ۱۷؎۔

امیر، کوثر خیر آبادی کو ۳۱ رمارچ ۱۸۸۹ء کے ایک خط میں اپنے اور ریاست کے حالات تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''انقلابات و تغیرات جو ریاست میں ہو رہے ہیں وہ اور پریشان کر رہے ہیں سیکڑوں روپے ماہوار کا خرچ اور آمد کچھ نہیں۔ احباب نے جو کچھ کہا وہ نہ کیا'' ۱۸؎۔

ان مشکلات کے باوجود دفتری امور کو خوش اسلوبی سے نبھانے کے لیے امیر اور ان کے معاونین سارا سارا دن مصروف رہتے تھے بقول ممتاز علی آہ: ''دن کو تو فرصت ملتی ہی نہ تھی'' ۱۹؎۔ اس کے علاوہ کام میں حرج کی وجہ سے معاونین امیر کے سامنے دیگر مشاغل پر گفتگو سے گریز کرتے تھے۔ ممتاز علی آہ لکھتے ہیں:

> ''امیر اللغات کے کام میں حرج ہونے کے خیال سے کسی کی ہمت نہ پڑتی

> تھی کہ عرض کرنے، غزل کہنے اور شریکِ مشاعرہ ہونے کی اجازت حاصل کی جائے"[۱۲۰]

اور مصروفیت کا یہی حال امیر کا تھا۔ بقول امیر صبح سے نصف شب تک گویا چوکی ہی پر بیٹھ کر بسر ہوتی"[۱۲۱]۔

۱۸۹۱ء میں بہ مشکل تمام لغت کی جلد اول کا حصہ اول منظرِ عام پر آیا لیکن فروخت کے سلسلے میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ زاہد حسین زاہد کو ۱۷/ اپریل ۱۸۹۱ء کے خط میں تحریر کرتے ہیں:

> "اب تک جو ہزار ہا روپیہ صرف ہوا ہے وہ رائیگاں نہ جائے اور جا لگا ہی ٹھکانے لگے"[۱۲۲]۔

مالی مشکلات کے باوجود دفتر میں پوری تندہی سے کام ہوتا رہا۔ جس سے دفتر پر قرضہ بڑھتا گیا امیر ۲۶/ جولائی ۱۸۹۲ء کے خط میں داغ کو دفتر کے خرچ سے متعلق لکھتے ہیں:

> "پانسو روپے ماہوار کا خرچ اور دو سو کی آمدنی ہے"[۱۲۳]۔

۱۸۹۳ء میں جلد اول کا دوسرا حصہ منظرِ عام پر آ گیا۔ لیکن نہ دفتر کے مصارف کم ہوئے، نہ ہی آمدنی بڑھی ان سب مشکلات میں ایک اضافہ یہ بھی ہوا کہ جو لغت شائع ہوگئی تھی ان کی فروخت بھی قابلِ اطمینان نہیں تھی۔

اس سلسلے میں ایک غیر مطبوعہ خط سے اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ یہ مکتوب ۲۴/ اکتوبر ۱۸۹۳ء کا ہے:

> "لغت میں ہزاروں روپے کی قرض داری ہوگئی۔ ایک جلد نہیں بکتی، فکر کھائے جاتی ہے یہ قرض کس کے گنج سے ادا کیا جائے اور پھر تھوڑے نہیں، پندرہ سولہ ہزار اور آگے کی تالیف بند ہوتی جاتی ہے"[۱۲۴]

دفتر کی ابتری کو سنبھالا دینے کے لیے امیر ۱۸۹۴ء میں مختلف شہروں کے سفر کا ارادہ کرتے ہیں تا کہ کچھ امداد حاصل کی جائے۔ لیکن عوارض لازمہ کی وجہ سے ارادہ ملتوی کر دینا پڑتا ہے پھر وہ

رام پور میں رہ کر نوابین سے دفتری امور کے لیے امداد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اس کام میں ناکامی ہوتی ہے۔

دفتر کی ابتری کا اندازہ معتمد امیر اللغات ممتاز علی آہ کے اس خط (غیر مطبوعہ) کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے جو ۱۸۹۴ء میں مولوی محمد حسین کو لکھا گیا۔

> ''لغت کا ابتدائی حال تو حصہ اول کے دیباچے سے معلوم ہوگا اس کے بعد اس قدر اور ہے کہ سوا ریاست عالیہ بھوپال کے اور کسی ریاست نے کچھ بھی امداد نہیں کی اس ریاست سے اور بھی قرضہ ملا تھا وہ بھی ختم ہو گیا پبلک نے بھی کچھ قدر نہیں کی نتیجہ یہ ہے کہ پندرہ ہزار روپے ریاست کا اس کتاب کی بدولت منشی صاحب پر قرض ہو گیا۔ کام آئندہ کے لیے گویا بند ہے۔ نہ کتابیں بکتی ہیں نہ کوئی رئیس یا گورنمنٹ فراخ حوصلگی کو کام میں لاتے ہیں'' ۱۲۵۔

دفتر کا یہ حال دیکھ کر کچھ احباب نے امیر کو یہ مشورہ دیا کہ آئندہ طبع ہونے والی لغت کی فروخت کے لیے پیشگی قیمت حاصل کی جائے۔ لیکن امیر نے احباب کی اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ: ''پیشگی قیمت حاصل کرنے کے واسطے اشتہار دینے کی صورت امیر اللغات کی شان پر نہایت بدنما داغ ہے'' ۱۲۶۔

جون ۱۸۹۶ء میں ایک نئی پریشانی کے سبب دفتر بند ہو جاتا ہے (جس کا ذکر گزشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے)۔

اور یہ دفتر کم و بیش ڈیڑھ سال بند رہا۔ اس دوران امیر نے مالی امداد کے لیے ایک درخواست گورنر جنرل بہادر کو بھیجی۔ اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ سیکریٹری نے جواب میں لکھا کہ ''یہ درخواست لفٹیننٹ کے ذریعے سے آنا چاہیے'' ۱۲۷ سیکریٹری کے جواب کے مطابق درخواست لفٹیننٹ کو بھیجی گئی۔ وہاں سے اس ہدایت کے ساتھ واپس کی گئی تھی کہ لوکل گورنمنٹ کے ذریعے سے

درخواست آنا چاہیے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا[۱۲۸] لیکن اس طرح بھی ناکامی ہوئی۔

دفتر کی ابتری روز بروز بڑھتی جارہی تھی۔ ان حالات سے پریشان ہوکر امیر نے حیدرآباد کا قصد کیا۔ دورانِ سفر وہ کانپور میں چار پانچ دن قیام کے بعد بھوپال روانہ ہوئے جہاں دو ماہ قیام کیا۔ اس دوران نواب شاہ جہاں بیگم نے امیر کو ملاقات کا شرف بخشا اور بھوپال میں رہ جانے کا اصرار کیا امیر نے ''حسب موقع اور مناسب وقت الفاظ میں اس وقت معذوری کی اور رخصت ہوئے[۱۲۹]۔ بھوپال ہی میں چھٹی ختم ہوجانے کی وجہ سے وہ حیدرآباد نہ جاسکے اور رام پور واپس آگئے۔

پریشانیاں بدستور رہیں۔ والی رام پور نے جو وعدے کیے تھے وہ پورے نہ کیے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ امیر نے یہ کام بھی نوابین کی مرضی ہی سے شروع کیا تھا اور اگر مکمل ہوجاتا تو ریاست ہی کی نیک نامی تھی۔ لیکن اس سلسلے میں ریاست سے کوئی احسان ہوا بھی تو یہ کہ قرض دیا گیا تاکہ لغت فروخت کرکے رقم واپس کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ امیر نے حقِ نمک خوب نبھایا۔

۱۱/اگست ۱۸۹۷ء کے خط میں زاہد حسین زاہد کو لکھتے ہیں:

> ''امیراللغات کی ابتری بدستور ہے فی الحقیقت اس کے پورا نہ ہونے سے جس قدر افسوس کیا جائے کم ہے۔ حضور پرنور والی رام پور نے، جب میں سفر کے لیے رخصت ہوتا تھا اس کے تکمیل پر اپنی آمادگی اور پوری خواہش ظاہر فرمائی تھی بلکہ قرار پاگیا تھا کہ سفر سے میری مراجعت پر دفتر کھول دیا جائے گا مگر آئے قریب دو مہینے کے گزرے اب تک کچھ نہیں ہوا''[۱۳۰]۔

کچھ عرصے بعد دفتر کھول دیا گیا لیکن مالی دشواری میں کوئی کمی نہ آئی۔ ۱۸۹۹ء میں دفتر میں آگ لگ جانے کے سبب ہزاروں کا نقصان ہوا جس میں ایک بہترین لائبریری جو دفتری امور کے لیے تھی جل گئی۔ ناچار امیر نے حیدرآباد دکن جانے کی تیاری شروع کی اور ۱۹۰۰ء کے وسط میں انھوں نے سفر کیا۔ حیدرآباد دکن پہنچ کر ان کی زندگی نے وفا نہیں کی اور دفتراللغات کا کام

ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

(۱۰)

امیر اللغات کا پہلا حصہ (الف ممدودہ) مارچ ۱۸۹۱ء میں اور دوسرا حصہ (الف مقصورہ) مئی ۱۸۹۳ء کو منظرِ عام پر آیا تو ان کی قیمت ''ولایتی کاغذ پر سات روپے اور دیسی کاغذ پر چھے روپے تھی'' ۱۳۱۔

دفتر امیر اللغات میں لغت کے علاوہ امیر کی کتب بھی فروخت کی جاتی تھیں اور یہ سارے امور معتمدین نپٹاتے تھے۔ مکاتیب سے اندازہ ہوتا ہے کہ کاروباری اصول بہت لچک دار تھے اور عموماً بدلتے رہتے تھے۔ البتہ لغت کی قیمتوں میں آخر تک کوئی کمی نہیں ہوئی۔ مثلاً محمود مسعود ۲۲/ اپریل ۱۸۹۶ء کو ایک خط کے ذریعے منشی محمد حسن تاجر کتب کو مطلع کرتے ہیں:

> ''امیر اللغات اور صنم خانۂ عشق کے تاجرانہ خریداروں کو، اگر سو سو نسخے لیں تو پانچ پانچ نسخے بلا قیمت دیے جائیں گے اور محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا'' ۱۳۲۔

اسی تاجر کو ستمبر ۱۸۹۸ء میں جلیل تحریر کرتے ہیں:

> ''کمیشن کا قاعدہ یہاں یہ رکھا گیا ہے کہ ۲۰ جلدوں کا جو یک مشت خریدار ہو اس کے ساتھ بہ حساب فی صد دس روپے رعایت کی جائے گی'' ۱۳۳۔

۱۹/ اکتوبر ۱۸۹۸ء کو پھر کاروباری شرائط میں تبدیلی کی جاتی ہے کہ جو سو روپے کی کتاب خریدے، اس سے محصول ڈاک نہ لیا جائے۔ سید سراج الدین کو تحریر کرتے ہیں:

''صرف ان تجار کو تخفیف دی جاتی ہے جو یکمشت سو روپے کی کتابیں خریدیں۔ اتنی رعایت آپ کے ساتھ بھی کی گئی ہے کہ محصول ڈاک نہ لی جائے'' ۱۳۴۔

متفرق خریداروں کو رعایت دینے کا کوئی قاعدہ نہیں تھا لیکن اگر کوئی مختلف اوقات میں کتب خریدے تو کسی ایک موقعے پر اس کو رعایت دی جاتی تھی۔

۱۸۹۸ء میں ان حصوں کو دوبارہ طبع کیا گیا لیکن قیمت میں کوئی کمی بیشی نہیں کی گئی۔

جلیل، منیجر اخبار عام کو ۲۰ ر ستمبر ۱۸۹۸ء کے خط میں رقم طراز ہیں:

> ''امیر اللغات، یہ اردو کی جامع اور بے مثل لغت لکھنؤ و دہلی کے محاورات و اصطلاحات و مفردات و مرکبات کا خزانہ ہے ابھی دو ہی جلدیں چھپی ہیں فی جلد ۶ روپے''۱۳۵ـ

دفتری شرائط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امیر واقعتاً لغت سے کوئی کاروباری فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے تھے بلکہ وہ حقیقی معنوں میں زبان کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔

امیر پر شاعری کے حوالے سے اکثر ناقدین الزام لگاتے ہیں کہ وہ داغ کی تقلید کرتے تھے۔ یا ان کی شاعری میں کشش نہیں ہے۔ لیکن لغت نویسی کے باب میں یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ وہ جدید اردو لغت نویسی کے بانی ہیں۔ انھوں نے پہلی مرتبہ اردو لغت نویسی کو ایک باقاعدہ منظم سائنٹیفک نظام سے روشناس کرایا۔ اور ایک منظم لائحہ عمل کے تحت دفتر امیر اللغات کی بنیاد ڈالی۔

یہ پہلی لغت ہے جس کی ترتیب میں مؤلف کے علاوہ دیگر زبانوں کے لائق فائق علماء کا تعاون بھی حاصل کیا گیا اور پھر مسودہ تیار ہونے کے بعد ان علما کو نظر ثانی کی دعوت دی جاتی تھی۔ گو کہ اس نظام میں بوجوہ امیر کو بعد میں لچک پیدا کرنا پڑی۔

امیر اللغات دفتری اخراجات، وسائل پوری طرح مہیا نہ ہو سکنے کی وجہ سے مکمل نہیں ہو سکا لیکن اردو لغت نویسی کے باب میں یہ ایک جامع لغت کا خاکہ ضرور پیش کرتا ہے۔

آج ''اردو ڈکشنری بورڈ'' لغت نویسی کے جس نہج پر کام کر رہا ہے وہ یقیناً ایک نہایت ترقی یافتہ نظام ہے جس کو آکسفورڈ ڈکشنری کے منظم طریقے پر قائم کیا گیا ہے۔ امیر اللغات کے دفتر میں اس نظم و ترتیب اور اصول و قواعد کی ایک جھلک ایک صدی پہلے نظر آتی ہے۔ اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ امیر اللغات اس کا نقشِ اول معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ نقشِ ثانی نقشِ اول سے بہتر

ہے۔ اگر امیر اللغات امیر کے قائم کیے گئے نظام کے تحت مرتب ہو جاتی تو اردو کی پہلی سائنٹیفک لغات ہوتی۔

☆☆☆☆

ضمیمہ:

آخر میں معتمدینِ دفتر امیر اللغات کے چند غیر مطبوعہ مکتوبات پیش کیے جاتے ہیں، جن میں وہ دفتر امیر اللغات کے کاموں میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ یہ غیر مطبوعہ خطوط دفتر امیر اللغات کے اس ریکارڈ سے اخذ کیے گئے ہیں جو سات دفتروں (رجسٹروں) کی شکل میں محفوظ ہیں اور ان کا تعارف پیش تر آ چکا ہے۔

۱۔ مکتوب محمد ممتاز علی آہ: بعالی خدمت جناب منشی امبکا پرشاد صاحب اسسٹنٹ انسپکٹر سررشتۂ تعلیم اودھ، گنیش گنج لکھنؤ۔

دفتر امیر اللغات، رام پور۔ ۱۰؍ اگست، ۱۹[۱۸]ء

جنابِ من! کچھ عرصہ ہوا میرے ماموں حافظ محمد محمود علی نے امیر اللغات کے بارے میں ایک نیاز نامہ مع اشتہار حصۂ اول خدمتِ عالی میں بھیجا تھا اور اس کا جواب آپ نے اسی قدر دانی اور ہمدردی سے لطف فرمایا تھا جیسا کہ آپ سے علم دوست پر بھروسا تھا۔

اب میں ایک کاپی اس کی بغرض ملاحظہ خدمتِ عالی میں بھیجتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ آپ کی توجہ اور سعی سے تعلیم میں بہ منظوری صاحب ڈائریکٹر بہادر، اس کتاب کی صدہا جلدیں خریدی جائیں گی اور ان ہی قدر دانیوں اور اسی ہمدردی سے یہ کتاب اختتام کو پہنچے گی جس کے نہ صرف حضرتِ مؤلف مدظلہ العالی ممنون ہوں گے بلکہ ملک اور زبان پر بڑا احسان ہوگا۔

اس باب میں مجھے آپ سے کچھ زیادہ عرض کرنا حکمتِ بلقمان آموختن ہے۔ البتہ اتنا اور اطلاعاً گزارش کروں گا کہ صاحب ڈائریکٹر بہادر نے اشتہار ملاحظہ فرمانے پر اس کی جلد خرید فرمائی ہے۔ فقط

آپ کا ادنیٰ خادم: **محمد ممتاز علی**، سیکریٹری۔

۲۔ مکتوب محمد مسعود احمد: بنام منشی **محمد حسن** تاجر کتب ۲۲؍اپریل ۱۸۹۶ء

جنابِ من! تسلیم۔ کارڈ جواب طلب آیا، ممنون کیا۔ جواب ملاحظہ ہو۔

محمد مسعود احمد از ریاستِ رام پور۔

○ امیر اللغات حصہ اول ۳۱۷ صفحے، امیر اللغات حصہ دوم ۳۲۵ صفحے، الف ممدودہ تین ہزار لغت، الف ممدودہ (مقصورہ) ساڑھے تین ہزار لغت

○ دیوان دوم موسوم بہ صنم خانۂ عشق ۳۶۴ صفحے، خیابانِ آفرینش میلاد شریف مع دیوان نعت ۲۷۲ صفحے۔

○ امیر اللغات اور صنم خانۂ عشق کے تاجرانہ خریداروں کو، اگر سو سو نسخے لیں، تو پانچ پانچ نسخے بلا قیمت دیے جائیں گے اور محصول ہر کتاب کا بذمہ خریدار ہوگا۔

۳۔ مکتوب جلیل حسن: بنام مینیجر صاحب اخبار عام لاہور ۱۰؍ستمبر ۱۸۹۸ء از دفتر امیر اللغات رام پور اسٹیٹ۔

جناب بندہ! تسلیم و نیاز۔ اخبار عام ہفتہ وار کا نمونہ مرحمت ہو اور یہ ارشاد ہو کہ اشتہار مندرجہ ذیل اخبار مذکور میں چار مرتبہ چھپنے کے لیے کس قدر اجرت درکار ہوگی۔

جلیل حسن سیکریٹری

تصانیف ملک الشعرا حضرت امیر مینائی لکھنوی

امیر اللغات، یہ اردو کی جامع اور بے مثل لغت لکھنؤ و دہلی کے محاورات و اصطلاحات و مفردات و مرکبات کا خزانہ ہے۔ ابھی دو ہی جلدیں چھپی ہیں۔ فی جلد ۶ روپے۔ صنم خانۂ عشق نیا دیوان، رنگ میں ڈوبا ہوا، ایک ایک شعر پر میری شاعری قربان ہے، قیمت دو روپے۔

المشتہر: جلیل حسن جلیل سیکریٹری دفتر امیر اللغات رام پور مراد آباد۔ سرخ روشنائی سے جو

کچھ لکھا گیا ہے یہ جلی قلم سے لکھا جائے گا اور اشعار خوب صحیح، واضح اور اشتہاروں سے علیحدہ، مضامین کے درمیان جگہ دی جائے گی۔

☆☆☆☆

۴۔ مکتوب لطیف احمد مینائی: بنام منشی محمد عسکری وسیم، مالک گل چیں خیرآباد۔

۱۵/ اکتوبر ۱۸۹۸ء۔ رام پور، دفتر امیر اللغات۔

مکرمِ برادران زاد عنایتکم! سلام مسنون

میں ایک ضرورت سے لکھنؤ گیا تھا۔ جی چاہا کہ آپ سے بھی ملوں، مگر کوٹھے میں دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ آپ خیرآباد تشریف لے گئے ہیں۔ اکثر آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے، اہل دفتر بھی آپ کو یاد کرتے ہیں اور آپ کا ذکر خیر رہتا ہے۔ اس زمانے میں حضور پرنور دام ملکہم واقبالہم نے تھوڑی سی توجہ امیر اللغات کی جانب دی ہے۔ دفتر میں ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ میرا قصد ہوا میں آپ کے واسطے تحریک کروں مگر قبل اس کے کہ آپ کا خیال دریافت کروں، تحریک مناسب نہ سمجھا۔ اب بذریعہ تحریر آپ کو اطلاع دے کر آپ کا خیال دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ جہاں تک میرا علم ہے گل چیں کی حالت تو اچھی اور قابل اطمینان ہے نہیں۔ اس لیے خیال ہوا کہ آپ کسی دوسرے مشغلے کو ترجیح دیں اور غالباً آپ کو یہاں دلچسپی بھی حالت موجودہ سے زیادہ ہوگی۔ آپ اپنے خیال سے مفصل مجھے بہ واپسی ڈاک اطلاع دیں تاکہ قبل کسی دوسرے بندوبست کے، میں کارروائی کرسکوں۔ اور بھی چند صاحب شرکت دفتر کے لیے متحرک ہیں مگر جی چاہتا ہے کہ آپ سے یکجائی ہوتی۔ تکملہ سخن یہ ہے کہ اپنے خیال سے جیسا کچھ منظور ہو صاف صاف آگاہ کیجیے گا تاکہ الجھن باقی نہ رہے اور معاملے میں تاخیر (نہ) ہو۔ یہاں سب ماوجب رساں ہیں۔ فقط، لطیف احمد مینائی

(مشمولہ ”تحقیق“، جام شورو، شمارہ ۴، ۱۹۹۰ء)

حواشی:

۱۔ ڈاکٹر کریم الدین احمد: مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی: ”امیر مینائی اور ان کے تلامذہ“ لاہور،

آئینۂ ادب، ۱۹۸۲ء

۲۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر: مطبوعہ مقالہ برائے پی ایچ ڈی، ''مطالعۂ امیر''، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۴ء

۳۔ حکیم نجم الغنی خاں: ''اخبار الصنادید''، لکھنؤ، مطبع نول کشور، ۱۹۱۸ء، ص ۱۶۸۔

۴۔ امیر احمد علوی: ''طرۂ امیر''، لکھنؤ، انوار المطابع، ۱۹۲۸ء، ص ۵۹۔

۵۔ عرفان عباسی: ''دبستان امیر مینائی''، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۵ء، ص ۱۲۔

۶۔ شاہ ممتاز علی آہ: ''امیر مینائی''، لکھنؤ، ادبی پریس، ۱۹۴۱ء، ص ۱۱۲۔

۷۔ امیر مینائی: ''نمونۂ امیر اللغات'' بحوالہ ڈاکٹر ابو محمد سحر، مطالعۂ امیر، ص ۲۱۔

۸۔ ایضاً، ص ۴۲۳۔

۹۔ ''امیر مینائی''، ص ۱۱۲۔

۱۰۔ امیر مینائی: ''مقدمہ امیر اللغات'' لاہور، مقبول اکیڈمی، ۱۹۸۸ء، ص ت۔

۱۱۔ امیر مینائی، ''مکاتیب امیر مینائی'' مرتب احسن اللہ ثاقب، طبع دوم، لکھنؤ، مطبع ادبیہ، ۱۹۲۴ء، ص ۳۲۱۔

۱۲۔ ''مطالعہ امیر''، ص ۴۲۱۔

۱۳۔ ''مقدمہ امیر اللغات''، ص ۳۔

۱۴۔ ''مکاتیب امیر مینائی، ص ۳۲۸۔

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۲۹۔

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۳۷۔

۱۷۔ ایضاً، ص ۲۸۸۔

۱۸۔ ''مطالعہ امیر''، ص ۴۲۰۔

۱۹۔ ''مطالعہ امیر''، ص ۴۲۴۔

۲۰۔ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۲۸۸۔

۲۱۔ ‘‘امیر اللغات’’، ص ۳۔

۲۲۔ ‘‘امیر مینائی’’، ص ۱۱۲۔

۲۳۔ ‘‘اخبار الصنادید’’ ص ۲۹۷۔

۲۴۔ ‘‘مکاتیب امیر مینائی’’ ص ۱۴۴۔

۲۵۔ ‘‘امیر مینائی’’، ۱۴۔

۲۶۔ پیام یار ۱۸۹۱ء، بحوالہ ‘‘امیر مینائی اور ان کے تلامذہ’’، ص ۴۴۶۔

۲۷۔ ‘‘مکاتیب امیر مینائی’’، ص ۱۸۵۔

۲۸۔ ‘‘امیر مینائی اور ان کے تلامذہ’’، ص ۴۴۸۔

۲۹۔ ایضاً۔

۳۰۔ ایضاً

۳۱۔ حکیم نجم الغنی ‘‘اخبار الصنادید’’، ص ۳۲۱۔

۳۲۔ ‘‘مکاتیب امیر مینائی’’، ص ۱۲۸۔

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۲۷۔

۳۔ ‘‘امیر مینائی’’، ص ۱۱۱

۳۵۔ ‘‘امیر مینائی اور ان کے تلامذہ’’، ص ۲۵۔

۳۶۔ دوران گفتگو جناب اسمٰعیل احمد مینائی، مقیم کراچی نے بتایا۔

۳۷۔ ‘‘امیر مینائی’’، ص ۱۱۲۔

۳۸۔ حامد حسن قادری: ‘‘داستان تاریخ اردو’’، طبع سوم، سندھ، اردو اکیڈمی، ۱۹۶۱ء، ص ۴۰۰۔

۳۹۔ دوران گفتگو جناب اسمٰعیل احمد مینائی نے بتایا۔

۴۰۔ جناب اسمٰعیل احمد مینائی نے بتایا کہ: ‘‘الیاس احمد مینائی میرے چھوٹے بھائی ہیں، آج کل حیدر آباد دکن

میں رہتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا، گرنے سے کولھے کی ہڈی ٹوٹ جانے کے سبب تقریباً معذور ہیں۔"

۴۱۔ ایضاً

۴۲۔ دیکھیے: "امیر مینائی" ص ۹۵۔ "مطالعۂ امیر" ص ۴۲۵۔ "دبستان امیر مینائی" ص ۳۸۲ تا ۳۸۴۔

۴۳۔ دیکھیے: "امیر مینائی" ص ۱۴۰، "مکاتیب امیر مینائی" ص ۲۸۷۔

۴۴۔ دیکھیے "امیر مینائی" ص ۱۰، ۲۱۔ "دبستان امیر مینائی"، ص ۸۰ تا ۸۴۔

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۴۱ تا ۱۴۵۔ "مطالعہ امیر" (پاورقی حواشی) ص ۴۳۵۔

۴۶۔ دیکھیے "دبستان امیر مینائی" ص ۴۵ تا ۴۷۔ "سوانح امیر مینائی" از جلیل مانک پوری، حیدر آباد، مطبع سیدی ۱۳۴۷ھ، ص ۷۷۔

۴۷۔ ایضاً، ص ۸۰۔ "دبستان امیر مینائی" ص ۲۶۷۔

۴۸۔ ایضاً، ص ۲۵۵۔

۴۹۔ دیکھیے "تذکرہ کاملان رام پور" از حافظ احمد علی خاں شوق، پٹنہ، خدا بخش لائبریری جرنل، نمبر ۳۳، ۳۵، ۱۹۸۵ء، ص ۲۵۷

۵۰۔ دیکھیے "خم خانۂ جاوید" جلد سوم از لالہ سری رام، طبع اول، دہلی، مخزن پریس، ۱۹۰۸ء، ص ۲۰۰۔

۵۱۔ ایضاً۔

۵۲ دیکھیے "دبستان امیر مینائی" ص ۱۰۷۔

۵۳۔ ایضاً، ص ۳۴۔

۵۴۔ ایضاً، ص ۱۸۶۔

۵۵۔ دیکھیے: ’’مکاتیب امیر مینائی‘‘ ص ۲۸۷۔ ’’امیر مینائی‘‘ ص ۱۴۰۔

۵٦۔ دیکھیے: ’’دبستان امیر مینائی‘‘ ص ۸۹۔ ’’مکاتیب امیر مینائی‘‘ ص ۱۳۰۔

۵۷۔ ایضاً، ص ۲۸۷۔

۵۸۔ دیکھیے ’’دبستان امیر مینائی‘‘ ص ۳۴۹۔

۵۹۔ دیکھیے ’’سوانح امیر‘‘ ص ۷٦۔

٦۰۔ دیکھیے ’’مکاتیب امیر مینائی‘‘ ص ۷٦۔ راقم کا مضمون ’’افادات امیر‘‘ مشمولہ رسالہ، ’’تحقیق‘‘ شعبۂ اردو، جامعہ سندھ، ۱۹۸۹ء، ص ۳۷۸۔

٦۱۔ دیکھیے پاورقی حواشی ’’مطالعۂ امیر‘‘ ص ۴۲۵۔

٦۲۔ دیکھیے ’’تذکرہ کاملان رام پور‘‘، ص ۳۴۷۔

٦۳۔ دیکھیے ’’خم خانہ جاوید‘‘ ص ۳٦۱۔

٦۴۔ دیکھیے پاورقی حواشی: ’’مطالعۂ امیر‘‘ ص ۴۲۵۔

٦۵۔ دیکھیے ’’دبستان امیر مینائی‘‘ ص ٦۵۔

٦٦۔ دیکھیے ’’مطالعۂ امیر‘‘ ص ۴۲۴۔

٦۷۔ دیکھیے ’’دبستان امیر مینائی‘‘ ص ۲۹۲۔

٦۸۔ دیکھیے ’’خم خانۂ جاوید‘‘ جلد اول، ص ۵۸٦۔

٦۹۔ دیکھیے ’’دبستان امیر مینائی‘‘، ص ۳٦٦۔

۷۰۔ ایضاً، ص ۲۸۹۔

۷۱۔ دیکھیے ’’امیر مینائی‘‘، ص ۱۱۳۔

۷۲۔ دیکھیے: ’’دبستان امیر مینائی‘‘، ص ۷٦!۔

۷۳۔ ایضاً، ص ۹۳۔

۷۴۔ ایضاً، ص ۱۵۱۔

۷۵۔ دیکھیے ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۷۱۔ ۱۷۲۔

۷۶۔ ایضاً، ۱۷۶۔

۷۷۔ ایضاً، ۱۳۷۔

۷۸۔ ایضاً: ص ۲۲۔

۷۹۔ ایضاً: ص ۱۷۶۔

۸۰۔ ''مطالعۂ امیر''، ص ۴۲۵۔

۸۱۔ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۶۹۔

۸۲۔ ایضاً: ص ۱۷۱۔

۸۳۔ ایضاً: ص ۲۰۱۔

۸۴۔ دوران گفتگو جناب اسمٰعیل احمد مینائی نے بتایا۔

۸۵۔ ''امیر مینائی'' ص ۱۱۴۔

۸۶۔ ''مکاتیب امیر مینائی'' ص ۱۷۶۔

۸۷۔ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۰۹۔

۸۸۔ ''مقدمہ امیر اللغات''، ص ۳۔

۸۹۔ ایضاً

۹۰۔ ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ''، ص ۴۵۰۔

۹۱۔ ''مطالعہ امیر'' ص ۴۱۶۔

۹۲۔ ''مکاتیب امیر مینائی'' ص ۸۴۔

۹۳۔ ایضاً، ص ۱۸۷۔

۹۴۔ ایضاً، ص ۲۶۵۔

۹۵۔ ایضاً، ص ۱۹۸۔

۹۶۔ ''دبستان امیر مینائی'' ص ۸۳۔

۹۷۔ ''مکاتیب امیر مینائی'' ص ۲۳۹۔

۹۸۔ ایضاً، ۲۳۲۔

۹۹۔ ''امیر مینائی''، ص ۱۱۴۔

۱۰۰۔ ''مکاتیب امیر مینائی''، ص ۱۰۸۔

۱۰۱۔ ''مطالعہ امیر'' ص ۴۱۶۔

۱۰۲۔ ایضاً۔ ص ۴۲۱۔

۱۰۳۔ ''مکاتیب امیر مینائی'' ص ۱۸۴۔

۱۰۴۔ غیر مطبوعہ خط: بنام منشی محمد حسن از محمد مسعود، ۲۲ اپریل ۱۸۹۶ء

۱۰۵۔ ''مکاتیب امیر مینائی'' ص ۱۷۲۔

۱۰۶۔ ایضاً۔

۱۰۷۔ ''مطالعۂ امیر'' ص ۴۱۶۔

۱۰۸۔ ایضاً، ص ۴۲۱۔

۱۰۹۔ ''مکاتیب امیر مینائی'' ص ۱۸۴۔

۱۱۰۔ غیر مطبوعہ خط: بنام منشی محمد حسن محولہ بالا۔

۱۱۱۔ ''مکاتیب امیر مینائی'' ص ۱۰۸۔

۱۱۲۔ غیر مطبوعہ خط بنام مرزا پرورش علی خاں از جلیل مانک پوری ۲۵/ اکتوبر ۱۸۹۸ء۔

۱۱۳۔ دوران گفتگو جناب اسمٰعیل احمد مینائی نے بتایا۔

۱۱۴۔ ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ''، ص ۴۴۹۔

۱۱۵۔ دوران گفتگو جناب اسمٰعیل احمد مینائی نے بتایا۔

۱۱۶۔ ''سوانح امیر'' ص ۴۴۔

۱۱۷۔ ”امیر مینائی اوران کے تلامذہ“، ص ۳۴۸۔

۱۱۸۔ ”مکاتیب امیر مینائی“ ص ۱۴۴۔

۱۱۹۔ ”امیر مینائی“ ص ۲۶۔

۱۲۰۔ ایضاً۔

۱۲۱۔ ”مکاتیب امیر مینائی“ ص ۱۴۸۔

۱۲۲۔ ایضاً، ص ۱۶۵۔

۱۲۳۔ ”مکاتیب امیر مینائی“ ، ص ۲۷۶۔

۱۲۴۔ غیر مطبوعہ خط بنام ریاض احمد، مورخہ ۲۴/اکتوبر ۱۸۹۳ء، از ممتاز علی آہ۔

۱۲۵۔ غیر مطبوعہ بنام مولوی محمد حسین ۱۹۸۴ء، از ممتاز علی آہ۔

۱۲۶۔ ”مکاتیب امیر مینائی“ ص ۲۱۴۔

۱۲۷۔ ایضاً: ص ۲۲۰۔

۱۲۸۔ ایضاً: ص ۲۲۲۔

۱۲۹۔ ”امیر مینائی“ ص ۱۳۱۔

۱۳۰۔ ”مکاتیب امیر مینائی“ ص ۲۲۵۔

۱۳۱۔ ایضاً: ص ۲۹۴۔

۱۳۲۔ غیر مطبوعہ خط، بنام منشی محمد حسن از محمد مسعود، ۲۲/اپریل ۱۸۹۶ء۔

۱۳۳۔ غیر مطبوعہ خط بنام منشی محمد حسین از جلیل، ستمبر ۱۸۹۸ء۔

۱۳۴۔ غیر مطبوعہ خط، بنام سراج الدین، مورخہ ۱۹/اکتوبر ۱۸۹۸ء۔

۱۳۵۔ غیر مطبوعہ خط، بنام منیجر اخبار عام، مورخہ ۲۰/ستمبر ۱۸۹۸ء۔

☆☆☆☆

کتابیات

مطبوعہ کتب:

۱۔ ابومحمد سحر، ڈاکٹر: ''مطالعۂ امیر''، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۴ء۔

۲۔ امیر احمد علوی: ''طرۂ امیر''، لکھنؤ، انوار المطابع، ۱۹۲۸ء۔

۳۔ امیر مینائی: ''مکاتیب امیر مینائی''، مرتب احسن اللہ ثاقب لکھنؤ، مطبعۂ ادبیہ، ۱۹۲۴ء۔

۴۔ امیر مینائی: ''امیر اللغات''، لاہور، مقبول اکیڈی، ۱۹۸۸ء۔

۵۔ آہ، شاہ ممتاز علی: ''امیر مینائی''، لکھنؤ، ادبی پریس، ۱۹۴۱ء

۶۔ جلیل مالک پوری: ''سوانح امیر مینائی''، حیدر آباد دکن، مطبع سیدی، ۱۳۴۷ھ۔

۷۔ حامد حسن قادری: ''داستان تاریخ اردو''، طبع سوم، کراچی، اردو اکیڈی سندھ، ۱۹۶۱ء

۸۔ حکیم نجم الغنی خاں رامپوری: ''اخبار الصنادید''، لکھنؤ، مطبع نول کشور، ۱۹۱۸ء۔

۹۔ شوق: احمد علی خاں، حافظ: ''تذکرہ کاملان رام پور''، پٹنہ، مشمولہ خدابخش لائبریری جرنل مشترکہ شمارہ ۳۳ تا ۳۵۔

۱۰۔ عرفان عباسی: ''دبستانِ امیر مینائی''، لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ۱۹۸۵ء۔

۱۱۔ کریم الدین احمد، ڈاکٹر: ''امیر مینائی اور ان کے تلامذہ''، لاہور، آئینۂ ادب، ۱۹۸۲ء۔

۱۲۔ لالہ سری رام: ''خمخانۂ جاوید''، جلد اول تا چہارم، دہلی، ۱۹۰۸ء تا ۱۹۲۶ء۔ خدابخش لائبریری جرنل'' پٹنہ، مشترکہ شمارہ ۳۳ تا ۳۵۔

رسائل: ''تحقیق'' شعبۂ اردو، جامعۂ سندھ، جامشورو، ۱۹۸۹ء۔

''خدابخش لائبریری جرنل'' پٹنہ، مشترکہ شمارہ ۳۳ تا ۳۵

☆☆☆☆

محمود الٰہی

اردو لغت اور ترقی اردو بورڈ (۱)

۱۹۶۹ء کے وسط میں ترقی اردو بورڈ [ہند] کا قیام عمل میں آیا تھا اور مرکزی حکومت نے ایک خطیر رقم اس کے سپرد کی تھی کہ اپنے منصوبوں کی تشکیل و تکمیل میں اسے کوئی مالی دشواری پیش نہ آئے۔ گزشتہ نو سال کی مدت میں ایک فعال ادارے کی حیثیت سے بورڈ کو خاصی شہرت ملی اور اس کی بعض مطبوعات قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔

بورڈ کے منصوبوں میں ”اردو ادب لغت“ کی تدوین و اشاعت بھی شامل ہے۔ یہ لغت پانچ جلدوں پر مشتمل ہوگی اور ہر جلد میں تقریباً تیس ہزار الفاظ شامل ہوں گے۔ بورڈ نے اس منصوبے کا بڑا حصہ پورا کر لیا ہے[1]۔

ابھی حال ہی میں ترقی اردو بورڈ نے ”تصنیف و تالیف“ کے نام سے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس میں بورڈ کی سرگرمیوں کا ذکر ہے۔ اس کتاب میں زیرِ تکمیل لغت کے بعض اندراجات بھی پیش کر دیے گئے ہیں جن کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لغت کی تدوین و ترتیب میں توجہ اور

دقتِ نظر سے کم ہی کام لیا گیا ہے۔ کتابچے میں صرف ''پ'' کے ذیل میں جو اندراجات شامل کیے گئے ہیں، ان میں بعض کا تجزیہ بطور ثبوت پیش کیا جاتا ہے۔

لغت کے مرتبین نے لفظ ''پا'' کو ''پائندہ'' کا مخفف بتایا ہے اور مثال میں ''دیرپا'' کو پیش کیا ہے۔ دراصل یہ پائیدن کا اسم فاعل سماعی ہے۔ ''پابوس'' کے بارے میں جو تصریح کی گئی ہے وہی ''دیرپا'' پر بھی صادق آتی ہے اگر مرتبین کا نقطۂ نظر درست تسلیم کیا جائے تو پھر ''پابوس'' سے بوس کو بوسیدہ کا مخفف لکھنا چاہیے نہ کہ اسم فاعل۔ کیا بت پرست، بندہ پرور، نامہ بر، وغیرہ کے آخری الفاظ محض مخففات ہیں؟

مرتبین نے ''پامال'' کے ضمن میں یہ بھی بتایا ہے اور صحیح بتایا ہے کہ اسے ''پائمال'' بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن مرتبین نے پاکوب کے ضمن میں یہ کیوں نہیں بتایا کہ اس کا ایک تلفظ ''پائے کوب'' بھی ہے جیسا کہ اقبال کا یہ شعر شاہد ہے۔

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اسی طرح ''پامردی'' کے ذیل میں ''پائے مردی'' کو ترک کر دیا گیا ہے جب کہ اردو کے بعض اساتذہ اسے استعمال کرتے آئے ہیں۔ مثلاً دیاشنکر نسیم کا یہ شعر:

وہ دست رس اور پائے مردی
وہ بیکسی اور وہ دشت گردی

''پابوس'' اور ''پابندی'' میں بھی یہی غلطی پائی گئی ہے منیر شکوہ آبادی کے یہ شعر غلط نہیں ہیں:

اٹھ کے افتادگی نے کی تسلیم
پائے بوسی نے کی کفش برداری

زخموں کی طرح دیدۂ دشمن ہیں خوں فشاں
ہیں پائے بند سلسلۂ اضطرار ہاتھ

جب پابندی کا لفظ شامل کیا گیا تو سیاق و سباق کا تقاضا تھا کہ یہیں کہیں "پابستگی" کو بھی جگہ ملتی۔ غالب کی سند تو قابل تسلیم ہوگی:

ہیں اہل خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

اگر مرتبین انتخاب الفاظ کے باب میں بعض اصول متعین کر لیتے تو خامیوں کی گنجائش ہی کم رہتی۔ یوں تو کتابچے میں وہ "رہنما اصول" درج کر دیے گئے ہیں جو بورڈ نے لغت کی تدوین کے لیے وضع کیے تھے۔ مگر اندازہ یہ ہوتا ہے کہ اصول و عمل میں کوئی تال میل نہیں ہے۔ رہنما اصول میں یہ بات بھی درج ہے کہ نظم و نثر سے سند صرف ایسے الفاظ کی دی جائے گی جو غریب ہوں مگر دیکھنے میں یہ آیا کہ بہت سے غریب الفاظ کی مثالیں غیر حاضر ہیں۔ اس کے برعکس بعض متداول الفاظ کی مثالیں موجود ہیں۔

"متروکات" کے تعین کے سلسلے میں بورڈ کا ذہن صاف نہیں ہے۔ اس پر یہ بھی واضح نہیں ہے کہ کس لفظ کو قلیل الاستعمال بتایا جائے۔

میرا مشورہ ہے کہ لغت کی اشاعت سے پہلے ترقی اردو بورڈ اس پر نظر ثانی کرے صرف اسی کی ضرورت نہیں ہے کہ کچھ نئے الفاظ شامل کر لیے جائیں اور کچھ قدیم الفاظ خارج کر دیے جائیں۔ بورڈ کو یہ بھی سوچنا ہے کہ ہماری لفظیات ہمیشہ نئی معنویت کی تلاش میں رہی ہے اور مجوزہ لغت میں اس کی نشاندہی کی ضرورت ہے، مجھے کہنا چاہیے کہ ایسا اسی وقت ممکن ہے جب چند لغات کو سامنے رکھ کر لغات مرتب کرنے کی روش ترک کر دی جائے۔ ہمیں اپنے ادیبوں اور شاعروں سے الفاظ کا وسیع و وقیع خزانہ ورثے میں ملا ہے، کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ اس خزانے کو بنیاد بنا کر ہم لغت مرتب کریں؟

مجھے اس کا احساس ہے کہ اگر لغت پر نظر ثانی کی گئی تو اس کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو جائے گی اور اخراجات میں بھی اضافہ ہو جائے گا۔ مگر نظر ثانی پر کچھ اور خرچ کرنا دانش مندی کے خلاف نہیں ہے۔ ہم ایک مدت سے ایک معیاری اور جامع لغت کا انتظار کر رہے ہیں۔ انتظار کی کچھ گھڑیاں بڑھ جائیں تو کیا مضائقہ ہے۔

(مشمولہ ”ہماری زبان“، دہلی، ۱۵؍مئی ۱۹۷۸)

حاشیہ

(۱) لغت کے اس منصوبے کے لیے جو رہنما اصول مرتب کیے گئے تھے ان کی تفصیل نیز پانچ مجوزہ جلدوں (جو ہنوز غیر مطبوعہ ہیں) میں شامل الفاظ اور ان کے مرتبین کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ”اردو۔ اردو لغت، رہنما اصول“ مشمولہ غالب، کراچی، شمارہ ۲۱، ۲۰۱۳ء (مرتب)

☆☆☆☆

نذیر احمد

اردو لغت اور ترقی اردو بورڈ (۲)

پروفیسر محمود الٰہی صاحب، صدر شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی، علمی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھوں نے ''اردو لغت اور ترقی اردو بورڈ'' کے عنوان سے انجمن ترقی اردو ہند کے جریدہ ''ہماری زبان'' کے ۱۵ر مئی ۱۹۷۸ء کے شمارے میں اردو لغت پر جو اردو ترقی بورڈ کے زیر اہتمام تیار ہو رہا ہے، تنقید کی ہے۔ یہ تنقید لغت مذکور کے ان نمونوں کی بنیاد پر ہے جو بورڈ کے کتابچے ''تصنیف و تالیف'' میں شائع ہوئے ہیں۔ اس تنقید میں اصلاح کا پہلو کم اور تنقیص اور عیب جوئی کا رنگ غالب ہے اور اتفاق کی بات یہ ہے کہ جو علمی مسائل اس میں چھیڑے گئے ہیں وہ سراسر غلط ہیں اور معترض کی کم عقلی پر دلالت کرتے ہیں۔ چنانچہ ذیل کی یادداشت میں چند امور کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

پروفیسر محمود الٰہی کا اعتراض یہ ہے:

''لغت کے مرتبین نے لفظ یا کو پایندہ کا مخفف بتایا ہے اور مثال میں [illegible] پیش کیا ہے،

دراصل یہ پائیدن کا اسم فاعل قیاسی ہے۔“

اس سلسلے میں میری گزارش حسب ذیل ہے:

لغت مذکور میں ”پا“ کے یہ معنی درج ذیل ہیں:

(۱) پانو۔ قدم (۲) پائندہ کا مخفف جیسے دیرپا۔ یہی دیرپا جو مثال میں پیش کیا گیا ہے اور اس جگہ الگ اندراج کی حیثیت نہیں رکھتا پروفیسر محمود الٰہی صاحب کی توجہ کا مرکز بنا ہے۔ موصوف کے اعتراض کے آخری جملے میں سیاق کا تقاضا ہے کہ ضمیرِ اشارہ ”یہ“ کا مرجع ”پا“ قرار دیا جائے۔ ”دیرپا“ بہ الفاظِ دیگر موصوف کے [کہنے کے مطابق] ”پا“ پائیدن سے اسم فاعل قیاسی ہے، یہ بات درست نہیں۔ ”پا“ پائیدن مصدر سے امر واحد حاضر بحذف ”ی“ ہے اصل امر ”پای“ ہے۔ اسم فاعل قیاسی امر واحد حاضر پر بغیر اسم یا صفت یا کبھی ”قید“ کے اضافے کے نہیں بن سکتا، دیرپا اسم فاعل یا صفت فاعلی ہے (جو صفت مشبہ کے مترادف ہے) نہ کہ ’پا‘۔ دل کش، دل فریب، دل سوز، رنج کش، سخن پرور، نکتہ سنج، زودنویس، نامہ بر، حسن پرست جیسے الفاظ میں کش، فریب، سوز، پرور، سنج، نویس، بر پرست کی طرح کے الفاظ کو کوئی اسم فاعل کہنے لگے تو اس کے بارے میں آپ کیا حکم لگائیں گے؟ اس طرح کے سہو کا انتساب محمود الٰہی جیسے فاضل کی طرف مشکل معلوم ہوتا ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی طالب علم نے ان کے نام سے یہ یادداشت شائع کردی ہو!

دیرپا میں ”پا“ کے پائندہ سے ترخیم یا تخفیف ہونے کی حقیقت سنیے، ہاں یہ عرض [کردوں کہ یہ خیال] مرتبین لغت کا تنہا نہیں بلکہ نور اللغات میں یہی بات درج ہے، خیر [اس] سے قطع نظر، فارسی میں اسم فاعل قیاسی کو اسم فاعل مرخم بھی کہتے ہیں [۔۔۔] مصدر سے اسم مفعول ہے، ترخیم ایک صَرفی اور عروضی اصطلاح ہے [اس سے مراد ہے] کہ کسی لفظ کے آخری حروف یا حرف حذف کردیے گئے ہوں۔ عروض میں ترخیم زحاف کی ایک شکل ہے اور ترخیم کے لغوی معنی غیاث اللغات میں یہ درج ہیں:

”ترخیم نرم گردانیدن وانداختن حرف آخر از کلمۂ منادی وغیر منادی“

اسم فاعل کو اسم فاعل مرخم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اصل اسم فاعل ”دیرپائندہ“ ہے اس کی تخفیف

یا ترخیم سے دیر پائے اور دیر پا اسم فاعل بنائے گئے ہیں اور اب اصل صورت سے زیادہ یہی مرخم صورت زیادہ مستعمل ہے، لیکن فارسی میں اس کا چلن تھا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

اوپر عرض کیا جا چکا ہے کہ اسم فاعل مرخم اسم یا صفت یا ''قید'' پر امر واحد حاضر کے اضافے سے بنتا ہے۔ اسم کی مثالیں اس طرح پر ہیں:

نامہ بر، بندہ پرور، دانش آموز، جہاں آفریں، دل کش، دل چسپ، حسن خیز، یوسف زا، دل کشا، دل فریب، سرفروش، دل سوز، جہاں بین، کارساز، جہاں گیر، عالم سوز، جہاں آرا، گیتی افروز وغیرہ ان تمام الفاظ کی اصل صورتیں بالترتیب یہ ہیں:

نامہ برندہ، بندہ پرورندہ، دانش آموزندہ، جہاں آفرینندہ، دل کشندہ، دل چسپندہ، حسن خیزندہ، یوسف زایندہ، دل کشایندہ، دل فریبندہ، سرفروشندہ، دل سوزندہ، جہاں بیندہ، کارسازندہ، جہاں گیرندہ، عالم سوزندہ، جہاں آرایندہ، گیتی افروزندہ،

صفت کی مثالیں اس طرح کی ہیں:

بدآموز، بدبین، بدگو، سخت کوش، سخت گیر، سبک رو، تیز رو، پرگو۔

قید کی مثالیں:

کم گو، نیم کش، دیر پا، زود نویس، زود خیز، باز پرس وغیرہ۔ صفات اور قید سے بنے ہوئے الفاظ کی شکلیں حسب ذیل ہیں:

بدآموزندہ، بدبینندہ، بدگویندہ، سخت کوشندہ، سبک روندہ، تیز روندہ، سخت گیرندہ، پرگویندہ، کم گویندہ، نیم کشندہ، دیر پایندہ، زود نویسندہ، زود خیزندہ وغیرہ۔

یہ سارے اسمِ فاعل یا صفاتِ فاعلی اسم کے لاحقے سے بنتے ہیں۔ اضافی صورت میں اس طرح تبدیل ہوتے ہیں:

برندۂ نامہ، پرورندۂ بندہ، آموزندۂ دانش، آفرینندۂ جہان، کشندۂ دل، چسپندۂ دل، خیزندۂ حسن، زایندۂ یوسف، کشایندۂ دل، فریبندۂ دل، فروشندۂ سر، سوزندۂ دل، بینندۂ جہاں، سازندۂ

کار، گیرندۂ جہان، سوزندۂ عالم، آرایندۂ جہاں، افروزندۂ گیتی۔

یہ سارے مرکبات اضافی آج بھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں یکساں متداول ہیں۔

اسی طرح جو اسم فاعل یا صفت فاعلی صفت کے لاحقے سے بنتے ہیں وہ مرکب توصیفی میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور یہ صورتیں دونوں زبانوں میں یکساں رائج ہیں۔ مثالیں یہ ہیں:

آموزندۂ بد، بینندۂ بد، گویندۂ بد، کوشندۂ سخت، گیرندۂ سخت، روندۂ سبک، روندہ تیز۔ البتہ قید سے بنے ہوئے اسم فاعل جیسے بسیار گویندہ، کم گویندہ،، نیم کشندہ، دیر پایندہ، زود نویسندہ، باز پرسندہ، 'مرکبات توصیفی' میں تبدیل نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ 'قید' (ADVERB) علامتِ صفت قبول نہیں کر سکتی۔

اسم فاعل مرخم کے عموماً دو کام ہوتے ہیں:

(۱) صفات فاعلی یا صفت مشبہ جیسے دل کش، دل چسپ، دل کشا، دل فریب، دیر پا، سرفروش، دل سوز، جہاں بین، جہانگیر، عالم سوز، لطف آمیز گیتی افروز وغیرہ۔

(۲) اسم نکرہ جیسے نامہ بر، دانش آموز، جہاں آفریں، بت پرست وغیرہ۔

اگرچہ تفصیلاتِ بالا سے پروفیسر محمود الٰہی صاحب کے اعتراض بخوبی رفع ہو جاتے ہیں، لیکن گفتگو کو مزید مدلل بنانے کے لیے ایرانی فاضل ڈاکٹر محمد جواد مشکور کا قول درج کیا جاتا ہے، یہ توضیح ان کی کتاب ''دستور نامہ در صرف و نحو زبان پارسی'' طبع ۱۳۴۰ شمسی ص ۲۶، ۲۷ پر موجود ہے۔

صفت فاعلی آنست کہ بر کنندہ کار یا دارندہ چیزی دلالت کند مانند آتشِ سوزندہ، مردِ زنندہ، دانای بینندہ، و آنرا اسم فاعل نیز گویند۔

(صفت فاعلی وہ ہے جو کام کرنے والے یا چیز رکھنے والے پر دلالت کرے جیسے آتش سوزندہ (جلانے والی) مرد زنندہ (مارنے والا آدمی) دانائے بینندہ (دیکھنے والا دانا) اس کو اسم فاعل بھی کہتے ہیں۔)

علامت صفت فاعلی ازیں قرار است "ندہ" در آخر فعل امر، غالباً در ترکیب ایں صفت با اسم دیگر "ندہ" را از آخر صفت حذف کنند مانند سخن گوی دل سوز، رہبر باز پرس، موی ستر (سلمانی) است کہ در اصل سخن گویندۂ دل سوزندہ، رہ برندۂ باز پرسندہ، موی سترندہ بودہ اند۔

صفت فاعلی بچہار قسم ترکیب می شود:

(الف) حالت اضافی، وقتی کہ صفت اضافہ شود مانند:

فرایندۂ باد آوردگاہ فشانندۂ خون زابر سیاہ
(فردوسی)

(ب) با مقدم داشتن صفت و حذف کسرۂ اضافہ مانند:

جہاندار محمود گیرندہ شہر
ز شادی بہر کس رسانندہ بہر
(فردوسی)

(ج) با تاخیر صفت بدون آنکہ در آن تغییری رخ دہد مانند:

منم گفت یزداں پرستندہ شاہ
مرا ایزدِ پاک داد ایں کلاہ
(فردوسی)

(صفت فاعلی کی علامت فعل امر کے آخر میں "ندہ" ہے۔ جب یہ صفت دوسرے اسم سے مل کر ترکیب پاتی ہے تو اکثر حالتوں میں آخر سے علامت 'ندہ' حذف ہو جاتی ہے جیسے سخن گوی دل سوز، رہ بر باز پرس، موی ستر (حجام) کہ دراصل سخن گویندہ دل سوزندہ، رہ برندہ باز پرسندہ، موی سترندہ ہیں)

صفت فاعلی چہار طرح پر ترکیب پاتی ہے

(الف) حالت اضافی، اس میں صفت اضافت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جیسے فرایندۂ باد یا فشانندۂ خون (فردوسی کی بیت میں)

(ب) صفت مقدم کرتے ہیں اور علامت اضافت حذف ہو جاتی ہے جیسے گیرندۂ شہر (= شہر گیرندہ) رسانندۂ بہر (= بہر رسانندہ)

(ج) صرف صفت کو موخر کر دیتے ہیں، جیسے یزدان پرستندہ شاہ یعنی شاہِ یزدان پرستندہ
(فردوسی)

یعنی شاہِ یزداں پرستندہ۔

(د) با تاخیر صفت و حذف علامت 'ندہ' مانند:

سرفراز و گردن فراز یعنی فرازندۂ سر و گردن و

شکر شکن یعنی شکنندہ شکر۔

(د) صفت کو مؤخر اور علامت 'ندہ' حذف کرنے سے جیسے سرفراز (=سرفرازندہ) گردن فراز = گردن فرازندہ)، شکر شکن (شکنندہ) اضافی صورت میں فرازندۂ سر، فرازندۂ گردن، شکنندۂ شکر)

پروفیسر محمود الٰہی کا دوسرا اعتراض یہ ہے:

"پابوس کے بارے میں جو تشریح کی گئی ہے وہ دیرپا پر بھی صادق آتی ہے، اگر مرتبین کا نقطۂ نظر درست تسلیم کر لیا جائے تو پھر پابوس کو بوسیدہ کا مخفف لکھنا چاہیے نہ کہ اسم فاعل، کیا بت پرست، بندہ پرور، نامہ بر وغیرہ کے آخری الفاظ مخففات ہیں۔" قبل اس کے [کہ] اعتراض کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے لغت مذکور میں پابوس کے یہ معانی درج ہوئے ہیں:

پابوس (اسم فاعل) پانو چومنے والا۔ نہایت ادب و تعظیم سے پیش آنے والا۔ میری گزارش اس سلسلے میں یہ ہے:

(۱) بت پرست، بندہ پرور، نامہ بر کے آخری الفاظ واضحا مخففات کی مثالیں [ہیں] جیسا کہ اوپر تفصیل سے عرض کیا جا چکا ہے، چار ناچار یہ حقیقت تسلیم کرتا ہے، یہ دستور زبان کا متداول طریقہ ہے جس سے انحراف کا نہ مجھے حق ہے اور نہ جناب محمود الٰہی صاحب کو۔ اس سلسلے میں مزید لکھنے کی ضرورت نہیں۔

(۲) ڈاکٹر صاحب نے 'دیرپا' کی بحث اس طرح کی ہے گویا اس جگہ اس 'لفظ' کی حیثیت 'اندراج' (ENTRY) کی ہے، دراصل 'اندراج' کی صورت میں لفظ کی قواعد کا ذکر ہوتا ہے، جلد سوم میں 'دیرپا' کی بحث آئے گی، یہاں یہ لفظ 'پا' کے استعمال کی ایک مثال کے طور پر درج ہوا ہے، اس لیے اس جگہ اس کی قواعد کا مطالبہ بے محل ہے۔

(۳) "پابوس" میں 'بوس' کو 'بوسیدہ' سے مخفف سمجھنے کا قیاس کم علمی پر دلالت کرتا ہے، البتہ

یہ اور بات ہے کہ ہم اسے چھاپے کی غلطی سمجھیں، لغت میں 'پا' کو پایندہ کا مخفف لکھا گیا ہے نہ پائیدہ کا، پس بوسیدہ کی جگہ بوسندہ ہونا چاہیے، چونکہ بوسندہ استعمال میں نہیں اور بوسیدہ عام لفظ ہے، شاید اسی لیے مضمون نگار کے انتخاب میں یہی لفظ آیا اور وہ بھول گئے کہ بوسیدہ اسم مفعول ہے اور بوسندہ اسم فاعل، چونکہ پابوس اسم فاعل ہے، اس لیے اسم مفعول سے اس کا رشتہ نہیں جوڑا جا سکتا، ہم اسم مفعول اور اسم فاعل کے درمیان لفظاً ومعناً بڑا فرق ہے۔ اس کے درمیان فرق نہ کرنا بڑی غفلت ہے، ہاں یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی اسم فاعل اسم مفعول کے طور پر استعمال ہوتا ہے، اس سلسلے میں سراج علی خاں آرزو کی کتاب ''مثمر'' سے چند جملے نقل کیے جاتے ہیں:

> ''در محاورات فارسیان ازیں دست الفاظ بسیار است کہ بمعنی اسم فاعل و اسم مفعول ہر دو آمدہ و بقرینہ و مقام معلوم می شود، مثلاً کارساز، عالم گیر، جہاں آفریں، دانش آموز، عالم سوز کہ سازندۂ کار، گیرندۂ عالم و آفرینندۂ جہاں، آموزندہ دانش و سوزندہ عالم است و بمعنی اسم فاعل آمدہ و گاہی بعینہ در ترکیب دیگر افادۂ اسم مفعول می کند، مثلاً گویند فلاں کار خدا ساز است یعنی ساختۂ خدا۔''

مگر یہ اصول معترض کے قول پر منطبق نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر محمود الٰہی کا تیسرا اعتراض یہ ہے کہ اس لغت میں پامردی، پاکوب، پابوس، پابند تو موجود ہیں لیکن پاے مردی، پاے کوب، پائے بوس، پاے بند غیر حاضر ہیں۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے بڑی عجلت سے کام لیا ہے، دراصل ''تصنیف وتالیف'' میں حرف پ کے ذیل کے الفاظ پا سے لے کر پاٹن تک چھپے ہیں، ابھی پاے تک پہنچے نہیں، پائے مردی، پائے کوب، پائے بوسی، پائے بند پائے کے ذیل میں آئیں گے۔ لغت حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہو رہا ہے۔ اسی وجہ سے پاے کو پا سے الگ درج کیا گیا ہے۔

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے لغت نویسی کے بارے میں بعض مشورے دیے ہیں۔ اس

وقت طوالت کے خیال سے اس پر کچھ نہیں لکھنا چاہتا ہوں، صرف ان کی توجہ اپنے ایک مضمون کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ہندی بورڈ کے زیرِ اہتمام سیمینار میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے مطالعے سے اس سلسلے کے مسائل بخوبی روشن ہوسکیں گے۔ میری دانست میں ڈاکٹر صاحب قواعد زبان اور لغت نویسی کے مردِ میدان نہیں اور یہ بات تعجب انگیز بھی نہیں ہر کسے را بہر کارے ساختند اسی لیے کہا گیا ہے اور انتباہاً یہ بھی فرمایا جاچکا ہے کہ:

نہ ہر جاے مرکب تواں تاختن　　　کہ جاہا سپر باید انداختن

افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے یہاں بعض جگہ نہایت غیر ذمہ دارانہ تحریریں ملتی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

''اس کتاب میں (تصنیف وتالیف) زیرِ تکمیل لغت کے بعض اندراجات بھی پیش کردیے گئے ہیں جن کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ لغت کی تدوین وترتیب میں توجہ اور دقتِ نظر سے کم ہی کام لیا گیا''۔ میں حیران ہوں کہ اس بیان کو کس چیز پر محمول کروں، غفلت و بے علمی، معاصرانہ چشمک یا حاسدانہ نقطہ نظر۔ بہر حال کسی جذبے کے تحت ہو، کوئی بھی قابلِ ستائش نہیں۔ میں صرف یہ مشورہ دوں گا کہ

اتنا نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت　　　دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

(مشمولہ ''ہماری زبان''، دہلی، ۸/ جولائی ۱۹۷۸ء)

حواشی

(۱) یہاں قید سے مراد متعلقِ فعل یعنی adverb ہے (مرتب)

(۲) اس جملے میں اور اس سے پچھلے دو جملوں میں بھی قیاساً اضافہ کیا گیا ہے۔ کیونکہ ''ہماری زبان'' کے جس شمارے سے اُس مضمون کو نقل کیا گیا ہے اس کا یہ حصہ ناقص تھا (مرتب)

(۳) یہاں عربی کا سَتر نہیں فارسی کا سُتر ہے۔ موی سُتر یا موے سُترا اور نیز سلمانی سے مراد بال کاٹنے والا، مونڈنے والا یا نائی ہے (مرتب)

صابر سنبھلی

ترقیٔ اردو بورڈ کی لغت کا تنازع (۳)

انجمن ترقیٔ اردو (ہند) کے ہفتہ وار جریدے ''ہماری زبان'' کی ۱۵؍مئی ۱۹۷۸ء کی اشاعت میں ڈاکٹر محمود الٰہی کا ایک مختصر مضمون ''اردو لغت اور ترقیٔ اردو بورڈ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ اس میں ڈاکٹر صاحب نے ترقیٔ اردو بورڈ کے زیرِ اہتمام مدون کی جانے والی اردو کی ضخیم لغت کے بعض اندراجات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ بات اہم تھی اور ان معنی میں اہم تھی کہ ایک ذمے دار ادارے کے زیرِ اہتمام فاضل علمائے لغت و زبان کی دیکھ ریکھ میں تیار ہونے والی لغت کو جس پر اردو دنیا کی نظریں لگی ہوئی ہیں بڑی حد تک مکمل جامع اور صحیح ہونا چاہیے تھا۔ اس قسم کے تبصرے اور تنقید ایسی نہیں ہوتیں جن کے جواب میں ذاتیات کو ہدف بنا لیا جائے۔ ہر شخص کو اپنی اپنی رائے دینے کا پورا حق ہوتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ ڈاکٹر محمود الٰہی کا اس تنقید سے کیا مقصد تھا مگر اس کی روشنی میں لغت کی بعض خامیوں کو دور کیا جا سکتا تھا۔

ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کے مضمون کے جواب میں ''ہماری زبان'' کی ۸؍جولائی ۱۹۷۸ء کی اشاعت

میں پروفیسر نذیر احمد کا جو مضمون ''اردو لغت اور ترقیٔ اردو بورڈ کے عنوان سے شائع ہوا ہے وہ علمی اور معلومات افزا ہوتے ہوئے بھی انصاف اور حق پر مبنی نہیں ہے۔ انھوں نے چند باتیں ایسی لکھی ہیں جو نہ لکھتے تو اچھا تھا۔ مثلاً مضمون کا آخری حصہ پیش کیا جاسکتا ہے جس میں ڈاکٹر محمود الٰہی کے قواعد زبان اور لغت نویسی کا مرد میدان ہونے سے انکار کیا گیا ہے ہوسکتا ہے ایسا ہو لیکن پھر بھی اس کا اظہار ان الفاظ میں کسی طرح بھی مستحسن نہیں کہا جائے گا۔ مزید ایک مصرع:

ہر کسے را بہر کارے ساختند

ایک اور فارسی شعر۔

نہ ہر جاے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

اور مضمون کا آخری شعر ہے۔

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

تو گویا فاضل مضمون نگار کی دل آزاری کے لیے ہی لکھا گیا ہے جو واضح طور پر دعوتِ معرکہ آرائی دے رہا ہے۔ بلاشبہ ابتدا پہلے ڈاکٹر محمود الٰہی کی طرف سے ہوئی ہے۔ مگر ان کے الزامات میں اتنی شدت اور سختی نہیں ہے۔

پروفیسر نذیر احمد کے تیوروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر یہ سلسلہ طویل ہوگیا تو کہیں معرکہ چکبست وشرر کا روپ نہ دھار لے کیونکہ جس کام کی ابتدا یہ ہے اس کی انتہا کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔

راقم السطور کا ارادہ اس سلسلے میں ہی کچھ خامہ فرسائی کرنے کا ہے۔

میں ایک بات واضح کردینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا کوئی بھی تعلق نہ پروفیسر نذیر احمد سے ہے اور نہ ڈاکٹر محمود سے۔ نہ ان میں سے کسی سے خط کتابت ہے حتیٰ کہ میں دونوں میں سے کسی سے ذاتی طور پر واقف نہیں۔ ہاں زبان و ادب کے بزرگ علما کی حیثیت سے دونوں کا احترام کرتا ہوں۔ دوسرے یہ کہ ترقیٔ اردو

بورڈ کا کتابچہ تصنیف وتالیف بھی میری نظر سے نہیں گزرا جو کچھ نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ وہ مذکورہ بالا مضامین کے مطالعے ہی کا نتیجہ ہیں۔

دونوں ہی مضمونوں میں لفظ ''پا'' کی تشریح پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ مرتب لغت کا قول ہے کہ لفظ ''پا'' ''پائندہ'' کا مخفف ہے۔

ڈاکٹر محمود الٰہی کا خیال ہے ''یہ پائیدن کا اسم فاعل سماعی ہے'' ڈاکٹر محمود الٰہی کے اس قول کو پروفیسر نذیر احمد نے بالکل غلط نقل کیا ہے اور اسم فاعل سماعی کے بجائے ڈاکٹر صاحب کے قول کے مطابق اس کا اسم فاعل قیاسی ہونا نقل کیا ہے۔ یہ کتابت کی غلطی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ پروفیسر صاحب نے دوسری جگہ بھی اس قول کا مفہوم اس طرح درج کیا ہے اور ڈاکٹر محمود الٰہی پر لفظ ''پا'' کو ''پائیدن'' مصدر کا اسم فاعل قیاسی کے قائل ہونے کا الزام لگایا ہے جو بالکل بے بنیاد ہے اور ساری خامہ فرسائی یہی ثابت کرنے کے لیے کی ہے کہ یہ پائیدن کا اسم فاعل قیاسی نہیں ہے۔ بظاہر وہ ڈاکٹر محمود الٰہی کے قول کا رد کر رہے ہیں۔ مگر اصلیت یہ ہے کہ لفظ ''پا'' کی تشریح میں وہ ڈاکٹر صاحب کے قول کو صحیح نقل ہی نہیں کر سکے۔ اتنا کہنا ضروری ہے کہ کسی بھی قائل سے کوئی غلط قول منسوب کر کے اس کا رد کرنا قائل کا رد نہیں ہے بلکہ اس کو کچھ اور ہی نام دیا جانا چاہیے اور وہ نام کیا ہے، قارئین ۱۵؍مئی اور ۸؍جولائی ۱۹۷۸ء کے ''ہماری زبان'' کے پرچوں سے اس کی تصدیق کر کے فیصلہ خود فرما لیں۔

اس جملہ معترضہ کے بعد پھر لفظ ''پا'' کی بحث کی طرف رجوع کیجیے۔ پروفیسر نذیر احمد ڈاکٹر محمود الٰہی کے جواب میں ارقام فرماتے ہیں:

''پا'' ''پائیدن مصدر سے امر واحد حاضر بحذف ''ی'' ہے۔ اصل امر ''پای'' ہے۔

تینوں بیانات سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ لفظ ''پا'' مصدر ''پائیدن'' سے مشتق ہے۔ کیونکہ ''پائندہ'' بھی ''پائیدن'' کا ہی اسم فاعل قیاسی ہے۔ اب بحث طلب بات یہ رہ جاتی ہے کہ یہ لفظ ''پائیدن'' مصدر سے اسم فاعل سماعی ہے یا امر واحد حاضر بحذف ''ی'' ہے۔ لہٰذا غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ امر واحد حاضر اور اسم فاعل قیاسی میں کیا فرق ہے۔ یہ کیسے بنتے ہیں اور ان کی کیا پہچان ہے۔

ظاہر ہے کہ اسم فاعل سماعی بنانے کا کوئی اصول یا قاعدہ کلیہ تو ہو نہیں سکتا کیونکہ اس کا اگر کوئی اصول ہوتا تو یہ اسم فاعل سماعی رہتا ہی کیوں۔ وہ بھی اسم فاعل قیاسی ہی ہو جاتا۔ ہاں! مگر دیکھنے میں یہی آتا ہے کہ امر واحد حاضر کی آخری ''ی'' (بعض حالتوں میں) ہٹا دینے پر یا اس پر یوں ہی اسم یا صفت یا قید کا اضافہ کر دینے سے اکثر حالتوں میں اور زیادہ تر اسم فاعل سماعی بن جاتا ہے اور امر واحد حاضر میں حروف ''ن دہ'' کے اضافے سے اسم فاعل قیاسی بن جاتا ہے۔ گویا اکثر حالتوں میں اسم فاعل قیاسی میں مذکورہ تین حروف کی تخفیف کے بعد اسم یا صفت یا قید کے اضافے سے اسم فاعل سماعی بن جاتا ہے۔ پروفیسر نذیر احمد نے اسم یا صفت یا قید پر امر واحد حاضر کی جو مثالیں پیش کی ہیں اور جن کو اسم فاعل مرخم لکھا وہ اس بات کی تردید نہیں کر سکے کہ یہ مرکب الفاظ اسم فاعل سماعی نہیں ہیں۔ انھوں نے درج فہارس مرکبات کو امر واحد حاضر پر اسم یا صفت یا قید کو اضافہ تو مانا مگر وہ ان کے اسم فاعل سماعی ہونے کا انکار نہیں کر سکے اور کر بھی نہیں سکتے۔ کیونکہ ایسا اگر ہوا تو اس کی سند کیا ہوگی۔ لہٰذا ان فہرستوں میں درج شدہ زیادہ تر الفاظ بیک وقت ''امر واحد حاضر'' بہ اضافہ اسم یا صفت یا قید بھی ہیں۔ اور اسم فاعل سماعی بھی سند کے لیے فارسی صَرف کی کوئی بھی کتاب دیکھی جا سکتی ہے۔ اس بات سے دونوں فاضلوں میں سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب کا یہ کہنا کہ ''اسم فاعل قیاسی امر واحد حاضر پر بغیر اسم یا صفت یا کبھی قید کے اضافے کے نہیں بن سکتا۔'' عجیب الجھن میں مبتلا کرنے والا ہے۔ امر واحد حاضر پر اسم یا صفت یا کبھی قید کے اضافے سے بھی اسم فاعل قیاسی بنتا ہے تو پھر اسم فاعل سماعی کس چیز کا نام ہے؟ اور اکثر حالتوں میں اس کی کیا شکل ہوتی ہے؟ اور یہ کہ امر واحد حاضر پر حروف ''ن دہ'' بڑھا کر جو فاعل بنتا ہے کیا اس کو اسم فاعل قیاسی نہیں کہتے؟ یا وہ کچھ اور شے ہے؟ کیا اسی کی تخفیف بھی اسم فاعل قیاسی ہی رہتی ہے؟ نیز یہ کہ ان فہرستوں کے زیادہ تر الفاظ اسم فاعل سماعی ہیں یا نہیں جو پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون میں درج کی ہیں۔ یہ سوالات تشنۂ جواب ہیں۔

اس قضیے کے تصفیے کے لیے ہر دو حضرات سے مندرجہ ذیل سوال پوچھنا چاہتا ہوں:

(۱) ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ ''پا'' پائیدن کا اسم فاعل سماعی تو ہے مگر پائندہ کا مخفف نہیں۔ کیا کسی حالت میں اسم فاعل سماعی اسم فاعل قیاسی کا مخفف نہیں ہو سکتا؟ اور اگر ہاں تو

"پا" پر ہی اعتراض کیوں ہے؟

(۲) پروفیسر نذیر صاحب کے پاس اس بات کی کیا سند ہے کہ "پا" "پائیدن" مصدر سے امر واحد حاضر بحذف "ی" تو ہے مگر "پائیدن" اسم فاعل سماعی نہیں؟ کیا ان کی فہرستوں میں درج اکثر الفاظ اسم فاعل سماعی نہیں ہیں؟ یہ کہ "پائیدن" کا اسم فاعل سماعی کیا ہوگا؟

میرا خیال ہے کہ اس بحث کے خاتمے کے لیے ان دونوں سوالات کے جوابات (اگر للّٰہیت سے دیے جائیں) کافی ہوں گے۔ ویسے اگر پروفیسر نذیر احمد صاحب کو بات بڑھانا نہ ہوتی تو وہ اشارہ "یہ" کا مرجع "دیرپا" کو بھی قرار دے سکتے تھے اور سیاق کا جو تقاضا ہے اس کو ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کی طرز تحریر کی خامی پر محمول کر سکتے تھے۔ مزید برآں یہ کہ انھوں نے مضمون میں زیادہ تر باتیں غیر متعلق کہی ہیں جو صاف طور پر حشو ہیں مگر معلومات افزا ہیں۔ اس کے لیے ہم پروفیسر صاحب کے مشکور ہیں۔

کہنے کی ضرورت نہیں کہ دونوں مضمون نگاروں نے قلم اٹھاتے وقت للّٰہیت کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور نفسانیت پر اتر آئے تھے اسی لیے یہ بات اس حد تک پہنچی۔ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب سوال کرتے ہیں کہ کیا بت پرست، بندہ پرور، نامہ بر وغیرہ کے آخری الفاظ محض مخففات ہیں؟ یہ سوال جواب دینے کے قابل تو نہیں مگر پھر بھی عرض ہے کہ ان مرکبات کے آخری الفاظ "محض" مخففات تو نہیں ہیں بلکہ اسم فاعل سماعی بھی ہیں تو کیا ان کو ان الفاظ کو مخففات کو تسلیم کرنے میں کچھ پس و پیش ہے؟ کیا یہ پرستندہ، پرورندہ اور برندہ کے مخففات نہیں ہیں۔ بلاشبہ ہیں اور امر واحد حاضر کے صیغے بھی ہیں۔ اسی طرح "پا" پائندہ کا مخفف بھی ہے اسم فاعل سماعی بحذف "ی" اور امر واحد حاضر بحذف "ی" (مصدر پائیدن سے) بھی ہے۔ یہ بحث اتنی تطویل طلب ہرگز نہیں ہے۔ مرتبین لغت کے "پا" کو "پائندہ" کا مخفف ماننے پر اعتراض کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

> "اگر مرتبین کا نقطۂ نظر درست تسلیم کیا جائے تو پھر پابوس کے "بوس" کو "بوسیدہ" کا مخفف لکھنا چاہیے۔"

یہ استدلال کتنا بے تکا ہے کہ بیان کی ضرورت نہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے فاعل پر مفعول کو

کیسے قیاس کرلیا؟ یہ بات سمجھ نہیں آتی۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے بڑی رعایت کے ساتھ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ چھاپے کی غلطی ہوسکتی ہے۔ خدا کرے ایسا ہی ہو ورنہ ڈاکٹر صاحب کا علمی پایہ مجھ جیسے نہ جانے کتنے طلبا کی نظروں میں ساقط ہو جائے گا لیکن افسوس ہے کہ یہاں پر چھاپے کی غلطی کا امکان ہے کیونکہ ”پابوس“ کے ”بوس کو“ ”بوسندہ“ کا مخفف ماننا کوئی اعتراض کی بات نہ ہوتی جیسا کہ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کا مقصد یہاں صرف تعریض ہی ہے۔ ایک عام آدمی ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب فاعل اور مفعول کے فرق سے بھی آگاہ نہیں ہیں حیران ہوں کہ اس کی کیا تاویل ہوسکتی ہے۔ میری فہم ناقص کے مطابق کتابت کی غلطی کے سوا اس کی کوئی تاویل مشکل سے ہی ہو سکے گی۔

پامردی، پابوس اور پاکوب کے ضمن میں پائے بوس اور پائے کوب کا اندراج نہ ہونا کوئی بہت بڑا جرم نہیں ہے جس پر ڈاکٹر محمود الٰہی نے اعتراض کیا ہے۔ یہاں پروفیسر نذیر احمد صاحب کا جواب صحیح ہے کہ ان کا اندراج اپنے موقع پر ہوگا۔ مگر پھر بھی یہ سمجھنا چاہیے کہ لغت میں مترادف الفاظ کا ذکر ہی ہوتا ہے اس لیے پامردی، پاکوب اور پابوس کے معنی بیان کرتے ہوئے پائے بندی کی طرح اگر یہ بھی لکھ دیا جاتا کہ ان کو علی الترتیب پائے کوب اور پائے بوس بھی کہتے ہیں تو کچھ غضب نہیں ہو جاتا۔ یہ رائے اچھی ہے اور اس کو مان لیا جائے تو بہتر ہے۔ ان الفاظ کی تشریح ان کے صحیح مقام پر بھی ہو جانی چاہیے یا وہاں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ اس کے لیے پابند یا پاکوب یا پابوس کو دیکھیے۔ پابستگی کا شامل نہ ہونا سہو کی وجہ سے ہوسکتا ہے۔ اس کو شامل کر لینا چاہیے۔

دونوں مضامین کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ تنازع کی بنیاد کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر بات کو بڑھایا جائے تو بڑھ جائے گی اور اس کو گھٹایا جائے تو گھٹ جائے گی۔ میری گزارش ہے کہ دونوں فاضل اس جھگڑے کو یہیں ختم کر دیں یا آئندہ جو کچھ لکھیں للّٰہیت اور خلوص کے ساتھ لکھیں جس سے تشنگانِ علوم مستفیض ہو سکیں۔

آخر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ غلطی ہر شخص سے ہوتی ہے نہ اس سے ڈاکٹر صاحب بچ سکتے ہیں، نہ پروفیسر صاحب محفوظ رہ سکتے ہیں اور نہ راقم ہی مبرا ہے۔ اس لیے محاسبے کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ

نامناسب ہے۔ ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کی بہت بڑی غلطی جس میں انھوں نے پائندہ پر بوسیدہ کو قیاس کیا ہے سامنے آچکی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی معقول جواب نہیں ہوسکتا۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب کی غلطی اس سے بھی بڑی ہے اور وہ یہ کہ انھوں نے ڈاکٹر محمود الٰہی کے قول کو ہی غلط نقل کیا اور پھر اس کا رد بھی کرتے رہے ہیں۔ اور اگر پروفیسر صاحب وہی نذیر احمد فائق ہیں جنھوں نے ”نذیری مصادر“ تصنیف فرمائی ہے تو وہ اس کتاب کے صفحہ ۳۵ کو ملاحظہ فرمالیں جس میں کلمہ ”گر“ کو مصدر ”رفتن“ سے مشتق مانا ہے۔ اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا ممکن ہے ان کے پاس اس کی کوئی سند ہو۔

(”ہماری زبان“، دہلی، ۲۲/اگست ۱۹۷۸ء)

☆☆☆☆

محمود الٰہی

اردو لغت اور ترقی اردو بورڈ (۴)

ابھی دو تین مہینے پہلے کی بات ہے کہ ترقی اردو نے اپنے کتابچے "تصنیف و تالیف" میں مجوزہ "اردو۔ اردو لغت" کے بعض اندراجات شائع کیے تھے۔ ان کے مطالعے سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ لغت کی تدوین و ترتیب میں توجہ اور دقتِ نظر سے کم ہی کام لیا گیا ہے اور اس کے لیے جو رہنما اصول وضع کیے گئے تھے، ان کی پابندی نہیں کی گئی ہے۔ بعض مثالوں سے میں نے اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت کر دی تھی اور ترقیٔ اردو بورڈ سے درخواست کی تھی کہ نظرِ ثانی کے بعد ہی لغت کی اشاعت کی جائے۔

میرا نوٹ جن لوگوں نے دیکھا ہوگا، انھیں یہ بھی یاد ہوگا کہ اس میں میرا لہجہ نہ تو جارحیت کا شکار ہوا اور نہ ہی میں نے کسی کو طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا تھا۔ مجھے اس کا کوئی علم نہیں تھا کہ جن الفاظ سے میں نے بحث کی تھی، ان کا مرتب کون تھا۔

اب ۸/ جولائی ۱۹۷۸ء کے "ہماری زبان" میں اسی موضوع پر پروفیسر نذیر احمد کا نوٹ دیکھا تو سخت حیرت ہوئی کہ ہم جن کی بزرگی کو مثال میں پیش کرتے آئے ہیں وہ صاحب تو کسی اور لب و لہجے کے مالک

نکلے۔ ابھی حال ہی میں مجھے اطلاع ملی ہے کہ لغت کے جن الفاظ پر میں نے بحث کی تھی ان کی ترتیب کا کام پروفیسر نذیر احمد کے سپرد ہوا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میرا نوٹ دیکھنے کے بعد مہدی افادی کے الفاظ میں:

> ''ان کے دل کی جمی ہوئی سیاہی لغزشِ قلم سے ٹپکی اور بری طرح ٹپکی۔''

غالباً پروفیسر صاحب کو اس کا علم ہے کہ میں علمی مباحث میں گالیوں کا جواب دعاؤں سے دیتا آیا ہوں ورنہ بایں جبہ و دستار سنگ اٹھاتے ہوئے انھیں سر ضرور یاد آتا!

مجھے ہرزہ سرائی نہیں آتی، اب جو میں نے کچھ اور لکھنا چاہا تو شرافتِ نفس نے میرا قلم روک دیا لیکن شرافتِ علم نے مجھے مجبور کیا کہ اگر اب اس منزل پر میں نے خاموشی اختیار کی تو لغت کے ساتھ جو نا انصافی ہو رہی ہے، اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ میں لغت کو جامع اور وقیع دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسی جذبے کے ساتھ میں نے پہلے بھی قلم اٹھایا تھا اور اسی جذبے کے ساتھ:

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے!

(۲)

پروفیسر نذیر احمد کا نوٹ پڑھ کر میں عرقِ انفعال میں ڈوب گیا کہ یا اللہ ایسے ثقہ لوگ دوسروں کی عبارت میں تصرفِ بے جا تو در کنار، تحریف کرتے ہیں تحریف؟

میں نے ''دیرپا'' کے ضمن میں کہا تھا کہ یہ پائیدن کا ''اسم فاعل سماعی'' ہے۔ میں اگر اسے مطلق ''اسم فاعل'' کہتا تو چنداں مضائقہ نہیں تھا۔ مگر میں نے اس کی روایتی ذیلی تقسیم پر اس لیے زور دیا تھا کہ لفظ زیرِ بحث کا اس سے ایک ربط خاص تھا۔ مگر آیئے اور دیکھیے کہ غالبؔ کے پرزے کس جرم میں اڑے ہیں۔ پروفیسر صاحب نے میرے ''اسم فاعل سماعی'' کو اپنے ''اسم فاعل قیاسی'' سے بدل دیا۔ یہ بات یہیں ختم نہیں ہوئی، انھوں نے ارشاد فرمایا:

> ''اس طرح کا انتساب محمود الٰہی جیسے فاضل کی طرف مشکل معلوم ہوتا ہے کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ کسی طالب علم نے ان کے نام سے یہ یادداشت شائع کر دی ہو۔''

ناطقہ سر بگریباں ہے، اسے کیا کہیے۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب اپنی یادداشت شائع کریں میرے نام

ہے۔

(۳)

مجھ ذرۂ بے مقدار پر جو ایرادات ہوئے ہیں وہ مبنی تھے تین نکات پر۔ ایک کا ذکر اوپر آ چکا ہے، اب دوسرا نکتہ بھی ملاحظہ کیجیے۔ زیادہ مناسب یہ ہے کہ ۱۵ رمئی ۱۹۷۸ء کے شمارے میں میرا جو نوٹ شائع ہوا تھا اور اس کی جس عبارت پر پروفیسر نذیر احمد مہربان ہوئے ہیں، پہلے وہ عبارت ملاحظہ کر لیجیے:

> ”لغت کے مرتبین نے لفظ پا کو پائندہ کا مخفف بتایا ہے اور مثال میں ”دیرپا“ کو پیش کیا ہے۔ دراصل یہ پائیدن کا اسم فاعل سماعی ہے۔ پابوس کے بارے میں جو تصریح کی گئی ہے، وہی دیرپا پر بھی صادق آتی ہے۔ اگر مرتبین کا نقطۂ نظر درست تسلیم کیا جائے تو پھر پابوس کے ”بوس“ کو بوسندہ کا مخفف لکھنا چاہیے نہ کہ اسم فاعل۔ کیا بت پرست، بندہ پرور، نامہ بر، وغیرہ کے آخری الفاظ محض مخففات ہیں؟“

میں نے اس عبارت کا کوئی لفظ حذف نہیں کیا ہے۔ یہ عبارت اس امر کی وضاحت کے لیے لکھی گئی تھی کہ ”دیرپا“ اور ”پابوس“ کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جائے۔ چونکہ دونوں کو ازروئے صرف ایک حیثیت حاصل ہے یعنی دونوں اسم فاعل ہیں اس لیے لغت کے مرتبین کو دہرا معیار قائم کرنے کا حق نہیں ہے۔

عبارت بہت واضح تھی مگر پروفیسر صاحب نقص نکالنے پر تلے ہوئے تھے۔ انھیں ایک بات سوجھی کہ دیرپا کے ”پا“ کو ”دیر“ سے الگ کر دیا جائے اور پھر اس ”پا“ کو ”پابوس“ کے مدِ مقابل لا کر اپنی قابلیت کے مظاہرے کا موقع فراہم کیا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے بہت باریک مگر بے حد مضبوط جال بچھایا۔ اور پہلے تو بڑے اہتمام سے یہ تمہید قائم کی:

> ”موصوف کے (محمود الٰہی کے) اعتراض کے آخری جملے میں سیاق کا تقاضا ہے کہ ضمیر اشارہ ”یہ“ کا مرجع ”پا“ قرار دیا جائے۔ نہ ”دیرپا“۔“

پہلے تو انھوں نے اس جملے کے ”آخری“ ہونے کا اعلان کیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک ماقبل سے

مابعد کا رشتہ منقطع نہیں کیا جائے گا۔ رہی سہی بات بھی بگڑ جائے گی ـــــ پھر تقاضائے سیاق کی اہمیت بتائی اور آخر میں ایک غلط مرجع کا تعین کر دیا۔

میں پروفیسر نذیر احمد صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ سیاق عبارت کا مفہوم کیا ہے؟ ضمیر زیرِ بحث کا مرجع ”دیرپا“ کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس سے قوی تر قرینہ کیا چاہیے کہ جب میں نے یہ لکھا کہ یہ پائیدن کا اسم فاعل سماعی ہے تو معا بعد یہ بھی لکھ دیا کہ ”پابوس“ کے بارے میں جو تصریح کی گئی ہے وہی ”دیرپا“ پر بھی صادق آتی ہے۔ کیا موصوف یہ بھول گئے کہ پابوس کی کیا تصریح انھوں نے کی تھی؟ میں انھیں یاد دلا دوں کہ انھوں نے اسے اسم فاعل بتایا تھا اور میں یہی چاہتا تھا کہ دورنگی ترک کی جائے اور پابوس کی طرح ”دیرپا“ کو بھی اسم فاعل بتایا جائے۔ کیا ان کو یہ نظر نہیں آیا کہ پابوس والی تصریح کا مطالبہ میں نے ”پا“ کے لیے نہیں بلکہ ”دیرپا“ کے لیے کیا تھا؟

کیا موصوف کو یہ بھی خیال نہیں آیا کہ میں نے کسی لفظ کے مخفف ہونے کا انکار نہیں کیا میں لغت میں الفاظ کی صرفی حیثیت کی بھی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ اسی لیے میں نے اسم فاعل سماعی کی بعض مثالیں پیش کیں اور ان کے فعل کو اسم وغیرہ سے الگ کر کے پوچھا کہ کیا لغت کے مرتبین ان کو محض مخففات کہہ لینے پر اکتفا کریں گے، ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی میں ہوتا اور وہ اصلاح کر لیتے۔ کیا پروفیسر صاحب نے ساز، آفریں، دار، کش، فریب، بند، زن، سوز وغیرہ کو جب پہلی بار لغت میں جگہ دی ہے تو ان الفاظ کے استعمال کی ایک اور مثال کے ضمن میں انھیں مخفف لکھا ہے؟ اب اس کا وہ کچھ بھی جواب دیں، ”تصنیف و تالیف“ کے اندراجات تو کوئی اور ہی کہانی سنا رہے ہیں۔

اس کا انکار کون کرے گا کہ ”دیرپا“ ایک ضمنی اندراج ہے۔ لیکن ”تصنیف و تالیف“ میں دوسرے ضمنی اندراجات کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا، اس سے ”دیرپا“ کیوں محروم ہے؟ میں نے یہی تو کہا تھا کہ اصول و عمل میں کوئی تال میل نہیں۔

(۴)

میں نے عبارت زیرِ بحث میں ایک جگہ لکھا تھا:

''کیا...... محض مخففات ہیں؟''

موصوف نے اسے کیا...... مخففات ہیں'' کردیا!

گویا جملہ مسخ کر کے مفہوم ہی بدل دیا۔ میرے جملے کا مفہوم یہ تھا کہ یہ صرف مخففات نہیں بلکہ ان کے علاوہ کچھ اور ہیں۔ موصوف یہ ثابت کرنے لگے کہ میں مخففات کی حقیقت اور ماہیت ان سے دریافت کر رہا ہوں اور جواب میں بڑی بصیرت افروز تقریر کی۔ انھوں نے پہلے تو اس امر کی وضاحت کی کہ تخفف کسے کہتے ہیں، پھر اس کے متبادل لفظ ''ترخیم'' کا تعارف کرایا اور غیاث اللغات سے سند پیش کی اور ساتھ ہی تنبیہ بھی کردی کہ دیکھو اسے عروضی ترخیم پر محمول نہ کرلینا۔ پھر یکا یک مثالوں کے پشتارے سے حملہ کردیا اور اس دھڑ پکڑ اور مار دھاڑ میں میرے جملے کی ترخیم یعنی تخفیف ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون:

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

(۵)

میں نے اپنے نوٹ میں کہا تھا کہ اصول و عمل میں کوئی تال میل نہیں ہے اور کئی مثالیں ثبوت کے طور پر پیش کی تھیں۔ مثلاً پامال، پائمال وغیرہ۔ ان کی کوئی توجیہ نہیں کی گئی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن خامیوں کی نشاندہی میں نے کی تھی، انھیں پروفیسر صاحب بھی خامیاں مانتے ہیں۔

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے میں ایک ایسی بات کہنا چاہتا ہوں جس کی اجازت میرا صحیفۂ اخلاق نہیں دے سکتا اور جس پر ہمیشہ میرا ضمیر نادم رہے گا۔

لغت کی بحث کے ضمن میں اسم فاعل، صفت مشبہ اور ترخیم پر پروفیسر نذیر احمد کے بیانات دیکھ کر میں انگشت بدنداں رہ گیا۔ میں کیوں کر یقین کروں کہ جس عالم نے فارسی زبان و ادب کی تدریس و تحقیق میں ایک عمر گزاری ہو، وہ یہ کہے گا:

(الف) ''اسم فاعل قیاسی امر واحد حاضر پر بغیر اسم یا صفت یا کبھی ''قید'' کے اضافے کے نہیں بن سکتا''

(ب) ''فارسی میں اسم فاعل قیاسی کو اسم فاعل مرخم بھی کہتے ہیں۔''

میں ان بیانات پر تبصرہ کرنے کا حق نہیں رکھتا، لیکن اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ کسی علم کے مسلمات پر

اظہار خیال کرتے ہوئے متعلقہ مستند کتابوں کو ضرور دیکھ لینا چاہیے تاکہ مبتدیوں کو بزرگ معاصرین پر حرف گیری کا موقع نہ مل سکے۔

(٦)

لغت کی خامیوں کے باب میں مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ میں نے ایک بار نہیں دو بار کہا، پہلی بار اختصار کے ساتھ اور اب کے ہجے کر کے بتایا۔ اب میں مزید کچھ نہیں کہنا چاہتا اس لیے میری طرف سے اس بحث کو ختم سمجھا جائے۔ اور "اردو لغت اور ترقی بورڈ" کے موضوع پر یہ میری آخری تحریر تصور کی جائے:

حسد، سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجے
ستم، بہائے متاع ہنر ہے، کیا کہیے

("ہماری زبان"، دہلی، ۲۲ راگست ۱۹۷۸ء)

حاشیہ

ا۔ مجھے افسوس ہے کہ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے جب میرے الفاظ کے نقطے گنے تو ان میں کچھ کمی بیشی پائی گئی۔ میں سود وزیاں کی ساری ذمے داری اپنے سر لیتا ہوں۔ یہاں تک کہ ان نقطوں کی قطع و برید کا انتساب میں اپنی طرف کیے لیتا ہوں۔

☆☆☆☆

مرزا نسیم بیگ

اردو ڈکشنری بورڈ: ایک جائزہ

اردو ڈکشنری بورڈ (سابق ترقیٔ اردو بورڈ) ۱۹۵۸ء میں قائم ہوا۔ اس کا قیام وزارتِ تعلیمات، حکومت پاکستان، کی ایک قرارداد مورخہ ۱۴/ جون ۱۹۵۸ء کے ذریعے عمل میں آیا جس میں درج تھا کہ یہ ادارہ آکسفورڈ انگلش ڈکشنری (کلاں) کی نہج پر اردو کی ایک جامع لغت کی تدوین کے علاوہ اردو کی ترقی کے سلسلے میں وہ ضروری کام بھی انجام دے گا جو حکومتِ پاکستان اسے تفویض کرے۔ بورڈ کے ارکان مندرجہ ذیل تھے:

۱۔ جناب ڈاکٹر ممتاز حسن۔ سیکریٹری وزارتِ مالیات، حکومت پاکستان۔
۲۔ ڈاکٹر بیگم شائستہ اکرام اللہ صاحبہ۔
۳۔ جناب عترت حسین زبیری۔ وزارتِ تعلیمات، حکومت پاکستان۔
۴۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق۔ صدر انجمن ترقی اردو (اعزازی مدیر اعلیٰ اردو لغت)۔
۵۔ جناب جوش ملیح آبادی۔ (مشیر ادبی و مدیر لغت)
۶۔ ڈاکٹر محمد شہید اللہ۔ صدر شعبۂ بنگالی، راج شاہی یونیورسٹی۔

۷۔ جناب رازق الخیری۔ مدیر عصمت، کراچی۔

۸۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی۔ صدر شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی۔

۹۔ جناب شان الحق حقی۔ وزارت اطلاعات ونشریات، حکومت پاکستان۔

۱۰۔ جناب پیر حسام الدین راشدی۔ سندھی ادبی بورڈ۔

۱۱۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور۔

۱۲۔ جناب عبدالحفیظ کاردار۔

ابتدائی دو سال دفتر کے لیے عمارت کے حصول کے علاوہ مختلف شعبوں کے لیے عملے، مدیروں، نائب مدیروں اور معاون مدیروں کے تقرر اور دوسرے ضروری انتظامات میں صرف ہوئے، اس سلسلے میں سب سے پہلی ضرورت اردو کی ایک جامع لائبریری کا قیام تھا جس میں اردو ادب کا کامل ذخیرہ، اردو، فارسی، عربی، سنسکرت، انگریزی اور دیگر زبانوں کی مختلف لغات کے علاوہ کتب استناد اور مختلف علوم وفنون کی کتابیں موجود ہوں۔ جب کام کا آغاز ہوا تو بورڈ کے پاس ایک کتاب بھی نہیں تھی، اب بفضلِ تعالیٰ یہاں ایک نادر کتب خانہ موجود ہے جو بورڈ نے اپنے محدود وسائل سے کام لے کر رفتہ رفتہ بڑی تلاش اور کوشش سے فراہم کیا ہے، اس میں بعض نایاب کتب اور قلمی نسخوں کی مائیکروفلم بھی شامل ہیں جو انڈیا آفس لائبریری (لندن میوزیم) سے حاصل کر کے اس دور میں فوٹو پرنٹ بنوائی گئی تھی۔ اس وقت تک فوٹو اسٹیٹ متعارف نہیں ہوئی تھی۔

کتب خانے کے قیام کے ساتھ ساتھ اردو لغت کی تدوین کا کام بھی شروع ہو گیا اور سال بہ سال لغت کی ایک ایک جلد کی تدوین مکمل ہوتی رہی۔ ۱۹۶۰ء میں بورڈ نے اپنا سہ ماہی مجلہ اردو نامہ جاری کیا جس کے مدیر جناب جوش ملیح آبادی اور جناب شان الحق حقی رہے اور مجلس ادارت میں بورڈ کے بعض دوسرے اصحاب بھی شامل تھے۔ اردو نامہ ایک ممتاز علمی جریدہ شمار ہوتا ہے جو بیشتر لسانی مباحث سے تعلق رکھتا تھا اور اس لحاظ سے اردو صحافت کی تاریخ میں اسے ایک منفرد مقام حاصل ہے۔ اس رسالے کا ایک اشاریہ بھی بورڈ نے ۱۹۹۷ء میں شائع کیا ہے۔

۱۹۷۵ء میں جب اردو لغت کی پہلی جلد کی طباعت کا مرحلہ درپیش ہوا تو بورڈ نے محیط اردو پریس کے نام سے اپنا ایک پریس قائم کیا اس پریس سے اب تک اردو لغت کی انیس (۱۹) جلدیں (الف مقصورہ سے حرف تک کے الفاظ پر مشتمل) شائع ہو چکی ہیں۔ ہر جلد بڑے سائز (۹x۱۱/۱) کے تقریباً ہزار ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور ہر صفحے میں دو کالم ہیں اور ہر کالم میں ۵۰ سطریں ہیں۔ اب اردو لغت کی بیسویں جلد زیرِ طبع ہے جو بہت جلد شائع ہو جائے گی۔ اردو لغت کا یہ منصوبہ ۲۲ جلدوں میں تکمیل پائے گا۔ آخری جلد اشاریہ، مآخذ کی فہرست اور دوسری ضروری معلومات پر مشتمل ہوگی۔ آئندہ جلدوں کے مسودات کی تدوین اور نظرِ ثانی بھی جاری ہے۔ ان کی تکمیل کے ساتھ ہی ساتھ لغت کے مختصر ایڈیشن کی تیاری کے لیے بھی کام ہو رہا ہے۔[۱]

بورڈ میں ایک اداراتی مشاورت کمیٹی ہمیشہ رہی ہے جس کا کام بورڈ کے منصوبوں کا جائزہ لینا اور فیصلوں کے مطابق ہدایات جاری کر کے عمل درآمد کرانا ہوتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے اس کمیٹی نے اردو لغت کے مجوزہ منصوبے کے اصول ترتیب وتسوید وضع کیے۔ یہ ضابطہ فل اسکیپ سائز کے ۲۴ صفحات پر طبع ہوا ہے جس کی روشنی میں عملہ ادارت لغت کی تدوین کا کام انجام دیتا ہے۔ تیار شدہ مسودات پر نظرثانی کا کام بھی یہ کمیٹی انجام دیتی تھی۔ اس مجلس کے اعزازی ارکان پاکستان کے مختلف شہروں سے ان کی علمی لیاقت اور تجربے کی بنیاد پر منتخب کیے جاتے تھے۔ اس مجلس میں مندرجہ ذیل اہل علم شامل رہ چکے ہیں:

ڈاکٹر مولوی عبدالحق، علامہ نیاز فتح پوری، ڈاکٹر محمد شہیداللہ، جناب جوش ملیح آبادی، پروفیسر حمید احمد خاں، جناب مجنوں گورکھ پوری، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر عندلیب شادانی، پروفیسر محمد طاہر فاروقی، ڈاکٹر سید عبداللہ، جناب شان الحق حقی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر آفتاب احمد، ڈاکٹر یحییٰ احمد ہاشمی، ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، جناب ممتاز حسن (سی ایس پی)، جناب ہادی حسین (سی ایس پی ومنصف)، جناب محمد اظفر (سی ایس پی)، ڈاکٹر جمیل جالبی (ستارۂ امتیاز)، ڈاکٹر جمیل الدین

عالی (ہلال امتیاز)، پروفیسر کرار حسین، جناب شریف الحسن، جناب محمد سلیم الرحمن، جناب محمد احسن خاں، جناب وارث سرہندی، جناب حفیظ ہوشیار پوری، ڈاکٹر شوکت سبزواری، جناب نسیم امروہوی، جناب ہاشمی فرید آبادی، پروفیسر وقار عظیم، جناب انوارالحق جیلانی، جناب سراج احمد علوی، ڈاکٹر سہیل بخاری، جناب محمد رفیق خاور، جناب عبدالخلیق نقوی، جناب خواجہ حمیدالدین شاہد، پروفیسر مجتبیٰ حسین، ڈاکٹر عبدالقیوم، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر اکبر حسین قریشی، ڈاکٹر الٰہی بخش اعوان، ڈاکٹر ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر قاضی محمد مرتضیٰ اور ڈاکٹر سید شاہ علی وغیرہ۔ [یہ فہرست نامکمل ہے، مرتب]

بورڈ کا دفتر ۱۹۵۸ء سے ۱۹۸۴ء تک کراچی شہر کے مختلف علاقوں میں کرائے کی عمارتوں میں کام انجام دیتا رہا۔ ۱۹۸۴ء سے یہ دفتر اپنی ذاتی عمارت واقع گلشن اقبال (نیپا چورنگی) میں واقع ہے۔ یہ کام بورڈ کے سابق صدر جناب محمد اظفر صاحب کی ذاتی کوشش اور وفاقی وزارتِ تعلیمات کی خصوصی اعانت کی وجہ سے ممکن ہو سکا۔ اس وقت بورڈ کا دفتر انتظامی طور پر ان شعبوں میں منقسم ہے:

(۱) شعبۂ انتظامیہ (۲) کتب خانہ (۳) طباعت و کمپوزنگ اور (۴) شعبۂ ادارت۔

لغت نگاری ایک بہت ہی مشکل فن اور کٹھن کام ہے، اس میں بہت تحقیق اور چھان بین کی جاتی ہے جو بہت پتا ماری کا کام ہے۔ اس کام کا خشک پن، اکتاہٹ اور بیزاری پیدا کرتا ہے۔ اس کام کے لیے ایک خاص ذہن اور صلاحیت درکار ہوتی ہے۔ اردو ڈکشنری بورڈ میں اردو لغت کے جس منصوبے پر تاریخی اصولوں پر کام ہو رہا ہے یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد عظیم منصوبہ ہے جس کی مثال دنیا کی صرف دو زبانوں میں ملتی ہے۔ ایک آکسفورڈ انگلش ڈکشنری جس کی ۷۰ برس میں ۱۲ جلدیں شائع ہوئی تھیں اور دوسری مثال جرمنی اکیڈمی آف سائنس ان برلن اور انسٹی ٹیوٹ گوٹن گن کے زیرِ نگرانی جرمن زبان میں ۱۶ جلدوں پر مشتمل (۳۲ حصوں میں) ۱۹۶۱ء میں یہ کام انجام پایا۔ اب اردو ڈکشنری بورڈ میں زیرِ تدوین لغت کے مراحل ملاحظہ ہوں۔

سب سے پہلے مرحلہ منتخب کتابوں کا مطالعہ اور ان میں سے الفاظ اور اسناد کا اخذ کرنا ہے۔ اس کام میں بورڈ کے مختصر عملے کے علاوہ چار پانچ سو بیرونی معاونین نے بھی اعزازی یا نیم اعزازی طور پر شرکت کی۔ مطالعہ کتب قدیم دکنی دور سے لے کر زمانہ حال کی تصنیفات و تالیفات پر محیط ہے۔ اس میں دورِ حاضر کے پاکستانی مصنفین کی نگارشات بھی شامل ہیں۔ سند اور معیار کے بارے میں ادارے نے وسعت نظر سے کام لیا ہے اور اسے کسی مقام یا علاقے تک محدود نہیں رکھا۔ مطالعہ کرنے والوں میں پورے پاکستان (بشمول سابق مشرقی پاکستان) سے مختلف جگہ کے لوگوں کو شریک کیا گیا تا کہ یہ عظیم و ضخیم لسانی تالیف صحیح معنی میں ایک قومی کارنامہ قرار پا سکے۔

مطالعۂ کتب کے بعد فراہمی اسناد کا مرحلہ آتا ہے یعنی مطالعہ کتب سے اخذ کردہ الفاظ و اسناد کو انڈکس کارڈوں پر الگ الگ تحریر میں لانا اور پھر ان کارڈوں کو حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دینا جو بڑی دیدہ ریزی کا کام ہے۔ کیونکہ اردو لغت میں الفاظ کی ترتیب جدید لسانی اصولوں پر رکھی گئی ہے یعنی: ا، آ، ب، بھ، پ، پھ، ت، تھ، ٹ، ٹھ، ث، ج، جھ، چ، چھ، ح، خ، د، دھ، ڈ، ڈھ، ذ، ر، رھ، ڑ، ڑھ، ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، کھ، گ، گھ، ل، لھ، م، مھ، ن، نھ، و، ہ، ء، ی، ے۔ اسناد کارڈوں کا یہ ذخیرہ اب تقریباً بارہ لاکھ کارڈوں پر مشتمل ہے، یہ تمام اسناد اردو لغت میں مندرج تین لاکھ الفاظ کے معنی کی تائید اور شہادت میں استعمال کی جا رہی ہیں۔

فراہمی اسناد کے بعد لغت کی تدوین کا اہم مرحلہ آتا ہے۔ اس مرحلے پر ہر لفظ کا اندراج ایک بڑے تشریح کارڈ پر ہوتا ہے۔ لفظ کے اندراج کے بعد اس کا تلفظ، اعراب مکتوبی اور بریکٹ میں اعراب ملفوظی کے ذریعے بتایا جاتا ہے پھر قواعدی حیثیت (اسم، ضمیر، صفت، فعل، حرف، متعلق فعل، فقرہ، محاورہ، روزمرہ، بول چال، مقولہ، کہاوت، فجائیہ، حکایت الصوت وغیرہ) مع تذکیر و تانیث درج کی جاتی ہے۔ اس کے بعد معنی کی تقسیم ہوتی ہے اور لفظ کے مترادفات دینے کے بجائے ہر معنی کی جامع تشریح مع اسناد اور حوالوں کے درج کی جاتی ہے۔ اس میں ایک معنی کے

لیے جو اسناد درج کی جاتی ہیں ان کے تین تاریخی دور قائم کیے گئے ہیں:

پہلا دور ولی دکنی پر ختم ہوتا ہے (ابتدا تا ۱۷۰۰ء)

دوسرا دور ولی سے غالب تک (۱۷۰۰ء تا ۱۸۵۷ء)

تیسرا دور غالب سے آج تک (۱۸۵۷ء تا حال)

اس طرح تاریخی طور پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ کسی لفظ کے یہ معنی پہلی بار کب رائج ہوئے اور کب تک رائج رہے یعنی ابتدا سے حال تک کیا تبدیلی اور ارتقا ہوا۔ تمام معنی درج کرنے کے بعد مذکورہ لفظ کی اصل اور مادے کا سراغ یعنی اشتقاق یا تجزیہ درج کیا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ یہ لفظ کس زبان سے آیا اور اب تک عہد بہ عہد تلفظ میں کیا تبدیلی واقع ہوئی۔ اصل لفظ کے اندراج کے بعد اس لفظ سے بننے والے مرکبات بھی اسی ترتیب کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں، اس موقع پر مندرجہ ذیل امور کا خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے:

۱۔ الفاظ کی صحت کا خیال رکھا جائے کیونکہ ایک لغت نویس سے دوسرے نے اور دوسرے سے تیسرے نے نقل کر کے اگر الفاظ داخلِ لغت کر دیے تو قاری کے لیے سند بن جاتے ہیں اور اس طرح غلطیاں راہ پاتی ہیں۔

۲۔ ہر مرکب ترکیب لغت قرار نہیں پاتی تاوقتیکہ وہ کوئی نئے معنی نہ دے اور اپنی انفرادیت نہ رکھتی ہو۔

۳۔ بلحاظ املا ایک ہی لفظ اشتقاق (اصل مادہ) یا زبان کی تبدیلی سے الگ الگ لفظ شمار ہوتا ہے مثلاً (فارسی: کار اور انگریزی: کار)

۴۔ کسی زبان کے اردو میں دخیل صرف وہی الفاظ داخلِ لغت کیے جائیں جو اردو میں رائج اور مقبول ہو گئے ہوں۔

۵۔ بلحاظ قواعد کسی لفظ کی ایک سے زیادہ حیثیت الگ الگ اندراج کی جاتی ہے۔

۶۔ فعل کے اندراج میں ماضی، حال اور مستقبل کے صیغوں کا اندراج نہیں کیا جاتا سوائے

رائج فقروں کے۔

۷۔ فقرے اور محاورات انکاریہ جملوں میں اندراج کے قابل نہیں ہوتے۔

۸۔ ہر علَم لغت کے دائرہ کار میں نہیں آتا سوائے ان اعلام کے جو بطور تلمیح استعمال ہوتے ہیں یا ان کی نسبت سے مزید الفاظ ترکیب نہ پا گئے ہوں یا پھر ان کے استعمال میں ندرت نہ پائی جائے۔

۹۔ املا کے لحاظ سے ایک سے زیادہ متبادل شکل رکھنے والے الفاظ الگ الگ اپنی ترتیب سے درج ہوتے ہیں۔

۱۰۔ بلحاظ تلفظ ایک سے زیادہ شکلیں رکھنے والے الفاظ بھی الگ الگ شمار کیے جائیں گے۔

۱۱۔ اردو کی جامع لغت میں ہر طرح کے الفاظ درج کیے جاتے ہیں، بشرطیکہ وہ اردو میں رائج رہے ہوں، خواہ وہ قدیم ہوں یا جدید، متروک ہوں یا رائج، قلیل الاستعمال ہوں یا کثیر الاستعمال، مقبول و مستند اور فصیح ہوں، عامیانہ ہوں یا سوقیانہ، فحش ہوں یا بازاری، خواہ مفرد ہوں یا مرکب صورت میں اور از روے قواعد اسم، ضمیر، صفت، حرف، فعل، متعلق فعل، اصطلاح، محاورہ، فقرہ، روز مرہ، بول چال، کہاوت، تلمیح، سابقہ، لاحقہ، حکایت الصوت اور حکایت الصوت سے بننے والے الفاظ و مصادر، سب لغت میں جگہ پاتے ہیں۔

بورڈ نے اپنی توجہ بیشتر اپنے منصوبۂ لغت پر مرکوز رکھی ہے جو بہر حال اس کا اصلی اور مقدم کام ہے لیکن ابتدا اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے بھی کچھ کام انجام دیے، مثلاً: اردو ٹائپ رائٹر کے لیے "کی بورڈ' کی تیاری اور اردو ٹائپ کا فروغ وغیرہ۔ اردو لغت کے اس بڑے منصوبے کے ساتھ ساتھ بورڈ نے وقتاً فوقتاً کچھ کتابیں بھی شائع کیں جن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

☆ خاور نامہ: اردو کی پہلی رزمیہ مثنوی جو ۲۴ ہزار ابیات پر مشتمل ہے اور پہلی بار بورڈ نے شائع کی۔

☆ جذبات نادر (حصہ اول و دوم) مرتبہ ڈاکٹر ممتاز حسن مرحوم)

☆ مقالات اختر: محقق جناب قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی کے مضامین کا مجموعہ (پہلی بار)

☆ رسوم دہلی: از مولوی سید احمد دہلوی مولف فرہنگ آصفیہ۔

☆ مخطوطات پیرس: پیرس کے کتب خانوں میں اردو، فارسی، پنجابی اور سندھی کے مخطوطات کی فہرست مرتبہ ڈاکٹر آغا ز افتخار حسین۔

☆ منازل السائرہ: علامہ راشد الخیری مرحوم کا مشہور ناول مرتبہ مولانا رازق الخیری۔

☆ منتخب الحکایات: مولوی نذیر احمد کی ناپید تصنیف، پاکستان میں پہلی بار، مرتبہ شاہد احمد دہلوی۔

☆ مرآۃ العروس: مولوی نذیر احمد کے اولین ناول کا نیا ایڈیشن، مرتبہ ڈاکٹر بیگم شائستہ اکرام اللہ۔

☆ اردو کی پہلی کتاب: مولانا محمد حسین آزاد کی ''کلاسیکل'' اردو ریڈریں (اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب ہم جلد) مرتبہ ڈاکٹر اسلم فرخی۔

☆ ترکی اردو لغت: مرتبہ ڈاکٹر محمد صابر

☆ میٹھی کہانیاں: (بچوں کے لیے) مصنفہ ابوتمیم فرید آبادی، ۵ حصے۔

☆ تاریخی کہانیاں: (بچوں کے لیے) مصنفہ ابوتمیم فرید آبادی، ۴ حصے۔

☆ انتخاب پھول: بچوں کا رسالہ پھول (جو ۱۹۰۹ء سے ۱۹۵۷ء تک جاری رہا) کا انتخاب از غلام عباس۔

☆ اشاریہ اردو نامہ: مرتبہ مصباح العثمان، یہ ان مضامین کا اشاریہ ہے جو بورڈ کے سہ ماہی مجلّہ اردو نامہ میں شائع ہوئے، یہ رسالہ ۱۹۷۷ء تک جاری رہا۔

اردو لغت کی ۲۲ جلدوں میں اردو ڈکشنری بورڈ کے اس منصوبے کی تکمیل ایک سعادت ہے نہ صرف پاکستان اور پاکستانی قوم کے لیے بلکہ پوری اردو دنیا کے لیے کہ اس کی بدولت اردو کو دیگر زبانوں پر ایک فوقیت اور اعزاز حاصل ہو رہا ہے جو دنیا کی صرف دو زبانوں انگریزی اور جرمن کو حاصل رہا ہے، پاکستان کی طرف سے اردو دنیا کے لیے بیسویں صدی کے اختتام پر اور اکیسویں صدی میں داخلے کے لیے اس اعزاز سے بڑا تحفہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ سر سید احمد خاں، بابائے اردو

ڈاکٹر مولوی عبدالحق اور دیگر زعمائے ملت کی آرزوؤں کی تکمیل بھی ہے۔

اکابرین اردو لغت بورڈ[۲]

صدور	مدت عہد
ممتاز حسن	۱۹۵۸ء-۱۹۷۴ء
محمد ہادی حسین	۱۹۷۵ء-۱۹۸۲ء
محمد اظفر	۱۹۸۲ء-۱۹۸۹ء
ڈاکٹر جمیل جالبی	۱۹۹۰ء-۱۹۹۷ء
جمیل الدین عالی	۱۹۹۹ء-۲۰۰۱ء
ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۲۰۰۱ء-۲۰۰۷ء

مدیران اعلیٰ	مدت عہدہ
ڈاکٹر مولوی عبدالحق	۱۹۵۸ء-۱۹۶۱ء
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۱۹۷۶ء-۱۹۸۵ء
ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۱۹۸۵ء-۱۹۹۵ء
ڈاکٹر حنیف فوق	۱۹۹۵ء-۱۹۹۸ء
پروفیسر سحر انصاری	۱۹۹۸ء-۲۰۰۰ء
مرزا نسیم بیگ (قائم مقام)	۲۰۰۰ء-۲۰۰۱ء
ڈاکٹر یونس حسنی	۲۰۰۱ء-۲۰۰۳ء
ڈاکٹر رؤف پاریکھ	۲۰۰۳ء-۲۰۰۷ء
فرحت فاطمہ رضوی (قائم مقام)	۲۰۰۷ء-۲۰۰۹ء

محترمہ فہمیدہ ریاض	(۲۰۰۹ء تا حال)
معتمدین	**مدتِ عہدہ**
عبدالحفیظ کاردار	۱۹۵۸ء۔۱۹۵۹ء
ڈاکٹر شان الحق حقی	۱۹۵۹ء۔۱۹۷۶ء
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	۱۹۷۶ء۔۱۹۸۵ء
ڈاکٹر فرمان فتح پوری	۱۹۸۵ء۔۱۹۹۵ء
ڈاکٹر حنیف فوق	۱۹۹۵ء۔۱۹۹۸ء
پروفیسر سحر انصاری	۱۹۹۸ء۔۲۰۰۰ء
ڈاکٹر یونس حسنی	۲۰۰۱ء۔۲۰۰۳ء
ڈاکٹر رؤف پاریکھ	۲۰۰۴ء۔۲۰۰۷ء

(مشمولہ "اخبار اردو"، اسلام آباد، ستمبر ۲۰۱۰ء)

حواشی

(۱) یہ مضمون ۲۰۰۴ء میں لکھا گیا تھا۔ الحمد للہ، ۲۰۱۰ء میں اس لغت کی بائیسویں جلد کی طباعت کے ساتھ ہی لغت کی اشاعت مکمل ہوگئی۔ البتہ اشاریہ/مآخذ پر مشتمل جلد تادمِ تحریر (جولائی ۲۰۱۴ء) شائع نہیں ہوسکی ہے (مرتب)

(۲) یہ مضمون خاصا پہلے لکھا گیا تھا جب بیسویں جلد زیرِ طباعت تھی۔ تاہم یہاں ۲۰۱۰ء تک مختلف عہدوں پر کام کرنے والوں کے نام دیے گئے ہیں (مرتب)

☆☆☆☆

رؤف پاریکھ

اردو لغت (تاریخی اصول پر): تعبیر و تاریخ

الحمدللہ، اردو لغت بورڈ کی مرتبہ عظیم و ضخیم لغت ''اردو لغت (تاریخی اصول پر)''، جو بائیس جلدوں پر مشتمل ہے اور بجا طور پر اردو کی جامع ترین لغت کہی جا سکتی ہے، تکمیل سے ہم کنار ہوگئی۔ باون سال کی محنت ٹھکانے لگی، سید احمد خان اور بابائے اردو کا خواب پورا ہوگیا اور اردو دنیا کی ان عظیم زبانوں میں شامل ہوگئی جن میں ایسی ضخیم اور جامع لغات موجود ہیں۔ بلاشبہ یہ ایک عظیم کارنامہ اور اردو ادب اور زبان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ فللہ الحمد والشکر۔

اردو لغت بورڈ کا قیام جون ۱۹۵۸ء میں عمل میں آیا۔ اس کے قیام میں اس وقت کے وزارت تعلیم کے مشیر عترت حسین زبیری کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کا ابتدائی نام ترقیٔ اردو بورڈ تھا اور اس کے قیام کا بنیادی مقصد اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری کی طرز پر ایک ایسی اردو لغت کی تاریخی اصولوں پر تالیف و اشاعت تھی جس میں اردو کا ہر لفظ مع اسناد کے درج ہو، خواہ وہ لفظ رائج ہو یا متروک، قدیم ہو یا جدید، سوقیانہ ہو یا ادبی، فحش ہو یا ثقہ، تکنیکی ہو یا اصطلاحاتِ پیشہ وران سے ہو، اسے عورتیں بولتی ہوں یا عوامی زبان میں مستعمل ہو۔ بعض اوقات اردو کے کنایات اور مرادی معنوں کا جاننا ضروری ہو جاتا ہے مثلاً آبِ آتش رنگ یا بوتراب یا یارِ غار۔ اسی طرح بعض اعلام ایسے

ہیں جو مجازی معنی میں آ گئے ہیں مثلاً چنگیز خان بمعنی سفاک یا یوسف بمعنی نہایت حسین، یا اعلام سے صفات بنالی گئی ہیں مثلاً نادر شاہ سے نادر شاہی بمعنی آمرانہ (جیسے: نادر شاہی حکم) اور ہمالیہ سے ہمالیائی بمعنی بہت بڑا یا بڑی (جیسے: ہمالیائی غلطی)، یا اعلام سے اسم بن گئے ہیں مثال کے طور پر رستم سے رستمی بمعنی بہادری ا۔ بعض اعلام نہ صرف مجازی معنی میں رائج ہیں بلکہ محاورات کا بھی حصہ ہیں (جیسے: حاتم طائی کی قبر پر لات مارنا)، کچھ اعلام کہاوتوں میں شامل ہو گئے ہیں (جیسے: بارہ برس دلی میں رہے بھاڑ جھونکتے رہے یا کابل میں کیا گدھے نہیں ہوتے) اور چونکہ محاورات اور کہاوتوں کے الفاظ میں تبدیلی جائز نہیں سمجھی جاتی لہٰذا ان اعلام، الفاظ، محاورات، فقرات اور تراکیب کا اندراج اس لغت میں ہونا تھا اور بالعموم ہوا ہے۔ اس لغت میں اردو کا ہر لفظ نہ صرف اپنے تمام معانی، بشمول لغوی، مجازی، اطلاقی (connotative) اور نازک سے فرق (nuances) اور ان کی اسناد کے ساتھ آنا تھا (اور بالعموم آیا ہے) بلکہ اردو املا کے انتشار اور اس کے ارتقا دونوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ بھی ضروری ٹھہرا تھا کہ اس میں کسی لفظ کے تمام مروجہ املے بھی ان کی اسناد کے ساتھ درج کیے جائیں خواہ بعض لوگوں کی نظر میں وہ املا بظاہر کتنا ہی غلط کیوں نہ ہو اور چاہے وہ املا کتنا ہی قدیم کیوں نہ ہو (دراصل وہ املا غلط نہیں ہوتا محض قدیم ہوتا ہے کیونکہ وہ کسی زمانے میں رائج رہ چکا ہوتا ہے اور اہل علم اور اہل قلم نے اسے برتا بھی ہوتا ہے)۔ بعض لوگ بورڈ کی لغت پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اس میں ایک لفظ کے کئی املے دیے گئے ہیں اور معلوم نہیں ہوتا کہ کون سا درست ہے (مثال کے طور پر لفظ منھ کو منہ، مو، موں، مونہہ وغیرہ لکھا گیا ہے)۔ یہ اعتراض درحقیقت لاعلمی پر مبنی ہے۔ یہ لغت جن خطوط پر مرتب کی گئی ہے ان میں ایک بنیادی نکتہ یہ ہے کہ اس میں اردو کا ہر لفظ ہوگا چاہے وہ رائج ہو یا متروک، قدیم ہو یا جدید۔

اس لغت میں لفظ کی تمام، خواہ رائج خواہ متروک، شکلوں کو درج کرنے کے اس فیصلے کی وجہ ایک تو یہ تھی کہ بابائے اردو کے بقول لغت نویس کا کام صرف لفظوں اور ان کے معنی کو ریکارڈ کرنا ہے، اسے یہ اختیار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ یہ حکم لگائے کہ کون سا لفظ درست ہے اور کون سا غلط۔ ثانیاً،

جو لغت اس لغت کی طرح تاریخی اصولوں یعنی (philological principles یا historical principles) پر لکھی جائے اس کے لیے یہ لازم ہوتا ہے کہ وہ ہر دور کے ادب سے مثالیہ جملے بطور وضاحت پیش کرے، ان جملوں کے املا کو جوں کا توں درج کرے اور ان کے معنی میں تبدیلی یا تسلسل کو ریکارڈ کرے۔ لغت نویسی کے اصولوں کے مطابق کسی لفظ کے معنی اس کے استعمال میں تسلسل سے طے ہوتے ہیں اور اس تسلسل کو ظاہر اور ثابت کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس لفظ کے استعمال کی تحریری سند مختلف ادوار سے پیش کی جائے۔ اس مقصد کے لیے انگریزی کے پہلے ”با قاعدہ“ لغت نویس سیمویل جانسن نے ادبی شہ پاروں کو تین ادوار یعنی متقدمین، متوسطین اور متاخرین میں تقسیم کیا اور کسی لفظ کے کسی خاص معنی میں استعمال کو ان تینوں ادوار کے مستند شعرا اور نثر نگاروں کی تحریروں سے لیے گئے وضاحتی ٹکڑوں سمیت پیش کر دیا (یہ اور بات ہے کہ ایک زمانے کے معاصرین اگلے زمانے کے لحاظ سے متاخرین ہو جاتے ہیں)۔

معنی میں عدم تسلسل اور اس میں تبدیلی کی مثال کے طور پر یہاں ایسے دو الفاظ کا ذکر نامناسب نہ ہوگا جو اردو لغت بورڈ کی اس لغت میں آئے ہیں اور جن سے تاریخی اصولوں پر لکھی گئی لغت کی نوعیت کی کچھ وضاحت ہوتی ہے۔ ان میں سے ایک لفظ ”رنڈی“ ہے اور دوسرا ”مجرا“۔ آج ہم لفظ رنڈی کو چاہے جتنے برے معنوں میں استعمال کریں لیکن ابتدا میں اس کے معنی ”عورت“ نیز ”بیوی“ تھے۔ بورڈ کی لغت کی دسویں جلد میں اس لفظ کے استعمال کی اولین سند ”قصۂ مہر افروز و دلبر“ (۱۷۴۶ء) سے دی گئی ہے۔ اس کے بعد اسی معنی یعنی عورت یا بیوی کی سند دوسرے اور تیسرے ادوار کے ادب (مثلاً ۱۸۰۰ء کی مطبوعہ ”قصۂ گل و ہرمز“) سے بھی دی گئی ہے۔ (۱۸۰۲ء میں لکھی گئی ”باغ و بہار“ میں بھی رنڈی کا لفظ محض عورت کے معنی میں آیا ہے)۔ البتہ کم و بیش اسی دور میں لفظ رنڈی اپنے دوسرے معنی (یعنی زنِ فاحشہ، کسبی) میں بھی مستعمل ہونا شروع ہو گیا تھا اور اس کی سند میں سودا (متوفی ۱۷۸۰ء) کا ایک شعر پیش کیا گیا ہے۔ پھر بعد کے ادوار کی اسناد ہیں۔ رنڈی کے ایک معنی بیوہ بھی ہیں بلکہ یہ غالباً رانڈ (بمعنی بیوہ) ہی سے بنا ہے۔ اس کی سند بھی دی گئی ہے۔ لیکن بعد کے ادوار میں لفظ رنڈی کے عورت کے معنی میں مستعمل

ہونے کی اسناد نہیں ملتیں گویا اس سے یہ طے ہوتا ہے کہ اب اس لفظ کے یہ معنی رائج نہیں رہے۔

اسی طرح لفظ ''مجرا'' اب ''محفل میں طوائف کا ناچ گانا'' کے معنی میں برتا جاتا ہے لیکن اس لفظ کے اردو میں استعمال کی قدیم ترین مثال ۱۶۴۹ء کی تصنیف ''خاور نامہ'' میں ملتی ہے اور اس میں یہ سلام، آداب، بندگی اور تسلیمات کے معنی میں آیا ہے۔ سترھویں جلد میں یہ لفظ اس معنی میں دیا گیا ہے۔ اسی معنی میں یہ تسلسل سے ملتا ہے اور اس معنی کی آخری سند مشتاق احمد یوسفی صاحب کی ''آبِ گم'' (۱۹۹۰ء) سے دی گئی ہے۔ یعنی یہ لفظ سلام کے معنی میں اب بھی مستعمل ہے۔ اس کے ایک اور معنی بھی دیے گئے ہیں جو آج کل رائج بھی ہیں اور وہ ہیں: ناچ گانا جو بطور سلام کے امرا کے روبرو یا شادی بیاہ میں پیش کیا جائے (اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلام کے معنی سے ناچ گانا کے معنی کس طرح پیدا ہو گئے)۔ اس معنی کی بھی سند شاکر ناجی (متوفی ۱۷۴۱ء) کے ایک شعر سے پیش کی گئی ہے اور موجودہ دور تک اس لفظ کے استعمال کی اسناد ملتی ہیں۔ ان معنی کے علاوہ مجرا کے دیگر معنی بھی مع اسناد موجود ہیں۔ مختلف معنی کی طرح اگر ایک لفظ مختلف املوں کے ساتھ تحریری شکل میں پایا جاتا ہے تو اس کا بھی اندراج وانضباط اسی اہتمام کے ساتھ لازم ہے۔ یہ لغت صرف لغت ہی نہیں ہے بلکہ اردو املا (orthography) کی تاریخ اور اردو معنیات (semantics) کی تفسیر بھی ہے۔ لہٰذا بغیر سوچے سمجھے اس لغت پر تنقید کرنا گویا اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنا ہے۔

دوسرا اعتراض اس لغت پر بالعموم اسناد کے سلسلے میں ہے اور اس ضمن میں رشید حسن خاں اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے مسلمہ اہل علم ونظر بھی شاکی نظر آتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہر حال اس اعتراض میں کچھ نہ کچھ وزن ضرور ہے۔ یہ درست ہے کہ بعض الفاظ کے ساتھ طے شدہ اصولوں کے برخلاف اسناد نہیں دی گئیں اور صرف اس لغت کا نام دے دیا گیا ہے جہاں سے وہ لفظ لیا گیا ہے، مثال کے طور پر پلیٹس یا مہذب اللغات وغیرہ لکھ دیا گیا ہے۔ بعض الفاظ کی اسناد مل سکتی تھیں لیکن عملے کے تساہل کی وجہ سے وہ لغت میں موجود نہیں ہیں۔ اسی طرح یہ اعتراض بھی

صحیح ہے کہ کہیں کہیں اسناد کی نقل میں غلطی ہوگئی ہے یا کچھ اسناد خصوصاً اشعار براہ راست اور بنیادی مآخذات سے نقل کیے جانے کی بجائے ثانوی مصادر و منابع (مثلاً لغات یا تحقیقی و تنقیدی کتب) سے لے لیے گئے ہیں حالانکہ اصل کتاب سہل الحصول تھی۔ اسی طرح الفاظ کے استعمال کی اولین یا قدیم ترین سند بھی بسا اوقات نہیں دی جا سکی ہے جو تاریخی اصولوں پر مرتب کی گئی لغت کے لیے ضروری ہوتا ہے۔

ایک ادارے سے باہر بیٹھ کر اس کے مسائل سے لاعلم اور لاتعلق رہتے ہوئے یہ لکھ دینا تو بہت ہی آسان ہے کہ اس میں اسناد کی کمی ہے یا غیر مستند مآخذات (مثلاً اخبارات سے) سے اسناد لی گئی ہیں یا فلاں نسخہ نہیں دیکھا گیا۔ مگر ادارے میں رہتے ہوئے (جو اتفاق سے سرکاری ہے اور لامحالہ سرکاری دفاتر کی بعض ''خوبیاں'' لیے ہوئے ہے اور جو ہر دور میں حکومتِ وقت کی سردمہری کا شکار رہا اور کئی بار بند تک کر دینے کے نامناسب فیصلے کی بھینٹ چڑھتے چڑھتے بال بال بچا) کئی مسائل سے بیک وقت نبٹنا مثلاً بنیادی سہولتوں سے محروم مظلوم اور ناراض عملے سے کام لینا، ناکافی ادارتی عملے کے تمام کام چھڑوا کر اسے اسناد کی تلاش پر مامور کرنا، حکومت کے منظور شدہ بجٹ سے عملے کی تنخواہوں کی رقم کے وزارت خزانہ سے حصول کے لیے باقاعدہ مہم چلانا، مختلف وفاقی وزارتوں کے لایعنی، غیر متعلقہ اور اور غیر ضروری خطوط کا جواب دینا، منظور شدہ رقم کی وصولی کے قطعی جائز، قانونی اور سرکاری کام کے لیے اے جی پی آر کے افسران کی منت کرنا (بسا اوقات ہم سے فنڈ کے اجرا کے لیے رشوت بھی طلب کی گئی)، بجلی کی عدم فراہمی سے نبرد آزما تیس سال پرانی طباعتی مشینوں سے چھپائی کا کام لینا اور پھر ساتھ ساتھ لغت کی تحقیق، تدوین اور تسوید کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ لیکن بہرحال یہ تمام عذر ادارے سے باہر کے لوگوں کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتے اور نہ ہی لغت میں رہ جانے والی خامیوں کا جواز بن سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں کوتاہی کا اعتراف کرنا اور اشاعتِ ثانی میں ان کی تصحیح کا عزم ہی درست رویہ ہے۔

لطف کی بات یہ ہے کہ جن ہم وطنوں نے اس لغت پر نکتہ چینی کی، خصوصاً بعد کے دور میں

، شاید ہی ان میں سے کسی نے اس عظیم قومی اور علمی کام میں ہاتھ بٹایا ہو (معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ دورِ حاضر کے نکتہ چینوں کی اکثریت اس کی اہل بھی نہیں تھی کہ اس لغت کے اصول ہی سمجھ لے چہ جائے کہ کسی قسم کا ہاتھ بٹا سکے۔ راقم سے کئی بار مختلف لوگوں نے فون کر کے کہا کہ فلاں لفظ اس لغت میں نہیں ہے اور انھیں لغت میں اندراج کا طریق کار سمجھانا پڑا اور بعض وقت تو اس جلد کا نمبر اور صفحہ نمبر تک بتانا پڑا جس میں اس لفظ کا اندراج موجود تھا)۔ البتہ محمد احسن خان اور محمد سلیم الرحمٰن جیسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے محض برائے نام معاوضے پر (جس کا ذکر کرتے ہوئے بھی شرم آتی ہے) برسوں مسودے پر نظرِ ثانی محض اپنے شوق اور لغت سے لگاو کی وجہ سے کی اور اسناد کی فراہمی کے لیے اپنے طور پر قطعی اعزازی بنیادوں پر خود ہی بیسیوں نادر و نایاب کتابوں کا مطالعہ کر کے سیکڑوں اسناد تلاش کر کے بھیجیں۔ محمد احسن خان صاحب کو تو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ اس لغت کی تصحیح، اضافے اور اسناد کی فراہمی کے عمل میں اس وقت سے شریک ہیں جب اس کی تدوین وتسوید کا آغاز ہی ہوا تھا اور طباعت کی منزل برسوں دور تھی۔ احسن صاحب نے پہلی جلد سے لے کر آخری جلد تک تقریباً پچاس برس اس کام میں حصہ لیا۔ یہ غالباً لغت نویسی کا عالمی ریکارڈ ہے۔ شان الحق حقی صاحب بورڈ کے نفسِ ناطقہ ''اردو نامہ'' (جس کی بندش کا خیال کر کے دل پر گھونسا سا لگتا ہے) میں لغت کے اجزا بطورِ نمونہ شائع کرتے تھے اور برِ عظیم پاک و ہند کے طول و عرض سے اہلِ علم تبصرے کے ذریعے اس میں مفید اضافے اور تبدیلیاں تجویز کرتے تھے۔ اس وقت بھی محمد احسن خان اور دیگر کئی اہلِ علم اپنے خطوط، مضامین اور نمونۂ لغت پر تبصروں کے ذریعے اس کام میں معاونت کرتے تھے۔ اگرچہ یہ شکایت بھی بورڈ کے ارکان کو رہی کہ ابتدا میں تو اس ضمن میں بہت تعاون کیا گیا لیکن بعد میں سرد مہری اختیار کی گئی[۲]۔ کم و بیش ڈھائی سو اہلِ قلم اور اہلِ علم نے ابتدا میں اسناد کی فراہمی کے لیے رضا کارانہ یا نیم رضا کارانہ بنیادوں پر کتابوں کے مطالعے، اخذِ اسناد اور کارڈ نویسی کا کام کیا[۳]۔

۱۹۵۸ء میں بورڈ کے قیام کے بعد بابائے اردو اس کے مدیرِ اعلیٰ کے عہدے کے لیے

فرہنگِ آصفیہ کو دیکھ جائیے، مقدمۂ کتاب کی بات نہیں، الفاظ کی تشریح کے ذیل میں بھی وہ ایسی گنجائش نکال لیا کرتے تھے۔ میں مولوی صاحب کے مزاج، اندازِ فکر اور ایسے عالم میں طرزِ کلام کی وضاحت کے لیے صرف ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ لفظِ ''توتی'' کے ذیل میں مولوی صاحب نے لکھا ہے:

> ''اس لفظ کی تذکیر و تانیث پر جو لطیفہ حضرت استاد ذوقؔ اور ایک لکھنوی شاعر سے ہوا، اسے ناظرین کی تفنّنِ طبع کی غرض سے......
>
> لطیفہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ استاد ذوقؔ کے ایک لکھنوی ''دوست'' نے ناسخؔ کی ایک تازہ غزل سنائی۔ اسی زمین میں ان کو ذوقؔ نے اپنی غزل سنائی، جس میں یہ شعر بھی تھا:
>
> ہے قفس سے شور اک گلشن تلک فریاد کا
> خوب طوطی بولتا ہے ان دنوں صیاد کا
>
> ''دوسرا شعر سنتے ہی چونکے اور فرمایا کہ ہیں! آپ نے طوطی کو مذکر باندھ دیا، حالاں کہ اس میں یاے معروف علامتِ تانیث موجود ہے...... استاد ذوقؔ نے فرمایا کہ حضرت! محاورے پر کسی کے باپ کا اجارہ نہیں ہے۔ آج میرے ساتھ چوک پر چلیے...... جب شام کا وقت ہوا، دونوں صاحب جامع مسجد کی سیڑھیوں پر، جہاں گذری لگتی ہے، پہنچے...... دیکھا ایک شہدے صاحب بھی طوطی کا پنجرہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ استاد ذوقؔ نے اشارہ کیا۔ ذرا ان سے بھی دریافت کر لیجیے۔ آپ نے بلاتکلف پوچھا ! بھیا! تمھاری طوطی کیسی بولتی ہے؟...... جواب دیا کہ میاں! بولتی تمھاری ہوگی، یاروں کا طوطی تو خوب بولتا ہے۔''

آپ نے مولوی صاحب کا انداز دیکھ لیا اس ''فرضی لطیفے'' کا بھلا لغت سے کیا تعلق ہو سکتا تھا۔ مگر دہلی و لکھنؤ کی بحث میں تعلق نکل آیا۔ سچ کہا گیا ہے کہ عاشقی میں سب کچھ جائز ہے۔

ممدودہ سے پہلے الف مقصورہ کے اندراج پر بھی بعض لوگوں کو اعتراض ہے حالانکہ الف ممدودہ دو الفوں (یعنی ا+ا) کے برابر ہے اور اس طرح مرکب حرفِ تہجی ٹھہرتا ہے جو ترتیب میں اصولاً مفرد حرفِ تہجی کے بعد ہی آئے گا۔

ابتدا میں عبدالحفیظ کاردار (ہمارے مشہور کرکٹر) بورڈ کے معتمد (سیکریٹری) تھے۔ ۱۹۵۹ء میں ان کے جانے کے بعد شان الحق حقی صاحب معتمد مقرر ہوئے اور بابائے اردو کی وفات کے بعد عملاً مدیرِ اعلیٰ کا کام بھی انھیں کو کرنا پڑا اور وہ تقریباً سترہ (۱۷) سال تک یہ خدمت اعزازی طور پر انجام دیتے رہے کہ سرکار کے کسی اور محکمے میں ملازم تھے اور چھٹی والے دن بطورِ خاص بورڈ کے دفتر آتے تھے یا شام کے وقت آ کر کام کرنے لگتے تھے۔ اس ضمن میں ان کے اہلِ خانہ نے نظر انداز ہو جانے کی شکایت بھی کی لیکن لغت حقی صاحب کی پہلی محبت تھی اور اس محبت اور لغت بورڈ کو وہ آخری دم تک دل سے نہ نکال سکے۔ حقی صاحب نے بابائے اردو کے کام کو آگے بڑھایا، لغت نویسی کے اصول وضوابط کو عملی مشکلات کی روشنی میں مزید بہتر بنایا اور نہ صرف بورڈ کے کتب خانے میں نایاب اور نادر کتابوں کا اضافہ کیا تاکہ استناد میں مدد مل سکے بلکہ تقریباً بارہ لاکھ اسناد کے کارڈ بھی تیار کرائے۔ خود کئی کارڈ اپنے ہاتھ سے لکھے۔ ساتھ ہی ساتھ انھوں نے لغت کے مسودوں کی تیاری بھی شروع کرادی اور کئی جلدوں کے خام مسودے کی تسوید بھی کرالی۔ اس لغت کے مسودوں پر نظرِ ثانی نامور اہلِ علم کرتے تھے اور ایک مسودہ کئی اہلِ علم کے پاس بھیجا جاتا تھا جو ادارتی مجلسِ مشاورت میں شامل تھے۔ ان اہلِ علم میں پاکستانی جامعات کے شعبہ ہاے اردو کے اس وقت کے صدور کے علاوہ شوکت سبزواری، نیاز فتح پوری، مجنوں گورکھ پوری، حفیظ ہوشیار پوری، جوش ملیح آبادی خاص طور پر نمایاں ہیں[٦]۔ اپنے شوق اور دلچسپی کی بنیاد پر نظرِ ثانی کرنے والوں کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ایسے ہی خاموش کارکنوں میں منظور علی صاحب بھی تھے جن کو آج کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔ بعد کے ادوار میں جن لوگوں نے نظرِ ثانی میں حصہ لیا ان میں غلام مصطفیٰ خان، وحید قریشی، اسلم فرخی، یونس حسنی، معین الدین عقیل، اکبر حسین قریشی اور یہ ہیچ مدان، خاکسار بھی

شامل رہا اگرچہ پانچویں سوار کے طور پر۔ آخری دو تین جلدوں کے لیے اسناد کی فراہمی میں حافظ صفوان صاحب نے بڑی دل چسپی لی اور یہ حقیقت ہے کہ بعض الفاظ کی سند صرف ان کی توجہ سے لغت میں شامل ہو سکی۔ درحقیقت یہ قومی کام ہے اور اس میں ہر پاکستانی کو مقدور بھر اپنا حصہ ڈالنا چاہیے۔

حقی صاحب کی خوش قسمتی یہ تھی کہ ان کے ساتھ کئی بڑے لوگ جی جان سے اس قومی فریضے کی ادائی میں شامل ہو گئے۔ ممتاز حسن صاحب جیسے اہل علم، مخلص اور جذبۂ حب الوطنی سے سرشار سرکاری افسر بورڈ کے صدر تھے۔ بہت بڑے اور اہم عہدے پر تھے اور بورڈ کے لیے ہمیشہ اپنا اثر ورسوخ استعمال کیا لیکن کبھی اس سے کوئی فائدہ اٹھانے کا نہیں سوچا۔ بورڈ کے پرانے کارکن بتاتے تھے کہ ممتاز حسن صاحب اپنی گاڑی سے بورڈ کے دفتر آتے تھے اور ابتدا میں جب ان کو آمد ورفت کی مد میں کچھ رقم پٹرول کے نام پر پیش کی گئی تو انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ہم یہاں کچھ لینے نہیں کچھ دینے آتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران میں جو جوش وخروش اور جذبہ ہمارے بزرگوں کا خاصہ تھا اس کے مظاہر قیام پاکستان کے بعد بھی کئی برسوں تک نظر آتے رہے۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ، حسام الدین راشدی اور سید عبداللہ جیسے اہل علم اور اہل قلم بورڈ کے رکن تھے۔ شائستہ اکرام اللہ نائب صدر تھیں، بعد میں یہ عہدہ ختم کر دیا گیا۔ ان کے علاوہ شہید اللہ قیصر، اختر حسین رائے پوری، جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی اور دیگر کئی لوگ اس کام میں شریک تھے جن کا ذکر فرداً فرداً ممکن نہیں۔ یہ تمام ادارتی یا انتظامی لحاظ سے مختلف حیثیتوں میں لغت کے خواب کو حقیقت میں ڈھالنے کے لیے کام کرتے رہے۔ عبدالحفیظ کاردار (ہمارے مشہور کرکٹر)، جو سرکاری عہدے پر بھی تھے، نے ابتدائی انتظامی معلامات سنبھالے اور بورڈ کے قیام کے قانونی پہلوؤں کی تکمیل اور اس کے دفتر کے حصول میں اہم کردار ادا کیا۔ شوکت سبزواری بعد میں باقاعدہ بورڈ میں آ گئے اور مدیر اول رہے۔ ۱۹۷۳ء میں شوکت سبزواری کی وفات پر یہ عہدہ نسیم امروہوی نے سنبھالا۔ یہ عہدہ بعد میں ختم کر دیا گیا۔ ہاشمی فرید آبادی، سہیل بخاری اور قدرت نقوی جیسے

لوگ بھی بورڈ میں باقاعدہ ملازم رہے۔

البتہ لغت کی پہلی جلد کی اشاعت سے کچھ عرصے قبل حقی صاحب ۱۹۷۶ء میں مستعفی ہوگئے۔ حقی صاحب کی مخالفت بھی کئی وجوہات کی بنا پر بہت ہوئی تھی۔ لیکن ان پر ایک بڑا دباو یہ تھا کہ ۱۹۷۶ء تک لغت کی ایک جلد بھی نہیں چھپی تھی گو اس کی کئی (غالباً بارہ) جلدوں کا خام مسودہ تیار تھا بلکہ پہلی جلد بھی بالکل تیار تھی۔ اصل میں اوکسفرڈ والوں نے حقی صاحب کو یہ مشورہ دیا تھا کہ جب تک لغت کی آخری جلد تیار نہ ہو جائے اس کی پہلی جلد نہ چھاپیے گا کیونکہ ہوگا یہ کہ چند جلدوں کی اشاعت کے بعد ایسے الفاظ یا ان کے مختلف معنوں کی اسناد مل جانے کا امکان رہے گا جو کسی وجہ سے اس میں شامل نہیں ہو سکے ہوں گے۔ حقی صاحب نے اس مشورے پر عمل کی بڑی بھاری قیمت ادا کی اور ہر طرف یہی چرچا تھا کہ برسوں ہوگئے بورڈ ایک جلد تک نہ چھاپ سکا۔ حالانکہ خود اوکسفرڈ کی لغت کے ضمیمے ایک طویل عرصے تک چھپتے رہے اور اردو لغت کے سلسلے میں بھی یہ کیا جا سکتا تھا۔

حقی صاحب کے بعد ابواللیث صدیقی مدیر اعلیٰ بنے۔ اسی زمانے میں بورڈ کے مدیر اعلیٰ کو بورڈ کا سیکریٹری بھی بنائے جانے کا فیصلہ ہوگیا۔ لیث صاحب نے اپنی ذمے داریاں سنبھالنے کے بعد، بورڈ کے سابق ملازمین کے بقول، یہ کہہ کر اکملیت کا خیال چھوڑ کر عملیت پسندی اختیار کی کہ جو کچھ کمی رہ جائے گی وہ دوسری اشاعت میں پوری کر لی جائے گی اور پہلی جلد کی طباعت کا آغاز کر دیا۔ اس طرح ان کی نگرانی میں ۱۹۷۷ء میں پہلی جلد شائع ہوئی۔ اس وقت بورڈ کے صدر ہادی حسین تھے اور ارکان میں رازق الخیری، سید شاہ علی، عبدالقیوم، ابوالخیر کشفی بھی شامل تھے اور مشیران میں ایف اے کریم فضلی، قدرت اللہ شہاب، حمید احمد خان، جمیل الدین عالی، مجید ملک، ہاشم رضا، وقار عظیم، ہادی حسین وغیرہ بھی تھے۔ اس کے بعد مزید پانچ جلدیں بھی لیث صاحب کے زمانے میں چھپ گئیں۔ ہادی حسین صاحب کے انتقال کے بعد محمد اظفر صاحب (کمال اظفر کے والد) صدر ہوئے۔ ۱۹۸۵ء میں فرمان فتح پوری صاحب اس کے مدیر اعلیٰ مقرر ہوئے اور انھوں نے

لغت کے کام کو اتنا تیز کر دیا کہ بورڈ کو ختم یا کسی اور ادارے میں ضم کرنے کی افواہیں جو حاسدین روز اول سے پھیلا رہے تھے دم توڑ گئیں۔ اگلے دس برسوں میں فرمان صاحب نے دس جلدیں شائع کر دیں۔ انھوں نے نئی نئی کتابیں پڑھوا کر نئے الفاظ کے استعمال اور نئے معنی کے اندراج کی طرف توجہ کی، ان کی اسناد بنوائیں اور انھیں لغت میں شامل کیا۔ اس طرح لیث صاحب کے زمانے کی وہ پابندی ختم ہوگئی جس کے تحت ۱۹۷۵ء کے بعد طبع ہونے والی کسی کتاب کی سند نہیں لی جاتی تھی۔ اس وقت تک بورڈ کی لغت کے مسودوں کی تنقیح اور نظر ثانی میں بیرونی ماہرین سے مشاورت بہت کم رہ گئی تھی۔ فرمان صاحب نے کئی اہل علم کو اس کام میں شامل کیا اور حقی صاحب کو مسودوں کی نظر ثانی کے کام پر آمادہ کر لیا۔ غلام مصطفیٰ خان صاحب جیسی شخصیت بھی اس نظر ثانی میں شامل ہوگئی۔ انھی دنوں مسعود حسن خان علی گڑھ سے ایک وفد کے ساتھ پاکستان آئے۔ فرمان صاحب کی درخواست پر انھوں نے نظر ثانی کے کام کی ہامی بھر لی۔ مسعود صاحب کراچی میں اپنے عزیزوں کے ہاں کئی ماہ قیام پذیر رہے اور مسودے دیکھتے رہے۔ ۱۹۹۰ء میں جمیل جالبی صاحب بورڈ کے صدر ہوگئے۔ ۱۹۹۴ء تک فرمان صاحب لغت کی سولہ جلدیں چھاپ چکے تھے اور رفتار ایسی تھی کہ لگتا تھا کہ اگلے چند برسوں میں یہ منصوبہ مکمل ہو جائے گا۔ سترھویں جلد کے دو سو چالیس صفحات چھپ چکے تھے کہ ۱۹۹۵ء میں حکومت نے تبدیلی کا فیصلہ کیا اور فرمان صاحب کی جگہ حنیف فوق کو مدیر اعلیٰ مقرر کر دیا گیا۔ ۱۹۹۸ء میں جمیل الدین عالی بورڈ کے صدر اور سحر انصاری مدیر اعلیٰ ہو گئے۔ لیکن بعض وجوہات کی بنا پر سترھویں جلد کا کام آگے نہ بڑھ سکا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی لغت کی اشاعت میں کمپیوٹر سے مدد لینے کا فیصلہ ہو گیا تھا اور ٹائپ سے کمپیوٹر کو مراجعت بہر حال آسان نہیں ہوتی۔ مرزا نسیم بیگ کو ۲۰۰۰ء میں قائم مقام مدیر اعلیٰ مقرر کیا گیا اور انھوں نے طویل عرصے سے رکی ہوئی سترھویں جلد شائع کر دی جس کے بقیہ صفحات کی حروف کاری کمپیوٹر پر کی گئی۔ ۲۰۰۱ء میں یونس حسنی صاحب مدیر اعلیٰ ہوئے اور انھوں نے اٹھارھویں جلد شائع کر دی اور انیسویں جلد کا بھی خاصا مسودہ تیار کر لیا۔ ۲۰۰۱ء میں فرمان فتح پوری صاحب صدر مقرر کیے گئے اور ۲۰۰۳ء میں

قرعۂ فال بنام منِ دیوانہ زدند اور رؤف پاریکھ نے بحیثیت مدیرِ اعلیٰ اگلے چار برسوں میں اگلی تین جلدیں یعنی ۱۹، ۲۰ اور ۲۱ شائع کیں۔ بائیسویں جلد کا کچھ مسودہ بنا لیا گیا تھا کہ فرحت فاطمہ رضوی صاحبہ ستمبر ۲۰۰۷ء میں قائم مقام مدیرۂ عالیہ ہوئیں اور ان کی نگرانی میں ۲۲ ویں جلد پر کام ہوتا رہا۔ ۲۰۰۸ء میں حکومت نے بورڈ کی خود مختار ادارے کی حیثیت ختم کر کے اسے وفاقی وزارت تعلیم کا ایک حصہ بنا دیا چنانچہ صدر اور معتمد کا عہدہ بھی ختم ہو گیا۔ جون ۲۰۰۹ء میں فہمیدہ ریاض صاحبہ کو مدیرۂ عالیہ نامزد کیا گیا اور اپریل ۲۰۱۰ء میں یہ جلد چھپ کر سامنے آئی لیکن اس جلد کی بیشتر ادارتی ذمے داریاں عملاً فرحت فاطمہ رضوی انجام دیتی رہیں اور ان کی مدد ادارتی عملے بالخصوص لیاقت علی عاصم اور حسین مجتبیٰ زیدی نے کی۔ (مرزا نسیم بیگ ۲۰۰۷ء میں ریٹائر ہو چکے تھے)۔ فہمیدہ ریاض صاحبہ کے سر یہ سہرا ضرور ہے کہ ان کے دور میں کام جاری رہا، آخری جلد ان کے دور میں آئی اور انھوں نے اس کی ادارت کا سہرا غیر ضروری طور پر اپنے سر باندھنے کی کوشش نہ کی اور لغت کی اس آخری جلد پر فرحت فاطمہ کا نام بطور قائم مقام مدیرۂ عالیہ شائع کیا۔

اب بات سہرے کی آ ہی گئی ہے تو مجھے مرزا نسیم بیگ، سابق مدیر اور سابق قائم مقام مدیر اعلیٰ، کی بات دہرانے دیجیے کہ لغت کی تالیف اور اشاعت کا کام اس نوعیت کا ہے کہ کسی فردِ واحد کے سر اس کا سہرا نہیں باندھا جا سکتا۔ بقول ان کے لغت کا کام عجیب نوعیت کا ہے اور کتابوں کا مطالعہ کر کے الفاظ اور اسناد کے اخذ کرنے، کارڈ بنانے، انھیں ترتیب دینے، معنی کے تعین اور اسناد کے استعمال اور پھر حتمی مسودے کی تیاری سے طباعت تک کا کام ایسا ہے کہ گویا موٹر کاروں کا کارخانہ ہے اور اس میں تمام مشینیں اور کارکن ترتیب وار کام کر کے درجہ بہ درجہ اسے آگے بڑھا رہے ہیں۔ انگریزی میں اسے اسمبلی لائن (assembly line) کہہ لیجیے کہ ایک شخص نے اپنا ہاتھ روکا اور شروع سے آخر تک تمام مرحلوں پر کام ٹھپ ہو گیا۔ بورڈ میں مدیرانِ اعلیٰ اور عملے کے دیگر ارکان آتے جاتے رہے لیکن اس اسمبلی لائن پر کام ہوتا رہا اور سچی بات یہ ہے کہ اس کے ابتدائی کارکنوں نے جو بنیاد رکھ دی تھی، بالخصوص حقی صاحب نے، اسی سے کام لے کر باقی لوگوں

نے اسے آگے بڑھایا۔ چنانچہ اس کا سہرا اگر کسی کے سر ہے تو اس کے بانیوں کے سر اور پھر سب کے سر۔

اس طرح ۵۲ سال کا یہ سفر مکمل ہوا۔ مگر مکمل کہاں ہوا؟ لغت کا کام کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ابھی اس لغت کو نظرِ ثانی کے بعد اشاعتِ نو کے مرحلے سے گزرنا ہے۔ اور ایک کتابیات بھی تیار ہونی ہے۔ اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری جس کے خطوط پر یہ ادارہ اور لغت قائم ہوئے تھے آج بھی کام کر رہا ہے اور اوکسفرڈ کی لغت کے تیسرے آن لائن یعنی برخط ایڈیشن کی تیاری جاری ہے۔ اگر اردو کو اگلی صدی تک زندہ رہنا ہے (اور یہ ان شاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گی) تو اسے اور اس لغت کو بھی نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا پڑے گا۔ اس کے لیے کمپیوٹر اور کورپس (corpus) کی مدد درکار ہوگی۔

حواشی

۱۔ بہادری کو ہم نے اسم لکھا ہے اور یہ درست ہے لیکن لسانیات کی روشنی میں اب اجزاے کلام کی قواعدی حیثیت اور اجزائے کلام کی تمام تعریفیں بدل گئی ہیں اور لسانیات کے ماہران پر اعتراض کرتے ہیں۔ مثلاً اسم (noun) کی اس تعریف (کہ یہ کسی شخص یا چیز یا جگہ کا نام ہوتا ہے) پر انھیں یہ اعتراض ہے کہ یہ مکمل طور پر درست نہیں اور بعض مجرد صفات اسم نہیں ہیں مثلاً ''برداشت'' نہ کوئی شے ہے نہ فرد ہے نہ مقام ہے۔

اسی طرح بعض الفاظ کے بارے میں ان کے نحوی استعمال سے یہ طے ہوتا ہے کہ وہ اسم ہیں یا فعل (انگریزی میں ایسے الفاظ بہت ہیں)، لہٰذا اب رسمی تعریفوں کی بجائے نحوی استعمال کے مطابق ڈھالی گئی تعریفوں پر زور ہے۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:

سلویا چاکر اور ایڈمنڈ وینر (Silvia Chalker & Edmund Weiner)، The Oxford Dictionary of English Grammar، اوکسفرڈ، ۱۹۹۸ء۔

۲۔ ہادی حسین، تعارف، اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد اول، اردو لغت بورڈ، کراچی، ص ''ب''۔

۳۔ ایضاً، ص الف۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ تنقیدی افکار، قومی کونسل برائے فروغ اردو، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۲۲۶۔

۶۔ مقالاتِ مسعود، ترقی اردو بیورو، دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۱۸۸۔

☆☆☆☆

پروفیسر عبدالقیوم لائبریری
کتاب نمبر

ہمارے ادارے کی دیگر مطبوعات

انتخاب ادب مرزا عظیم بیگ چغتائی	شفیق آشکار
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری
مضامین فرحت	مرزا فرحت اللہ بیگ
اردو کی شگفتہ شاعری اور ہمارے رسم و رواج	شوکت جمال
اولین اردو سیلنگ لغت	ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ
اردو لغات: اصول اور تنقید	ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ
انتخاب میر	مولوی عبدالحق / محمد حسن عسکری
دیوانِ غالب	مرزا اسداللہ خاں غالب
کلیاتِ اقبال	علامہ محمد اقبال
جھولی میں ہیرے موتی	ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی
رانا پیلس (ابن صفی)	خرم علی شفیق
سائیکو مینشن (ابن صفی)	خرم علی شفیق
سخن ہائے گسترانہ	مشفق خواجہ مرتب انور سدید
سوالات و خیالات	کرار حسین / انتظار حسین
قتیل اور غالب	سید اسد علی انوری

Available at:
Fazlee's Book Supermarket
507/3, Temple Road, Urdu Bazar, Near Radio Pakistan,
Karachi, Pakistan.
Phone: 021-32629724, 32212991, Fax:021-32633887
E-mail: fazleepublisher@gmail.com
Website: www.fazleebooks.com

ISBN 978-969-441-211-5